جلد (۱) — اپریل سنہ ۱۹۱۱ء — نمبر (۴)

تمدّن

معاشرتی، تمدنی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر — شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

[illegible] تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹

قیمت فی پرچہ ۴ر

کتبہٗ احقر ابو ظفر حامد مرزا

تمدّن

یہ ۷۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم
حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کیواسطے مایۂ ناز ہیں

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے پہلا مقصد
حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پونہچانا ہے۔

تمدّن ایک اکسٹرا لبرل پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالٹکس سے
علیحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہوسکتا کہ تمدّن اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدّن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہونگے جو خواتین کے مطالعہ
کے لائق ہیں۔

تمدّن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دویم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اوّل ۳
قسم دوئم عہ ۔ نمونہ کا پرچہ (۴۰ ر)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنہوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا۔

مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی۔ مولوی سید علی حیدر صاحب زیدی ڈاکٹر حکیم محمد علی خانصاحب سب اسسٹنٹ سرجن۔ مولوی جواد علیخاں صاحب عاکی۔ مولوی عبد المنتقم صاحب الخیری۔ سید شوکت صاحب۔ بیگم صاحبہ زنانہ مشن دہلی۔ مولوی ابو حامد سید محمد صاحب مہدوی۔ نواب سید ابو القاسم خاں صاحب۔ مسز رضا احمد صاحب۔ پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب ایم اے۔ سید سلطان حیدر صاحب جوش۔ منشی لیاقت علی صاحب سب انسپکٹر۔ بابو جان محمد صاحب بٹ۔ مولوی سید مرتضیٰ صاحب میری۔ مہدی علیصاحب شہید۔ بابو چندو لال صاحب وسا۔ حافظ مولوی اسعد حسین صاحب

منیجر تمدّن و عصمت۔ (تمدّن پریس دہلی)

تمدّن

التقریب

از شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد خاں صاحب ایل ایل - ڈی -
ڈی او ایل

کسی ایسے رسالہ کے واسطے جو دلی اور میری اڈیٹری سے شائع ہو جس کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت بھی شامل ہو اُس کے پہلے پرچہ کا اس بزرگ کے کلام سے محروم رہنا جو اسوقت قوم اور ملک دونوں کے واسطے مایۂ ناز ہے جس کے احسان سے اُردو زبان مدتوں سبکدوش نہیں ہو سکتی - کم از کم میرے خیال میں نہایت شرم کی بات تھی یہ ہی تھا وہ خیال [illegible] ۱۱ مارچ سنہ ۱۱ء کو ایک بجے کے قریب شمس العلماء ڈاکٹر مولوی [illegible] احمد صاحب کی خدمت میں لے گیا - مولانا نے موصوف اسوقت [illegible] اوڑھے لیٹے تھے میں نے اپنی آرزو ظاہر کی تو فرمایا

میاں اب چل چلاؤ کا وقت ہے جو کرنا تھا وہ کرلیا اور جو لکھنا تھا وہ لکھ چکے
شب و روز کی غذا چند چمچے دودھ کے رہ گئے ہیں"۔

اس حسن عقیدت کے اظہار پر جو مجھکو مولانائے موصوف سے ہے
کچھ لکھوانے کا ارادہ کیا اور لکھوایا مگر افسوس ضعف و نقاہت نے
تکمیل نہونے دی امید ہے کہ آئندہ کسی پرچہ میں ہدیہ ناظرین ہو
بالفعل یہ چند سطریں ہیں جو تقریب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ گو
انمیں زیادہ تر میرا ذکر ہے لیکن تحریر کی وہ شان جسپر میں مٹا ہوا ہوں
اسمیں بھی موجود ہے +

تمدن جبتک دنیائے ادب میں زندہ ہے ان چند سطروں پر
ناز کرے گا اور میں تا دم زیست اس دستخطی مسودہ کو کلیجہ سے لگا کر
رکھوں گا + راشد الخیری۔

تقریظ یا تنقید کا لکھنا یا لکھوانا دونو باتوں میں سے کسی کی وقعت دوائوں کے
اشتہار سے زیادہ نہیں اور دونوں مذموم و متہم ہیں۔ اسی سے میں نے گو ڈھیر
ساری کتابیں لکھ ڈالیں مگر کسی سے کسی کی تقریظ یا تنقید نہیں لکھوائی بلکہ مولوی
محمد حسین آزاد مرحوم اور مولوی عبدالغفور شہباز مرحوم نے کسی کتاب کے چھاپنے
کی مجھ سے اجازت لی اور اجازت لے کر کتاب چھپوائی اور اس کے ساتھ از خود
تقریظ بھی لکھی مجھکو معلوم ہوا تو میں نے دونو کو تقریظ کے علیحدہ کرنے پر مجبور
کیا اور یہ جو کسی نامی کتاب میں گورنمنٹ یا ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا ریویو
ہے وہ ان لوگوں کا کار منصبی تھا۔ تقریظ و تنقید سے اس سے کیا تعلق اب یہ
جو کچھ میں لکھوا رہا ہوں اسکو کوئی صاحب تقریظ یا تنقید نہ سمجھیں بلکہ ایک
طرح کی تقریب ہے کہ میرے بھتیجے اس معنے کر کہ میں ان کا پھوپا ہوں یا مولوی

رسالہ تمدن نکالتے ہیں +

مولوی عبدالراشد نے یہ شان کئی برس سے اختیار کر رکھی ہے ان کی کتابیں پبلک میں کثرت سے شائع و مقبول ہوئیں انہوں نے مخزن اور عصمت کو مدتوں اڈیٹ کیا اور ابھی تک رسالہ عصمت کو ایڈٹ کرتے ہیں۔ اگر کوئی مولوی عبدالراشد کے حسب نسب سے واقف ہو تو اسکو ان کے خاندانی حالات سنکر تعجب ہوگا کہ یہ خیالات انہوں نے کہاں سے اخذ کئے۔ مولوی عبدالراشد مولویوں کے خاندان کے ایک ممتاز ممبر ہیں جو وقت انکی تعلیم کا تھا اسوقت تعصب مذہبی مسلمانوں میں اس بلا کا تھا کہ مولوی عبدالراشد کے موجودہ خیالات کا آدمی مسلمانوں کی سوسائٹی میں رہ نہیں سکتا تھا میرے نزدیک اصلی تعلیم خاندانی سوسائٹی کی تعلیم ہے جو زمانہ مولوی عبدالراشد کی تعلیم پانے کا تھا ان کے خاندان میں مولوی عبدالراشد کے آج کے سے خیالات پیدا ہونے محال تھے۔ لیکن مولوی عبدالراشد میں ہمکو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ غرض مولوی عبدالراشد نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کے فطری خیال ہیں ایک بات اس موقعہ پر لکھنے کے قابل ہے کہ مولوی عبدالراشد کے پردادا مولوی عبدالخالق مرحوم اپنے عصر میں دلی کے ممتاز مولویوں میں سے تھے وہ آخر عمر میں بسبب ضعف پیری ایک مشت استخواں رہ گئے تھے اسوقت انکی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مسجد کے ایک در میں اکڑوں بیٹھے ہیں ایک تپائی سامنے ہے اسپر کچھ کتابیں رکھی ہیں انکو دیکھ رہے ہیں اور کچھ اسپر لکھتے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو انکا ترکہ یعنے کتابیں انکی اولاد ذکور و اناث میں تقسیم ہوا کچھ کتابیں مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم کے

حصہ میں بھی آئیں جو مولوی عبدالرشد کے دادا اور میرے خسر تھے چونکہ میں خانہ داماد تھا مجھکو ان کتابوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو کوئی کتاب عربی۔ فارسی۔ اردو کی نہ تھی جسپر مولوی عبدالخالق صاحب کا تحشیہ نہ تھا یہانتک کہ مثنوی بدر منیر جس سے مولوی صاحب کی وسعت معلومات کا ثبوت کافی ملتا ہے اور اس بات کا کہ اگلے بزرگ علم کو علم کے لئے سیکھتے تھے اسی طرح مولوی عبدالراشد نے جو کچھہ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ کیا ایسے شخص کا رسالہ تمدن جو وہ جاری کرنے والا ہے تقریب کی قابلیت نہیں رکھتا؟

ہمارے خاندان میں ایک وقت وہ بھی تھا کہ میں ضلع اودھ میں بندوبست کا ڈپٹی کلکٹر تھا چھٹی لیکر گھر آتا تو پہلے سے گھر میں خط لکھ بھیجتا تھا کہ میرے پرانے لیتر ٹے پڑے ہوں تو سٹیشن پر بھیجدینا۔ کہ ان کو پہن کر میں ریل پر سے اتروں نگا یہی وہ تعصب تھا جسنے مولوی عبدالراشد کو وقتی تعلیم سبقاً سبقاً حاصل نہ کرنے دی مگر انہیں خدا داد مادہ تھا کہ انہوں نے انگریزی بھی سیکھ لی۔ اب اس خاندان میں بے تکلف لڑکے انگریزی پڑھتے ہیں اور میری نسل میں تو بعض ڈاکٹر بھی ہیں ڈاکٹر بہ معنے طبیب نہیں بلکہ علمی ڈاکٹر جیسا میں ہوں۔ اس نسل میں میں مولوی عبدالراشد کو ان کے خیالات اور انکی سیلف سٹڈی کے لحاظ سے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور وہ بھی جیسا ہر شریف خاندان کے فرزند کو چاہیئے مجھکو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں۔ پس یہہ چند سطریں رسالہ تمدن کی تقریب ہے جو مولوی عبدالراشد کی دوسری تصنیفات کی طرح انشاء اللہ پبلک میں مقبول ہوگا۔ میرا ذاتی حال یہ ہے کہ کئی برس سے ہاتھہ مرتعش ہے اور میں خود اپنے ہاتھہ سے ایک سطر بھی نہیں لکھہ سکتا۔ ناچار کسی سے لکھواتا ہوں تو وہ

رنگ نہیں آتا۔ صرف مذہب کے متعلق میں کبھی کبھی کچھ لکھواتا رہتا ہوں
مولوی عبدالرشید نے بتقاضائے سعادتمندی مجھ سے فرمائش کی او
میں نے یہ چند سطریں لکھوا دیں ٭

سلطان جہاں

فقیر کی صدا

قوم نے جھولی سنبھالی لے کے نام اللہ کا
بھائیو دنیا یہ سودا ہے خدا کی راہ کا
لوگ رستہ دیکھتے ہیں اب دکن کے شاہ کا
کب بجے ڈنکا نظام الملک آصف جاہ کا
غل ہوا نکلے اگر وہ دینے والا قوم کا
او سخی داتا بھرے جا یہ پیالا قوم کا

"احمد علی شوق قدوائی"

گدا کی صدا

بہنو کوڑی پیسا کچھ دو قوم پیالا لائی ہے
بہنو قوم کی عزت رکھ لو در پہ تمہارے آئی ہے
بہنو بچے ماؤں کے اور ماں پر فرض بھلائی ہے
بہنو سب بچوں پر صدقے جو کچھ آنا پائی ہے
بہنو بچے علم پڑھیں گے سودا حق کی راہ کا ہے
بہنو نام علیگڈھ کا ہے کام مگر اللہ کا ہے

(از عصمت)

تمدن کا اجڑا

پرستش کے قابل نہیں وہ مقدس و متبرک صورتیں جن کے مبارک ہاتھ چمنستان ادب میں سدا بہار پھول کھلا گئے، مرگر زندہ، اور فنا ہوکر باقی! ہیں، دریائے سخن کے وہ گوہر شہوار، جن کی چمک دمک نے اُردو کو حسینان جہاں کی صف میں بٹھا دیا ہے۔ ان ہی کا طفیل تھا کہ اس کی میٹھی زبان سیدھے دل اور دلکش ادا نے ایک عالم کو مسخر کیا، کس اعزاز اور مرتبہ کی مستحق ہوگی وہ سینہ جسکے منہ سے ایسے پھول جھڑے کہ دنیا معطر ہوگئی اوس کی شیریں بیانی کا سکہ چار دانگ عالم میں چلا اور شہرت کا ڈنکا روئے زمین پر بجا نظم و نثر کے اولوالعزم وزرا اس کے ہمرکاب ہوئے، تخیل نے اپنا تاج شاہانہ اس کے سر پر رکھا اور اقلیم سخن کے وہ تاجدار جو فلسفہ اور سائنس کی زبردست فوج پر راج کر رہے تھے اسکی نفاست و نزاکت کا لوہا مان گئے۔ جن زبانوں پر آبا و اجداد کی عظمت کے گیت جاری تھے وہ بھی اسکا کلمہ پڑھنے لگیں مگر آہ اے فلک ناہنجار دل مجروح یہ کہتے ہوئے خون کے آنسو روتا ہے کہ تیری نیرنگیوں نے زمانہ کے ساتھ اسکا ورق بھی الٹا اس کے عاشق صادق اپنی عمریں اسپر قربان کرکے آج جنگلوں میں بےخبر پڑے ہیں اور کوئی آشنا نہیں کہ اس بدنصیب پر دو آنسو بہائے ✤

بیرحمی کے زبردست ہاتھ اس کے تاراج کرنے پر آمادہ ہیں اور کوئی دم جاتا ہے کہ تعصب کا شہباز جو عرصہ سے نفسانیت کی ہوا میں منڈلا رہا ہے اسپر گر کر معزول کر دے ✤

ٹوٹی پھوٹی قبروں اور ویران کھنڈروں میں رہتے ہو! اللہ کروٹ لو
اور اسکی حالت زار پر نظر ڈالو۔ تمھاری آنکھہ بند ہوتے ہی یا اس کی مٹی پلید ہوگئی
کدھر ہو! آسمانی راج میں بسنے والی روحو! آنکھیں تمھاری صورتوں کو
ترس گئیں تمھاری شب جدائی کس غضب کی رات تھی جسکی آجتک صبح نہوئی تمھاری
زندگی غنیمت نہیں نعمت تھی۔ تم گئے مگر وہ کر گئے کہ اب ایسے لوگ نظر نہ آئیں گے
تم مر گئے مگر زندہ ہو تم نہیں ہو لیکن ہو۔ تمھاری یہ زندگی وہ زندگی ہے جسے
موت کا کھٹکا نہیں، تم خیالات کی لڑیوں میں ایسے موتی پرو گئے۔ جو
مدۃ العمر جگمگائیں گے +

آسمان ادب کے روشن ستارو! شاہجہاں آباد کا چپہ چپہ اور کونہ کونہ
تمھاری یاد میں آنسو بہا رہا ہے۔ اردو جسپر تم اپنی زندگیاں نثار کرگئے آج
اس حال میں ہے کہ لونڈیاں اس کی سوکن اور پاؤں تلے کی چیونٹی اس کی
دشمن نمک خوار انجان ہیں اور دوست نادان! اپنی برکت کا ہاتھہ بڑھاؤ
اور اس کے سر پر رکھو! زمانہ آگیا اور ابھی آئیگا کہ یہ فانی دنیا تمھارے نام آنکھوں
سے لگائے قدرت کے بازیگر کیسے ہی روپ بھریں مگر قصر اردو کے معمار
تمھاری گلکاریاں دیکھہ کر سر جھکائیں گے۔ تمھاری قبریں مٹی کا ڈھیر
ہوجائیں۔ تمھارے مدفنوں کا نام ونشان تک نہ رہے مگر اس کٹھن منزل میں
تم وہ فانوس جلا گئے ہو جنکی روشنی بھولے بھٹکے مسافروں کو منزل مقصود پر پہونچاتی رہیگی!

تمدن اسی خاک پاک کا ایک ذرہ ہے جسمیں تم جیسے جواہر مدفون ہیں مقدس روحو
اسکی لاج رکھنا اور دعا کرنا کہ یہ ناچیز پرچہ اس چمنستان کی کچھہ خدمت کرے جسکو تم نے
اپنے خون سے سینچکر لالہ زار بنایا +

بس مقدس روحو میرا سلام لو اور میری اس دعا پر آمین کہو کہ تمدن

قندِ پارسی

حضرت اقبال کے اُردو کلام سے ایک زمانہ مستفید ہو چکا ہے لیکن یہ امر نسبتاً کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جناب موصوف فارسی کلام پر بھی کما حقّہٗ قدرت رکھتے ہیں۔

اس صنف میں ان کے لطفِ زبان اور حسن بیان کا ذیل کی غزل سے اندازہ ہوسکتا ہے جسے تیمناً درج کرتے ہیں۔ انکی طبع نیساں کا یہ ترشح امید دلاتا ہے کہ تمدّن کی کشتِ مضامین آیندہ بھی اُن کے ترشحاتِ قلم سے سیراب ہوتی رہے گی۔ اُردو اور فارسی کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ فارسی غزلیات کا اُردو رسائل میں شائع ہونا کسیطرح بھی ناموزں نہیں۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ "تمدّن" آیندہ بھی صاحب کمال شعرا کے فارسی کلام کا نمونہ وقتاً فوقتاً پیشکش ناظرین کرتا رہے گا۔

سعید

(پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب۔ ایم۔ اے)

غزل

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابان جنوں بردی و رسوا ساختی

جرم ما از دانۂ تقصیر او از سجدۂ
نہ بآں بیچارہ مے سازی نہ با ما ساختی

ای خنک روزی کہ فرمانِ پریشانی دہی
مشتِ خاکِ را کہ حشر آرزوہا ساختی

جرم امروز ست فالِ چہرہ فردائے حشر
آفتاب ایں سحر از ظلمتِ ما ساختی

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل
یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

دین چہ افسوں ہیں چہ نیرنگست اے حسن غیور | دیدہ بخشیدی و محرم تماشا ساختی
طرح نوافگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم | ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی
اے سرت گردم چہ پنداری کہ ما نشناختیم | چاک دامن خود از دست زلیخا ساختی
پرتو حسن تو مے افتد بروں مانند رنگ | صورتے پردہ از دیوار مینا ساختی

برلب اقبال مُہر خامشی زیبا نبود
چوں دلِ وارفتہ اش را نغمہ پیرا ساختی

جب لارڈ ایلڈن کو لارڈ چانسلری کی خدمات سپرد ہوئیں تو اس تقرر پر ہر طرف سے انکو مبارکباد دی گئی۔ بادشاہ نے اپنی مبارکباد میں فرمایا کہ لارڈ ایلڈن میری طرف سے مہربانی فرماکر اپنی بی بی کا بہت بہت شکریہ ادا کیجئے۔

لارڈ ایلڈن نے شاہی مبارکباد کے اِن الفاظ کو تعجب سے سُنا اور عرض کیا میں اس شکریہ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ بادشاہ نے فرمایا تمھارے لارڈ چانسلری کے تقرر کا سبب جسقدر تمھاری بیوی ہے وہ میں ہی سمجھ سکتا ہوں تمھاری خواہش تو صرف اتنی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کسی قصبہ کے پادری ہو جاؤ لیکن تمھاری بی بی نے تمکو میرا لارڈ چانسلر بنا دیا +

تعدّدِ ازدواج

قطع نظر ان کے جنکی تہذیب زمانہ کے لاطائل دور کے پردوں میں اخفا ہے، اور جتنی قومیں تماشا گاہ عالم کے اسٹیج پر گذری ہیں ان سب کے تمدن و معاشرت کو جب ہم علم تہذیب الاقوام کی عینک لگا کے دیکھتے ہیں، تو مظاہر قدرت کی تصویریں لوگوں کی رنگارنگ رسموں کی شان میں عجیب و غریب مناظر پیش کرتی ہیں ٭

دانایان فرنگ جنکا ذہن رسا علوم مختلفہ کے رہواروں پر سوار ہو کر فلک الافلاک سے ٹکراتا ہے، جن کی نظر بینا طبقات الارض سے گذرتی ہوئی تحت الثریٰ کے پار اتر جاتی ہے، جنھوں نے پیش رفتہ اقوام کے، علوم و معیار تمدن کے تحقیق کرنے میں آنکھوں کا تیل نکالا اور صحیح نتائج مستخرج کرنے کی جانکاہی میں دماغ کو دانچھلا دیا، کسقدر قابل تحسین و آفرین ہیں اِن رہبران کامل نے اپنی دانش و بینش جہاں نما سے علم السنین آثار قدیمہ، تشریح الانسان اور تہذیب الاقوام بیش بہا اصناف علم تدوین کیئے، جن کے ذریعہ سے ہم اقوام عالم کے حالات بود و باش، رسم و آئین، عادات و اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عورت جسکو خالق ارض و سما نے نسل انسانی کی بقا و بزم دنیا کی زیبایش کے لیے پیدا کیا ہے، اقوام عالم میں اس نازک فرقہ کی عجیب گت بنتی رہی اور نوادر روم جیسی شائستہ قوم جو اپنے قانون کے لحاظ سے دنیائے یورپ کی پیشرو مانی جاتی ہے، عورت کے وجود کو وجود ہی نہیں سمجھتی تھی طرفہ تر یہ کہ اسے اور تمام یورپ کو اس کے ذی روح ہونے نہونے میں بھی کلام تھا، چنانچہ اس خلش کو رفع کرنے کے لیئے سنہ ۵۸۶ء میں یورپ کے بڑے بڑے حکیموں نے

ایک جلسہ کیا جسمیں بڑی جد و جہد فلسفانہ کے بعد اسکو ذی روح اور نوع آدم تسلیم کیا۔ اہل عرب اس کے وجود کو ننگِ خاندان سمجھتے تھے اور اس لیے نبی اکرم صلعم کی بعثت سے قبل باپ اپنی لاڈو کو بڑی سنگدلی سے جیتے جی گور میں سلا دیتا تھا۔ ہندوستان میں عورت کا وجود شوہر کا وجود ہوتا تھا۔ اہل ہنود اور عیسائی قوموں میں حقوق نسواں اظہر من الشمس ہیں جب اسکا وجود، وجود مرد کا جزو لاینفک ہی قرار پایا تو پھر اسکا کیا حق! نہ وہ کسی چیز کی وارث ہے نہ مالک، نہ کسی معاملہ میں خود مختار نہ کسی معاہدہ کا اسے مجاز۔ غرض یہ کہ وہ مرد کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے کہ جسطرح اسکا دل چاہے نچائے۔ علے ہذا یہود یوں میں عورت کی ذات زر خرید چیز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اہل میڈیا و پرشیا بھیڑ بکریوں سے زیادہ اسکی قدر و منزلت نہیں کرتے تھے۔ اہل چین اسے اپنا قیدی سمجھتے تھے اور مکافات اعمال میں جہان سے گذار دیتے تھے۔

اہل سپارٹا و یونان کے ہاں نوزائیدہ بچوں کے ڈاکٹری معائنہ کا طریقہ بڑا استم افزا تھا۔ کمزور جسم کے بچوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ یا پہاڑ پر لٹکا کے مار دیا جاتا تھا۔ قوی ہاتھ پاؤں کی عورتوں کو جنگی ہتیار زیب تن مردوں کے پہلو بہ پہلو میدان کارزار میں لڑنا پڑتا تھا۔ ستم بر ستم یہ کہ انکی چھاتیاں قلم کیجاتی تھیں جس کے صدمے سے اکثر عورتیں پھڑک پھڑک کر دم توڑ دیتی تھیں البتہ یونانیوں نے ایک صورت سے اسکی خوب قدر کی وہ یہ کہ جذبات دل کی تصویر اس کے رنگ و روغن سے اُتاری۔ حسن کی پری، غصہ کی چڑیل اور شہرت کی بڑھیا اسے بنایا۔ ہندوؤں نے بھی دولت کی دیبی اور عشق کی موہنی کا اظہار اسی کے قالب سے کیا۔ وقس علیٰ ہذا۔

اسیطرح تعدد ازدواج کے متعلق اقوام عالم میں گوناگوں رسوم تھیں۔ ہم پہلے

ہر زمانہ اور ہر ملک کی رسوم پر اور پھر اس کے حسن و قبح پر تنقیدی نظر ڈالیں گے کہ شارع اسلام نے فطرت انسانی اور ملکی ضرورتوں کے مطابق مناسب حدود و تحت قیود کے ساتھ اس جزو اعظم معاشرت انسانی کی تعداد پر جو دستور العمل قرار دیا ہے، وہ دنیا کی موجودہ حالت کے مقابل میں کہاں تک مستحسن ہے۔

ملک روم کی قدیم فرماں روا قوم اطروسقان کے ہاں کثرت ازدواج کا بڑا چرچہ تھا، لیکن جب اورنگ نشین اقبال رومولس اور ریمس کے دل میں (راہزنی جنکا پیشہ تھا) اس سرزمین کے ہوشربا مناظر نے اقامت کا چھلا ڈالا اور ہوائے ملک گیری اور ملک داری نے اس عظیم الشان شہر اور سلطنت کی بنیاد ڈلوائی تو ان لوگوں کی احتیاج انسانی کے لیے دنیا کی تمام نعمتوں کی فراوانی تھی، لیکن چونکہ ان کے پیرہن پر قزاقی کا بدنما دھبا تھا اس لیے کسی ابنائے جنس نے انسے پیوند...... کرنا قبول نہیں کیا ایسی صورت میں انہیں لامحالہ یہ کرنا پڑا کہ اپنی ہمسایہ قوم صابین کو بزم مسرت میں مدعو کیا اور ان کی عورتوں کو جو ساتھ آئی تھیں زبردستی اپنے میں کیا، جس نے مقابلہ کیا اُسے تلوار کے گھاٹ اوتارا۔ ایسے عالم میں جبکہ بانیان روم نے اس لطیف جنس کو جان پر کھیل کر فراہم کیا، تعدد ازدواج کا خیال خواب میں بھی نہ آتا ہوگا۔ ابتدا ر زمانہ میں عورتوں کی تعداد جب مردوں سے بڑھ گئی تو یہ رسم رواج پکڑ گئی۔ لیکن اسکا پتہ تا رک انٹونی (سنہ ۸۳-۳۰ ق م) سے قبل کچھ نہیں چلتا۔ روم کی تاریخ میں یہ جنرل اور پادشاہ پہلا ہے جس نے دو شادیاں کیں۔ حاکم وقت کا ہر فعل رعیت کو بھلا معلوم ہوتا ہے، مخلوق نے اپنے بادشاہ کی نظیر کو پیش نظر رکھکر ایسی سے لے مجانی کہ دو چھوڑ جتنی عورتیں جس کے ہاتھ لگیں، اس نے بے تکلف ڈال لیں۔

اب ضرورت محسوس ہوئی، قانون معاشرت مدون کیا۔ اسی زمانہ میں نازک مسئلہ طلاق کے متعلق قانون وضع ہوا اور ساتھ ساتھ متعہ اور عارضی شادیوں کا قانون بھی پاس ہوا۔ موخر الذکر کی رو سے پہلی شادی کی میعاد استقرار ایک سال کی گئی، پھر وہ تخفیف ہو کے چھ ماہ رہ گئی۔ پھر تین ماہ، گھٹتے گھٹتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک ہفتہ! اور پھر کل ایک شب!! آج رات نکاح ہوا اور کل صبح طلاق! ظاہر ہے ایسا قانون ملک کے لیے بے انتہا ضرر رساں تھا۔ چنانچہ جب ۳۹۵ء میں آرکیڈیس سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے ایک قلم عارضی اور ایک سے زیادہ شادی کرنے کے رسم کو موقوف کیا۔ حضرت عیسے علیہ السلام کو چار صدیاں گذر چکی تھیں اور اہل یورپ نے ملت تثلیث ثلثہ قبول کر لیا تھا۔ نصرانیت کے قسیسوں کا خاندانی گروہ قائم ہو چکا تھا اور یہی طبقہ قانون کے پردہ میں سب سے زیادہ مزے اڑاتا تھا۔ فطرتاً اسے یہ فرمان بہت شاق گذرا۔ اس لیے اس فرمان کے خلاف خوب دھڑے بندیاں کیں اور شاہ پر تیر ملامت برسائے فرمان کو سراسر خلاف شرع عیسوی بتایا، اس مستقل شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ویلن ٹونین ثانی کو اسکی ترمیم و اصلاح کرنی پڑی۔

عارضی شادیوں کو موقوف کیا، مگر کثیر الازدواجی مباح ہی رکھی جسٹی نائن کے زمانہ تک یہ دستور جاری رہا لیکن اس نے اپنے عہد میں عارضی شادیونکی طرح اسے بھی اڑا دیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بادشاہ موصوف کا فرمان جو انسٹیٹیوشن کے لباس میں نافذ ہوا تھا، وہ کسی عیسائی کی قلم سے نہیں نکلا تھا اس کا مصنف بلا شبہ ہریہ تھا، اس لیے عیسائی اگر اس پر ناز کریں تو وہ ان کا تفاخر بیجا ہے۔ روم کا مشہور و مستند مورخ ٹیسی ٹس کہتا ہے کہ اس کے عصر میں نہ صرف روم بلکہ تمام یورپ باستثنائے جرمن کثیر الازدواجی کا دلدادہ تھا

جرمن کے ہاں بھی یہ طریقہ تھا کہ غریب غربا تو واقعی ایک شادی کرتے تھے لیکن امیر امرا علی قدر مراتب و امارت شادیاں کرتے تھے۔ اس کے اقوال پر نکتہ سنجان عیسوی یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس نے جو کچھ بھی اس باب میں لکھا ہے اسکی غایت یہ تھی کہ وہ جرمنز کے عوام کا کریکٹر بنظر استحسان رومیوں کے آگے پیش کرے اور انہیں شرم دلائے کہ وہ قوم جوان سے مقابلہ میں نیم وحشی تھی اور جن کا کوئی مرتبہ نظام تمدن نہ تھا۔ انکی خوبیاں دکھائے اور رومنز کو ان کی عیاشانہ معاشرت سے باز رکھے۔ لیکن ان اظہار خیالات کو خواہ کسی رنگ میں رنگا جائے یہ امر مسلمہ رہتا ہے کہ اس کے زمانہ میں تمام اقوام یورپ تعدد ازدواج پر مٹی ہوئیں تہیں۔

اہل میڈیا و فارس کے ہاں کثیر الازدواجی کے مختلف طریقے تھے سلطنت کے ایک صوبہ میں مرد سات بیویاں کرسکتا تھا لیکن دوسرے میں اس کے برخلاف عورت اکٹھے پانچ خاوند کرسکتی تہی۔ اتنا ضرور ہے ان کے ہاں یہ رسم افراط و تفریط فرقۂ اناث پر مبنی تھی ان لوگوں کا قانون اسقدر لوچ دار تھا کہ ضرورت زمانہ و مصلحت ملکی کو مدنظر رکھ کر قوم کا دل جیسے چاہتا تھا توڑ مروڑ ڈالتی تھی۔

زمانہ جاہلیت کے اہل عرب و اہل برطانیہ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں دشمن سے مصئون و مامون رہنے کے لیے ترتیب و انتظام سے یکجا رہتے تھے ان کا سامان خورونوش یا پارچہ ظروف وغیرہ تمام ملکیت مشترکہ ہوتی تھی۔ لطف یہ کہ بیویاں بھی بالاشتراک ہوتی تہیں، اور بچہ پنچاتی کہلاتا تھا۔

عربوں میں تو اتنی خیر صلاحیت بھی تھی کہ جب چند شخص ایک عورت سے ایسا تعلق پیدا کرتے تہے تو عورت دو چار روز بعد کہلوا دیتی تہی کہ فلاں شخص اسے

میراقدم بھاری ہوگیا ہے۔لیکن برٹنز اسقدر مستغنی صفات واقع ہوئے تھے کہ انہیں اسکی مطلق پروانہ تھی۔حیرت ہوتی ہے کہ فلاطون نے بھی یہی طرز معاشرت اختیار کرنے کے لیے قدیم یونانیوں سے بڑی شدومد سے کہا۔فلاطون کہتا ہے قدیم یونانیوں میں رسم ازدواج کی مختلف صورتیں تہیں اہل میڈیا کی طرح ایک صوبہ میں مرد بہت سی شادیاں کرتا تھا، لیکن دوسرے صوبہ میں ایک عورت کئی خاوند کرتی تہی۔یہ رسم اختلاط و بنات ذرتھائے ذکور و اناث پر منحصر تھی۔جنگ میں اگر مرد آبادی کام آجاتی تہی تو عورتوں کی افراط کے باعث طبقہ ذکور آزاد تھا کہ جتنی ہر ایک سنبھال سکے رشتہ زوجیت میں لائے۔لیکن اگر خدا نخواستہ عورتیں کسی آفت ارضی وسماوی سے جہج جاتی تہیں اور ملک میں قحط النسا پڑجاتا تھا تو ہر ایک عورت کئی کئی شوہر کرتی تہی پس بجائے جوڑے جوڑے کے وہاں عجیب مخلوط حساب تہا۔مشہور یونانی سیرۃ نگار پلوٹاک بہت رطب و یابس سے یونانی رسم ازدواج کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے کہ یہ آئین ان کے ہاں انتہا دانشمندی سے مملو تہے چونکہ وہ جو کام کرتے تہے، قوم کی ضرورت اور رفع ضرورت کو مدنظر رکہکر کرتے تہے علی ہذا یوریپڈیز جو یونان کا نہایت فاضل ادیب اور مشہور ڈراماٹسٹ عیسی علیہ السلام سے چارسو برس قبل گذرا ہے لکہتا ہے کہ اس زمانہ میں یونان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے تقریباً دگنی تھی اور اگر اس صورت میں مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہوتی اور وہ ایک سے زیادہ کے خرچ کا بآسانی متکفل نہوتا تہا تو لازمی تہا کہ فرقہ اناث کی آبادی رنگ لاتی اور سلطنت کی سود وبہبود کے لیے وبال جان ہوتی ایک اور فاضل اہل ڈیماستھنز جو عہد قدیم کے سحر بیان مقرروں میں تہا، مسئلہ ازدواج پر نہایت گہری اور نقادانہ نظر ڈال کے کہتا ہے کہ سلطنت میں تین قسم کی صورتیں ہیں اوّل نکاحتہ یا بیاہتہ بیویاں، دویم مدخولہ۔سویم کسبیاں۔موخر الذکر قوم کی تباہی

کے لیے سخت خطرہ ہیں، اس لیے انسب طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہی خواہان قوم بجائے اس کے کہ ان عورتوں کو اجازت دیں، اپنے حرم میں داخل کرلیں۔ اور ان کو اس انتہا درجہ کی بے عزتی اور بے حیائی سے بچالیں جس سے قوم کی قوم غرق عصیاں ہوتی ہے اور وجود اخلاقی کا تار تار جدا ہوتا ہے۔

اب کتب منزلہ من اللہ کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتی ہیں؟ توریت اور موسوی قانون میں جہانتک ہم دیکھتے ہیں، تکثیر ازدواج کے خلاف کوئی حکم نظر نہیں آتا۔ احکام مقررہ میں یہ تو مذکور ہے کہ کسی شخص کو اپنے ہمسایہ کی بیوی کو نظر بد سے نہیں دیکھنا چاہیئے، لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ توریت میں جو واقعات منقول ہیں، وہ بین طور پر اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں یہ رسم رائج تھی۔ پیٹری آرک (مذہبی گروہ اور خاندانی بزرگ) کی نیک خصایل بیوی بھی سوکن کے آجانے پر معترض نہیں ہوتی تھی، بلکہ نہایت خوشی سے خود، اولاد ہونے کی آس میں اپنے خاوند کو لونڈی بلانے کی طرف مائل کرتی تھی۔ یہودیوں کے قانون طاعود کے سایہ میں بھی یہ رسم جاری تھی۔ ہر اہل ملت کو مجاز تھا کہ حسب استطاعت جتنی چاہے شادیاں کرے۔ یہودیوں کا ربی اعظم ہلال جو حضرت مسیح سے سو سال پہلے ہوا ہے اسکی رائے تھی کہ بیویاں زیادہ سے زیادہ چار ہونی چاہیں۔ قیرولطی جو یہودیوں کا ایک فرقہ ہے، جن کے خاندان، ابتک انگلستان اور فلسطین میں آباد ہیں، اور روس میں تو یہ لوگ بہت کثرت سے تھے، لیکن مذہبی ظلم و تشدد نے بیچاروں کو بے خانماں کر دیا۔ ان کے ہاں ابتک تعدد ازدواج کی رسم جاری ہے۔ یورپین ممالک میں یہ لوگ ملکی قانون اور مذہبی ایذارسانی سے خائف ہو کے ایک شادی کے پابند ہوگئے ہیں ورنہ دیکھا جائے تو انکے ہاں

کوئی قانون اس رسم کے خلاف نہیں جس شخص نے بھی کبھی صحیفہ مقدس کو اٹھا کے دیکھا ہوگا، اُسے غالباً یاد ہوگا کہ حضرت سلیمان جو بنی اسرائیل کے زبردست شہنشاہ گذرے ہیں، جن کی سطوت و شوکت، علم و دانش فسانۂ روزگار ہے خدا کے فضل سے علاوہ حرم کے سات سو بیویاں رکھتے تھے اور اسپر بھی وہ ہمیشہ اِس امر کے شاکی رہے کہ انہیں کوئی عورت باعصمت وعفت نہیں ملی علیٰ ہذا حضرت داؤد جو اسی قوم کے دوسرے بادشاہ تھے ان کی بھی متعدد عورتیں تھیں +

انجیل میں سوائے بشپ کے اور کسیکو تکثیر ازدواجی کی ممانعت نہیں۔ خلاف احکام کی عدم موجودگی میں ہر عیسائی شرعاً متعدد نکاح کرسکتا ہے زمانۂ اوّلے کے عیسوی بزرگان دین کا خیال بھی تعدد ازدواج کے بالکل موافق تھا سینٹ اگسٹائن نے اس معاملہ میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے، انہوں نے علی الاعلان کہدیا کہ بغیر روک ٹوک کے برادران عیسوی جتنی شادیاں پسند کریں کریں، انکا یہ خیال تھا کہ کثرت ازدواج احکام عیسوی کے بالکل مطابق ہے اور بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک سے زیادہ بیوی کرنا عین عقلمندی اور مصلحت وقت ہوتا ہے۔ پولیس یا پاپائے جن کی شان حسیرتی وصفات ملکوتی خدائے ثلثہ سے اتر کر ہی ہوتی ہے، انکا حال اہل نظر کو بخوبی معلوم ہوگا۔ گرگری ثانی نے جو اپنے زہد و تقویٰ و تدبر میں شہرہ آفاق تھا، ۷۲۶ء میں ایک فرمان بدیں مطلب شائع کیا، کہ اگر کسی شخص کی پہلی بیوی سے شادی سے دو سال کے اندر بچہ نہو یا اسکی بیوی اس قسم کے عوارض میں مبتلا ہو جسکی وجہ سے زوجیت کے رکن اعظم کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اذن عام ہے کہ ایسا شخص دوسری شادی کرے۔ اس فرمان کے اجرا کی تاریخ سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ بعینہٖ انہی اصولوں پر مبنی ہے جسکی تلقین رسول عربی نے کی تھی۔ چونکہ

رسول اکرم فخر معظم کی ولادت سنہ ۵۶۹ء میں ہوئی۔ اس لیے یہ یقینی ہے کہ اسلامی قانون جو اس ضمن میں منضبط ہوا تھا پوپ نے اسکی نقل کی شمشیر اسلام اکیسویں چھبیس[۱۲۶] سال سے فتوحات میں مصروف تھی، اور اس کے قانون معاشرت و اصول تمدن نے مشرق و مغرب کے خیال میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا +

گرگری آف ٹورز کہتا ہے کہ میری ونجین خاندان کے شاہان تمام کثیر الازدواج تھے اور انہیں خصوصیت کے ساتھ شارلمین جو زمانہ وسطی میں مذہب عیسوی کا نہایت زبردست مدعی تھا، اکٹھی پانچ بیویاں رکھتا تھا۔ اس شخص کا مذہبی جوش اسدرجہ بڑھا ہوا تھا کہ کوئی غیر مذہب والا جسجگہ مل جاتا تھا اُسی دم زبردستی عیسائی کرڈالتا تھا اور اگر کوئی بدبخت انکار کرتا تھا تو اسکو دتہ تیغ بیدریغ کرتا تھا۔ اس مقدس داعی نصرانیت کے پانچ بیویاں تھیں، ایک کو طلاق دے کر دو اور کرلیں اور اسطرح چھہ ہوگئیں +

خیر شارلمین تو رومن کیتھلک تھا، مارٹن لوتھر صاحب کو لیجئے جو بانی مبانی فرقہ پرٹسٹنٹ ہیں، یہ بکثرت ازدواج کے موئد تھے۔ اسکی تصدیق اس تاریخی واقعہ سے ہوتی ہے کہ لینڈگیرمو آف ہیسی (نواب اعظم ریاست ہیسی) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ لینڈگیرمو پرٹسٹنٹ عقائد رکھتے تھے اور اس لئے انکی دلی خواہش یہ تھی کہ انکا جانشین بھی اسی فرقہ کا پیرو ہو لیکن اتفاق سے اُن کے ورثا میں کوئی لڑکا ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے مارٹن لوتھر سے اس اہم مسئلہ کے متعلق استصواب کیا۔ عالم موصوف نے بکمال خوشی انہیں اجازت دی کہ وہ شوق سے دوسری شادی کریں۔ فتوے کے یہ الفاظ ہیں۔

"شادی کوئی استباع نہیں بلکہ ایک قانونی معاہدہ ہے، اسلیے لینڈگیرمو آف ہیسی بالکل مجاز ہیں کہ وہ دوسری شادی کرلیں"

تاریخ انگلستان کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایڈورڈ اول کے زمانہ میں کوئی قانون خلاف کثرت ازدواج نہ تھا ولیم فاتح کے عہد میں کلیسائی عدالتوں میں اس رسم کے مقدمات سماعت ہوتے تھے۔ اگر مجرم کوئی بااثر یا صاحب ثروت شخص ہوتا تھا۔ تو عالی وقار بشپ چشم پوشی کرجاتے تھے۔ روئداد عدالت کی کوئی مثل ایسی دیکھنے میں نہیں آتی کہ جس سے کسی ملزم کو ایک سے دو نکاح کرنے کی پاداش میں سزا ملی ہو۔ البتہ غربا جور و ستم کرنے کے لیے یا کوئی مالدار یہودی محض ہاتھ رنگنے کے لیئے اس کے دائرہ میں آجاتا تھا۔ ایڈورڈ اول کے عہد میں یہ قانون تھا کہ جس شخص کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں ہوں، اسکو فیلنی کا مجرم قرار دیا جائے۔ جسکی سزا مال کی ضبطی اور موت ہوتی تھی۔ لیکن یہ سزا صرف جاہلوں کے لیے تھی۔ جو لکھنا پڑھنا جانتا تھا وہ کچھہ جرمانہ دیکر چھوٹ جاتا تھا، غریبوں میں اتنا دم کہاں جو دو دو بیویاں کرتے، اصلی مجرموں کے لیے مراعات تھیں، اس لیے چند دنوں میں یہ قانون اکارت ثابت ہوا۔ جیمس اول کے زمانہ میں یارلوگوں نے چاہا تھا کہ کچھہ اور بچاؤ کی صورتیں نکالکر پُرانے قانون کو از سر نو جاری کیا جائے۔ لیکن یہ مسودہ جارج چہارم کے وقت تک پڑا رہا۔ ہنری ہشتم اور جارج چہارم کے حالات ناظرین سے مخفی نہیں، موخر الذکر تو عیش کا بندہ تھا، اس نے اس جرم کو جرائم کبیرہ کی فہرست سے نکالکر سزا میں تخفیف کردی پہلے سزائے موت تہی اب ایک کے ہوتے دوسرا نکاح کرلینے پر سات سال کے لیے عبور دریائے شور ہے اور یہی قانون آج تک چلا جاتا ہے +

اہل چین میں زمانہ قدیم سے کئی شادیوں کا رواج چلا آتا ہے، چین کے متبحر عالم و فلاسفر کنفوسیس کی تصانیف جن صاحبان کی نظر سے گذری ہونگی، انہیں معلوم ہوگا کہ اس نے نہایت فصیح بلیغ پیرایہ میں اس رسم کی تائید میں

قطعی الدلالت اثبات پیش کیئے ہیں۔

یورپین ممالک میں سوائے سویڈن کے اور کہیں کثرتِ ازدواج کو گناہ کبیرہ خیال نہیں کیا جاتا، لیکن یہاں تو روزِ ازل سے یہ رسم بمنزلہ قتل کے شمار کیجاتی ہے، اور مجرم کو سزائے موت دیجاتی ہے حقیقت میں یہ امر قابل استعجاب ہے کہ دنیا کی تمام شمالی اقوام ایک شادی کی پابند ہیں جس قدر آپ منطقہ معتدل اور حارہ میں اُترتے آئینگا اسیقدر زیادہ آپ کثرت ازدواج کی رسم پائینگا۔ جنوبی یورپ، ایشیا، افریقہ، ہندوستان، امریکا مختصر یہ کہ تمام اقوام عالم میں یہ رسم کم وبیش مختلف صورتوں اور طریقوں سے برتی جاتی تھی

محمد اکرام

مشہور یورپین عالم نانتجا زالکھتا ہے

مرد کتنا خودغرض ہے کہ اس نے علم تشریح تک میں اپنی مکاری کو ہاتھہ سے نہ دیا یہہ ہی نہیں کہ اس نے اس ظلم پر بس کیا ہو بلکہ اس نے یہہ عہد کرلیا کہ وہ انسانیت کے اعتبار سے عورت کو اپنے سے بہت ہی بدتر ثابت کرے اور اس کا درجہ انسان اور بندر کے بیچ میں رکھے صرف اس لیئے کہ اپنی غرض پوری کرنے اور اسکو جائز حقوق سے محروم کرنے میں کامیاب ہو۔ افسوس کہ وہ یہہ بھول گیا کہ جس عورت کو ذلیل کرنے کی وہ اتنی کچھہ کوشش کر رہا ہے وہ اسکی ماں ہے ؂

قطعہ

وہ کون ایسا ہے، جو رکھتا نہیں منہ اور سخن ور ہے
دمِ رفتار، اُس کے زیرِ پا ہے، فرشِ نورانی
جو ٹہلے وہ، تو ٹہلیں پانچ خادم، اُس کی خدمت میں
جو لیٹے وہ، تو ہو وقفِ سکوت و محوِ حیرانی
جو دیکھو شکل اُس کی، تو وہ اِک انگشتِ حیرت ہے
جو پوچھو کام اُس کا، تو شجر آسا گل افشانی
برنگِ میلِ سرمہ، چشم سے ہے ارتباط اُس کو
مگر وہ چشمِ تر، ہو جس میں اشکوں کی فراوانی
اُٹھاؤ، تو اُٹھے وہ، چھوڑ دو اُسکو تو گر جائے
جو کاٹو اُس کے سر کو تو بڑھے اُس کی زباں دانی
نہیں حدّاد وہ، لیکن بنا دیتا ہے زنجیریں
بڑا نقاش ہے، لیکن نہ بہزاد اور نہ ہے مانی
عیاں کرتا ہے وہ، حالِ جہاں کو، گر اشارہ ہو
اُگل دیتا ہے، پیتا ہے زباں سے جس قدر پانی
زبانِ گنگ سے گویا، سرِ بے جبہہ سے ساجد
چلے تو اشک بے دیدہ سے ہو مصروفِ گریانی
زباں کا سخت ہونا، اُس کے وصفِ خاص میں داخل
رگوں سے جسم پُر، لیکن نہ مثلِ جسمِ انسانی

شہودِ رازِ پرحادی، کشودِ کار پر مائل
نمود اُس کی، جہاں دیکھو، وجود اُس کا بیابانی
نہیں جان اُس میں، لیکن، زندہ کرتا ہے وہ مردونکو
نہیں بادل سے کچھ نسبت، مگر کرتا ہے نیسانی
زباں میں زخم، لیکن، ورد سے محفوظ، اور گویا
کبھی وہ عیب جو ہے، اور کبھی صرفِ ثنا خوانی
نہ حس اُس کو، نہ روح اُس میں، مگر چلتا ہے، پھرتا ہے
نہیں آنکھیں، مگر کرتا ہے دنیا کی نگہبانی
سوادِ شام، گویا رنگ ہے، اُس کی قلمرو کا
بیاضِ صبح، گویا تختۂ مشقِ سخن دانی
ہُوا صحرائے عالم میں، وہ، اے شوق اسلیے پیدا
کہ ہو سر پنجۂ اہلِ قلم میں صرفِ جولانی

بہ قلمِ، احمد علی، شوق، قِدوائی،

دنیا کی موجودہ حالت پر فلسفیانہ نظر ڈالکر دیکھیں تو گویہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہاں کا قیام عارضی ہے مگر یہ مقام عارضی قیام کے واسطے بہتر سے بہتر ہے دوسروں کی بُرائی پر آنسو بہاؤ مگر یاد رکھو کہ بنی نوع انسان کی ذلت فطرت انسانی کی ذلت نہیں ہماری اپنی ذلت ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ دوسروں کی ہنسی اُڑائیں بلکہ انپر اسیطرح روئیں جسطرح اپنے اوپر۔　　(ہیزلٹ)

حیات بعد ممات

نمبر (۱)

تمدن کا اعلان پڑھ کے بے انتہا مسرت ہوئی، اعلان دیکھ کے یہی جی چاہا کہ اس کے دسترخوان نعمت پر اپنی طرف سے کچھ چنوں، گو میں کیا اور میرا بوتا کیا، لیکن ایک فطرتی جوش ہے جسکا روکنا مناسب نہ سمجھا۔ سائنس جس کا لٹریچر اردو میں کما ہے اس کی طرف نگاہ دوڑائی مگر ہربرٹ اسپنسر، ہکسلے رل وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ انہیں زبان اردو کا لباس پہنانا، اور عرش کے تارے توڑنا برابر ہے، ذہن میں اتنی رسائی نہ زبان میں اتنی وسعت، آخر مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے زرین مقولہ کو مدنظر رکھہ کے نیچے درجے کی تصانیف پر ذہن لڑایا، ایک کتاب جچی، جو ایک فرانسیسی فاضل ادیب کی زور قلم کا نتیجہ ہے، انگریزی میں اسکا ترجمہ ہوگیا جسکا نام "دی ڈے آفٹر ڈیتھ" رکھا گیا اور جسکا میں قوام کشید کر کے جستہ جستہ "حیات بعد ممات" کے عنوان سے ہدیہ ناظرین تمدن کرونگا۔

مصنف اس کتاب کا فرقہ طبعیون میں سے ہے۔ علوم جدیدہ، طبعیات، ملکیات، عنصریات، وغیرہ وغیرہ سے دلائل و براہین کی فوجیں اپنی کمک میں لاکر مملکت غیب کو فتح کرنا چاہا ہے، لفاظی اور بلند خیالی کے فیلان مست کو قرطاس پر ٹکرایا ہے اور اس امر کے استفسار پر قیاس دوڑایا ہے، کہ روح انسانی عالم اجسام سے وداع ہو کر کہاں جاتی ہے اور اسکا کیا حشر و نشر ہوتا ہے؟ سوال پرانا ہے لیکن اس طرفہ معجون انسان کا مرتبہ نظام نہت نیا اور اچھوتا ہے

نگارش کی مرصع نگاری عجیب و غریب اور دلائل کی معجون نرالی چٹ پٹی ایسی کہ جو پڑھے زبان چٹخارے بھرے۔ اور لطف یہ کہ پڑھنے والا باتوں ہی باتوں میں بہت سارے اصناف علوم کی ماہیت کو سرسری نظر سے دیکھہ جائے اور جان جائے کہ انکی صورت و ہیئت کیسی ہے اور وہ کیا ہیں!

اصلی کتاب زبان فرانسیسی میں بلحاظ انشاپردازی گلگشت چمن ہوگی۔ ترجمہ کرنے کے لیئے بڑی صنعت درکار ہے، مترجم خواہ کیسا ہی فاضل ہو، ترجمہ پھر بھی قالب بے روح کہلاتا ہے،، زبان انگریزی میں آنے سے ضرور ہے اسکی ضائع و بدائع کی جان آدہی رہ گئی ہوگی اور اب جبکہ میں اس کے اصل الاصول کا نقشہ اُردو کے رنگ و روغن سے مزین کرنا چاہتا ہوں تو قطعی اس کے اصلی روپ کی کایا پلٹ ہوجائے گی۔ بہرکیف اب تو اس کی قسمت کا لکھا پورا ہوگا۔ السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

مسٹر لوی نگار نے جو اس کتاب کے مصنف ہیں ایک نہایت دلچسپ دیباچہ لکھا ہے، جسمیں سے ہم طویل اقتباسات کرنے کی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، چونکہ اہنیں ہی تصویر کا خاکہ کئی رخوں سے کھینچا ہے اس لیئے دلچسپی سے مملو ہے۔

ناظرین باتمکین! آپ کو مرنا ہے، نہ معلوم موت آج آجائے یا کل لیکن یہ تو فرمایئے آپ کو کچھہ یہ بھی خبر ہے کہ آپکا حشر کیا ہوگا؟ موت کے بعد آپ کیا ہونگے۔ میرا مافی الضمیر آپکا جسم نہیں۔ آپکا جسم ایک بے حقیقت چیز ہے اسکی وقعت کپڑے جو آپ کے تن پہ ہیں یا کفن جسمیں لپٹ کر یہ دفن ہوگا اس سے زیادہ نہیں۔ اسی لباس اور کفن کی طرح اسکا تجزیہ ہوجائیگا۔ اور عناصر جس سے اس نے ترکیب پائی ہے وہ قدرت کے عظیم الشان مادی ذخیروں آب و خاک و ہوا

میں جاملیں گے۔ لیکن آپ کی روح یہ کہاں جائے گی۔ اسکا کہاں ٹھکانا ہوگا؟ وہ روح جو آپ کے جسد عنصری میں بے کھٹکے ساری ہے وہ روح جو غور و فکر، پیار و محبت کرتی ہے۔ وہ روح جو درد و دکھ جھیلتی ہے یہ تو فرمائیے کہ آخر اسکا کیا حشر ہوگا میں نے مانا یہ آپکا عقیدہ نہیں کہ آپ کی روح اجل کے آتے ہی لائف[۵] کے ساتھ بجھ جائیگی۔ اور یہ کہ وہ چیز جو آپ کے سینہ میں پنکھے کے مانند ملتی ہے۔ عالم مسرت وراحت میں یا عسرت و کلفت میں دل کی کور پر کھٹکتی ہے فرط ناز و نیاز اور بے شمار جذبات و حادثات زندگی میں دھڑ پکڑ ہوتی ہے اسکا نام و نشان نہیں رہے گا!
پھر وہ ذی حس غیر فانی روح کہاں جائے گی اس کا کیا ہوگا اور آپ کیا ہوں گے؟

تمام حکمائے متقدمین یک زبان ہیں کہ موت کے حشر و نشر کا سوال لاینحل ہے بڑی کد و کاوش کے بعد انہیں یہ کہدینا پڑا کہ عقل انسانی میں اتنی تاب و طاقت نہیں کہ اس پر اسرار عقدہ کو حل کر سکے اس لیے معقول طریقہ یہی ہے کہ اس قسم کے تجسس و تفحص سے اجتناب کرے۔ بنی آدم کا علی العموم یہی استدلال رہا ہے خواہ وہ غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے ہو یا اعتقاداً۔ ماوراے ازیں جب ہم اس مہیب ناک سوال پر نظر غائر ڈالتے ہیں تو چاروں طرف سے ہمارے دل و دماغ پر ایسی سیاہی کی گھٹا چھا جاتی ہے کہ جس سے ہماری تلاش و جستجو کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آیندہ زندگی کے حالات دریافت کرنے کے خیالات کو طاق نسیاں میں رکھدیتے ہیں +

---

۵ لائف کا مرادف یا قریب المعانی لفظ اردو میں جان ہے لیکن ہم پوری ہمت سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ کہاں تک اس مفہوم کو ادا کرتا ہے اس لیے ہم نے بجنسہ لائف رکھا ہے اور اسی کو استعمال کریں گے جان الگلوئی ایل ایل ڈی کہتے ہیں لائف وہ چیز ہے جو جسم اور روح کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے سر سید علیہ الرحمۃ نے لائف کا ترجمہ نفس کیا ہے ناظرین اسے اپنے آپ سمجھ لیں +

بایں ہمہ واقعات عالم ہمیں اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم اس تیرہ و تاریک موضوع پر توسنِ طبع کو جولانی دیں، جب ایک شخص کی کشتی عمر موت کے کنارے آلگتی ہے یا جب اس کا کلیجہ کا ٹکڑا داغِ مفارقت دیجاتا ہے تو وہ حیات بعدِ ممات کے خیال سے نہیں بچ سکتا۔ اور جب ہم گرمجوشی اور صدق دلی سے اس سوال پر غور و خوض کرتے کرتے عالم استغراق میں پہنچ جاتے ہیں تو پھر ہماری طبیعت اِس امر کے قبول کرنے کی طرف راغب نظر آتی ہے کہ یہ معما جو زمانہ قدیم سے لاینحل چلا آتا ہے انسانی تخیل کی حدِ پرواز سے بعید نہیں۔

عمر کے بڑے حصے تک اس کتاب کے مصنف کا ہر فرد بشر کے ساتھ یہی خیال رہا کہ آیندہ زندگی کے معمے کی عقدہ کشائی میں ہماری عقل قاصر اور تصور خام ہے، اس لیے حقیقی دانائی اسی میں ہے کہ اپنی جان کو ضغطہ میں نہ ڈالیں اور سوہانِ روح نہ بنا دیں۔ لیکن خدا کا کرنا ایک دن بیٹھے بٹھائے اندوہ و غم کی بجلی ٹوٹ پڑی اسکا نونہال جو تمام امیدوں کا ملجا و ماویٰ تھا، کشورِ اجسام سے عالمِ ارواح کو سدھار گیا اس جانکاہ صدمے کے رنج و محن میں اسکی طبیعت بے اختیار تفکر و تعمق کے پر لگا کے اڑی تا کہ معلوم کرے کہ آنے والی زندگی کا اسرار کیا ہے، جہاں ہم سب کو جانا ہے، بے انتہا کاوشِ فکری و عرق ریزی کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا:-

اوّل تمام محققہ اصناف علم جو اس بات میں ہیں، ان سے دریافت کیا کہ وہ اس سینہ خراش موضوع پر کیا قطیع الدلالت اثبات اور اطلاعیں بہم پہنچا سکتے ہیں

دوئم جاہل اور سادہ دل اشخاص سے، دہقانی و گنوار سے، تعلیم سے بے بہرہ شہریوں سے جستجو و قدح کی اور ان کے خیالات کو دماغ میں محفوظ کر لیا، اس لیے کہ نیچر کے سچے اصول سمجھنے کے لیے مصنف کی نگاہ میں ان سے بہترین ذرائع

وسائل نہیں تھے چونکہ قدرت نے انکی فطرت میں جو خیالات ودیعت کر دیے تھے وہ بجنسہٖ
اُن کی لوح دل پر آئینہ تھے اسلیئے ترقی علوم یا فلسفہ عام کے دستور العمل نے ان میں
کچھ بھی انقلاب پیدا نہیں کیا تھا۔

مصنف نے متذکرہ بالا ذرائع کی بنیاد پر جاودانی زندگی کے متعلق اپنے
ایسے ان سلسلۂ خیالات کو کامل طور پر ترتیب دیا ہے جو اُس کے ساتھ دنیا سے
اُٹھنے کے بعد پیش آنے والے ہیں۔

مصنف کا مرتبہ نظام فطرت یا نیچر پر مشتمل ہے، ہر ایک[۱] ذی روح جسم کا علاقہ
اُس جسم سے ہے، جو اُس سے پیشتر ہو چکا ہے یا جو اس کے بعد آنے والا ہے
چنانچہ اسی سرائے فانی کی ذی روح مخلوق میں یہ تسلسل لگاتار چلا جاتا ہے، نباتات
اور حیوانات، حیوانات اور اشرف المخلوقات، ایک سلک میں منسلک ہیں ایک
ڈورے میں پروئے ہوئے ہیں جنکا دورا بدالآباد تک چلا جائیگا اور جن کی اخلاقی
اور جسمانی تنظیم ایک نقطہ پر جاکر ملتی ہیں اور خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ اس سے نتیجہ
نکلا کہ کوئی فرد اکمل جسکو یہ یقین ہو جائے کہ اُس نے اس نظام عالم کے
صرف کسی نکتہ یا واقعیت کو تحقیق کر لیا تو وہ اس نکتہ یا واقعیت کا با حسن وجوہ
نہایت سرعت سے تمام جاندار مخلوق پر اطلاق کر سکتا ہے اور ایک کڑی کو
دوسری کڑی سے جوڑ کر صحیفۂ فطرت کے دراز سلسلہ کو مرتب کر سکتا ہے
چنانچہ مسٹر فگار کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اور جب انہوں نے ہمارے روح
کا جسم انسانی سے پرواز کرنے کے بعد کا ٹھکانا معلوم کر لیا تو اپنی آرا کو تمام ذی روح
حیوانات اور نباتات پر عائد کیا، فکر و دلیل نے اُن اجسام کے مطالعہ پر مجبور کیا جنہیں
چشم بینا دیکھ نہیں سکتی اور جن کے ذریعہ سے استنباط کیا کہ اختر و کواکب اور لکھو کھا
تارے جو فضائے عالم پر منتشر ہیں یہ سب آباد ہیں پس آپ اس مضمون میں صرف

[۱] یہ عقیدہ اسلام اور ہندو ازم سے بالکل مختلف ہے مترجم مضمون کے خاتمہ پر اس سے بحث کریگا۔ مترجم

زندگی جاوداں کے پیچ در پیچ عقدہ کی از روئے سائنس حل کرنے کی مساعی نہیں پائیں گے بلکہ نیچر کے مسئلہ اور نظام عالم کے حقیقی فلسفہ کا انکشاف بھی ملاحظہ فرمائینگے

اس کتاب کے لکھنے کا مسٹر فگائران الفاظ میں عذر پیش کرتے ہیں اور اہل فضل و کمال کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ وہ بھی اس معمائے لانیحل کی عقدہ کشائی میں سعی فرمائیں۔ کہتے ہیں:-

شاید میں دھوکا کھا رہا ہوں، شاید میں اپنے فکر کے خواب خیال کو حقیقی وقائع سے تعبیر کر رہا ہوں، یا شاید میں ظلمت کے بحر ذخار میں جا پڑا ہوں، راستہ بھول گیا ہوں اور راستے ٹٹول رہا ہوں، بہرحال میرا گمان یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں نہایت صدق دلی اور صفائی قلب سے، میں امید کرتا ہوں کہ ارباب دانش کو میری ناچیز تشکیل اس باب میں مزید کوشش کرنے کے لیے آمادہ کر دے اور وہ اپنے فضل و کمال اور محققہ علوم کو اس عظیم الشان مسئلہ کی چھان بین، تحقیق و تکشیف کے لیے حرکت میں لائیں اور بنی نوع انسان کے ہستی ناپائدار سے وداع ہونے کے بعد کی کیفیت کو پردہ فطرت کے سامنے سے ہٹائیں۔ اس شعبۂ علم میں اگر ایک سلسلہ تصانیف کا تدوین کیا جائے تو میرے خیال میں یہ کام نیچرل فلاسفی اور ترقی بنی نوع انسان کی نہایت زبردست خدمت کی منزلت رکھے ۔

۱۸۷۰ء کے روح فرسا ہنگامہ تباہی میں فرانس کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا، جسکو اپنے کسی عزیز یا اقارب کا دل سوز ماتم نہ کرنا پڑا ہو، میرے لخت جگر کا داغ جو سینہ پر ہے وہ تو خار زار یاس و حرمان بن چکا، دل کی کملاہٹ کو شادابی کہاں، ہاں اتنا ہے کہ اس تصنیف سے دل وحشت زدہ کو قدرے سکون ہو گیا۔ میں بوثوق کہتا ہوں کہ وہ صاحبان جو اس قسم کے چرکے کھا چکے ہیں اور کسی کی

مفارقت میں خون کے آنسو بہاتے ہیں، اُن کے حرماں زدہ دلوں کو ان اوراق کے مطالعہ سے تسکین قلب ضرور ہوگی۔"

آجکل سوسائٹی کو ایک مہلک عارضہ لاحق ہوگیا ہے، جو اس کے اخلاقی جوہر کو گھلائے دیتا ہے، اور خوف ہے کہ کہیں اسکی جان سلب نہ کر ڈالے یہ عارضہ مادہ پرستی ہے۔ مادہ کی ماہیت وحقیقت کی اول اول دارالعلوم جرمنی کے کتب فلسفہ نیچرل سائنس میں تعلیم دیگئی تھی، کچھ زمانہ بعد وہ فرانس میں بھی پھیل گئی، طبقہ حکمار وفضلار میں کچھ دنوں رہکر تعلیم یافتہ جماعت میں اُترائی، ان کو خوب متاثر کرکے عوام الناس میں گھس گئی جنہوں نے مادہ پرستی کے عملی نتائج کا خوب سبق پڑھایا۔ تمام تعلقات انسانی کی بندشوں کو توڑ دیا، بزرگوں کا ادب لحاظ اوٹھہ گیا، اصول زندگانی پر پانی پھر گیا۔ مذہب، وبزرگان دین کا ادب، ملک کی آزادی کا خیال نظام تمدن ومعاشرت کا تار تار جدا کر دیا، سب یک قلم آزاد ہوگئے۔ نتیجہ عیاں تھا جو نہایت خوفناک صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ ایک زمانہ تک غدر مچتا رہا اور پھر ایک جماعت خونخوار دیوانوں کی اٹھی جس نے دارالخلافہ فرانس میں کشت وخون کی گرم بازاری کی اور خوف ورجا، آگ وپانی سے فتنہ محشر بپا کر دیا +

اسکو کون حب الوطنی کہہ سکتا ہے؟ جس نے پیرس کی متقدس اور مشہور یادگاروں کو آگ لگوائی، اینٹ سے اینٹ بجوادی! یہ صریح مادہ پرستی تھی! اس سے زیادہ صاف اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ جس گھڑی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھہ جائے کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے، موت کے بعد کچھہ بھی پیش نہیں آنی ہے تو میں کیا اور آپ کیا! ایک کیا اور ہزار کیا، تمام دنیا کے افراد من حیث المجموع شورہ پشتی پر آمادہ ہوجائیں، لوٹ اور غارت مچائیں، اور پھر آپ

جو ہم نے بیان کیا، اور یہی زندگی اور موت کے پُرزے ہیں +

یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جسم، روح اور لائف کا امتزاج صرف انسان سے ہی وابستہ نہیں، یہ تینوں چیزیں حیوان میں بھی ہوتی ہیں، حیوان کا جسم بھی ذی حس ہوتا ہے اور روح ہوتی ہے، لیکن حیوان کی روح بمقابلہ انسان بدرجہا پست ہوتی ہے، حیوان کی ضرورتیں گنتی کی ہوتی ہیں اسی ہی کی اقتضا سے اسکی قابلیتوں کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور جو کچھ بھی قابلیتیں ہوتی ہیں وہ ابتدائے حالت میں ہوتی ہیں انسان کے قوائے دماغی کی ترکیب ایسی ہے کہ اسمیں ترقی کیطرف صعود کرنے کی غیر محدود قابلیتیں ہوتی ہیں اور یہی انسان اور حیوان کا مع الفارق ہے ورنہ دیکھا جائے تو بہت سی حالتوں میں جسم کی بناوٹ اور عضو کا فعل ہو بہو یکساں ہوتا ہے +

جسم، روح اور لائف کا بعد موت کیا حشر ہوتا ہے؟

موت کے بعد جسم، خواہ انسانی ہو، یا حیوانی، کیمیائی طاقتوں کی حکومت کے تابع ہوجاتا ہے، چونکہ لائف جو اسکو تباہی سے محفوظ رکھتی تھی وہ اب فنا ہوجاتی ہے اگر کسی انسان یا حیوان کی لاش کو ایسے مقام پر رکھا جائے، جہاں حرارت کا درجہ صفر سے نیچے ہو یا ایسے مقام پر بند کردیا جائے جہاں ہوا کا مطلق گذر نہو یا ایسی خوشبوؤں وعطریات میں بسا دیا جائے، جس سے لاش سڑ نہ سکے تو وہ ایسی تروتازہ رہے گی جیسے لائف جدا ہوتے وقت تھی۔ اسی طریقہ کو انگریزی میں ایمبامنگ کہتے ہیں۔ مختلف النوع کیمیائی اجزا جنہیں لاش کو بسایا جاتا ہے انکا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مردہ کے رگ وریشہ کے تار تار کو وابستہ رکھتے ہیں اور تفریق عناصر نہیں ہونے دیتے، اسی طرح اگر آپ یخ بستہ کی دو سلوں کے بیچ میں میت کو رکھدیں یا تابوت کو برف میں لگادیں اور تازہ بتازہ برف پہنچاتے

رہیں تو متذکرہ بالا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ نقطۂ انجماد میں بے جان جسم رکھنے سے تجزیہ نہیں ہوتا، کیونکہ جسم مردہ میں خمیر اٹھانے اور ٹہراسنے کے لیے حرارت میں کافی استعداد نہیں ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ قرون اولیٰ کے عظیم الجثہ میماتھ یا ہاتھیوں کی لاشیں جوں کی توں ہزار ہا سال تک قائم رہیں ۱۸۰۶ء میں ایک عفریت تن و توش والے جانور کی لاش، بالکل صحیح و سالم دریائے لینا کے کنارہ پر ملی، یہ دریا بر اعظم ایشیا کے قطب شمالی حصہ میں بہتا ہوا بحر منجمد شمالی میں گرتا ہے۔ دریائے لینا کے کناروں پر برف نہایت گہری تہ میں سدا رہتی ہے، اسمیں یہ دیو ہیکل جانور جا پڑا تھا اور اسکی لاش برف میں دبے رہنے کی وجہ سے مطلق متعفن نہ ہو سکی اور ایک لاکھ برس بعد اس مقام کے ماہی گیروں کی غذا بنی۔ شمالی ملک میں اگر کوئی شخص لاش کو سلامت رکھنا چاہے تو وہ بآسانی برف میں لپیٹ کے جب تک جی چاہے رکھ سکتا ہے،

جب کسی آدمی یا جانور کی لاش ہوا، پانی اور معتدل درجہ حرارت کے مجموعی تاثیر کے زیر اثر آتی ہے تو اُس کے اجزا میں تجزیہ کا دور شروع ہو جاتا ہے، اور انجام کار عناصر بشکل کاربانک ایسڈ گیس اور چند مرکبات، جامد یا تحلیل شدہ، تبدیل ہو جاتے ہیں، یہ جسم کے زائل ہونیکی منزل اول ہے، مختلف قسم کے گیسز مثلاً کاربانک ہائیڈروسلفرک (پانی اور گندک ملی ہوئی گیس) ایمونانک (نوسادر یا شور ملا ہوا گیس) اور پانی کے بخارات ہوا میں اڑے اڑے پھرتے ہیں یا زمین کی سیل اور رطوبت میں گھل مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد کی منزل میں ان مرکبات کو جو زمین کی سیل میں شیر و شکر ہو جاتے ہیں ننھے ننھے پودوں اور جڑی بوٹیوں کی جڑیں چوس لیتی ہیں جو انکی غذا ہے اور جن پر انکا مدار زندگی ہے۔ اب رہے وہ مرکبات جو ہوا میں منتشر اڑتے پھرتے ہیں انکی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مینہ کے پانی کے ساتھ نیچے اُتر آتے ہیں

اس چند روزہ زندگی میں جو انسان پر جسمانی کوائف گذرتے ہیں : قابل نفرت ہیں، انسان ضعیف البنیان بے کس و بے بس، اسکی جسمانی ساخت ناقص ہمیشہ خارجی عوارض سے معرض خطر میں رہتا ہے، سردیوں میں سردی کی شدت، گرمی کی حدت سے ڈرتا ہے، کمزور، بیمار، جسم ننگا عالم ہستی میں آتا ہے، آب وہوا کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے اس کے پاس کوئی قدرتی سامان نہیں ہوتا، اگرچہ یورپ اور امریکہ کے معدودے چند حصوں میں تہذیب و شائستگی کے دم قدم کی برکت سے امیر امرا اور با ثروت لوگوں کے لیے ہر قسم کا تعیش و تنعم کا سامان مہیا ہے لیکن ان ہی بر اعظموں میں غریب غربا کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اقالیم ایشیا، افریقہ اور اوشینیا کی مضر صحت آب وہوا میں خلق اللہ کی کثیر جماعت کا جام عمر ہمیشہ مصائب و تکالیف سے لبریز رہتا ہے، اور وہ زمانہ جبکہ بنی آدم وحوش اور بہائم کے مانند تھا، وہ زمانہ جسکی پہنائی ہم سے لکھو کھا برس کے فاصلہ سے بھی بعید ہے۔ ہاں! اس زمانہ میں بنی آدم کا نوشتۂ تقدیر کیا ہوگا، مصیبت آفت، خوف وخطر، اور درد والم کا ایک دور ہوگا جسکو قرار نہوگا۔

کیا جسمانی اور کیا اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان کی زندگی چمن غموم و خارزار آرام ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ اس سرائے فانی میں انسان کے لیے شادمانی ناممکنات سے ہے، صحائف مقدسہ میں کسقدر حسین شاعرانہ تخیل واقع ہوا ہے جو قاطبتہً ہمارے حال زار پر صادق آتا ہے، کہ ''یہ چمنستان ارض وادی رشک ہے''

فی الحقیقت انسان کے نوشتۂ تقدیر میں ہجوم افکار و حوادث روزگار کے علاوہ اور کیا دھرا ہے، اس کی خواہشیں، اس کے ارمان، سب میں تشنہ کامی شورِ بخت، سب خاک میں مل جاتی ہیں، وہ کوشش وسعی کرتا ہے تقدیر کا زبردست ہاتھ پیچ دیکر اٹھا دے مارتا ہے، غیر مغلوب و ناقابل تسخیر کاوشیں قافیہ تنگ و عقل دنگ کر دیتی ہیں

حیران وسرگرداں، ششدر متحیر رہجاتا ہے، خون کے آنسو بہاتا ہے، جگر کاٹ کاٹ کے کھاتا ہے، شکم چین وکامرانی اس کے لیے امر ممتنع ہے، راحت کی چند گھڑیاں جو کبھی میسر آجاتی ہیں تو اُس کے کفارہ میں رنج ومحن کا لبلب ساغر پینا پڑتا ہے۔ ہم سے ہماری پیاری چاہیتی چیزیں چھین لی جاتی ہیں اور ہم دم نہیں مار سکتے۔ ہماری آنکھوں کا تارا، ہمارا قوت بازو، ہماری مادرِ مہربان، ہماری ہمشیرہ تسکین بخش، ہماری محبوبہ دل آرام ہماری آنکھوں کے سامنے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

یہ ناممکن ہے کہ ایسی بے قاعدہ حالت ایک ایسی محدود کیفیت ہو جس کے بعد کچھ نہو، ترتیب، تناسب، مساوات کا عالم اجسامی میں چاروں طرف ظہور ہے اور بعینہٖ حالت عالم اخلاقی میں ہے۔ لیکن ترتیب وتناسب ومساوات کو ایک طرف اور بے قاعدگی وکوائف گوناگوں کو دوسری طرف، جب مشاہدہ کے کانٹے میں رکھہ کر ہم تولتے ہیں تو ہمیں دنیا کی بے قاعدگی کا پلڑا جھکا ہوا نظر آتا ہے، اور پھر با دل ناخواستہ سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کہ اس دنیا میں آرام ومصائب کا شہرہ ہے، بے انصافی ظلم وتعدی کا دور دورا ہے، زبردست کو ظفر نصیب ہے جبر وتشدد کے فولادی پنجہ میں مظلوم وبیکس کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس تمام کیفیت کو مدنظر رکھہ کر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب اشیاء فی الواقعی عارضی ہے۔ دار فانی ایک متعدی لمحہ ہے، ایک درمیانی وقفہ ہے، جسکو نہایت سرعت سے گذارنے کے لیے رب الارباب نے ہمیں یہاں بھیجا ہے تاکہ ہم اپنی درستی کر کے، اس سے برتر عالم کے لیے جو نیکی اور ترقی سے معمور ہے تیار ہو جائیں +

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسری حالت کیا ہے، ہماری نئی زندگی جو دنیاوی زندگی کے بعد آنے والی ہے، اُسکی حقیقت کیا ہے یا دوسرے لفظوں میں

یوں کہنا چاہیئے کہ روح انسانی کا کیا حشر ہوگا جب موت کا زبردست پنجہ ان تبدشوں کو جن سے روح اور جسم وابستہ ہیں توڑ ڈالیگا؟

وہ متنفس جو عالمِ بالا کی ذی حیات مخلوق کے درجہ میں آدم سے بھی اشرف اور افضل ہے اُسکا کسی زبان میں کچھ نام نہیں، فرشتہ یا اینجل جو اہل کتاب میں صفات ملکیہ اور قابلیتوں سے ممتاز ہے، صرف ایک ہی وجود ایسا ہے جو ہمارے مفہوم کے لگ بھگ اور ہمارے خیال کے ادا کرنے میں پورا اترتا ہے۔ جین رینان ایک فرانسیسی فاضل نے بھی اِس اشرف مخلوق کو جسکی نسبت اسے کامل یقین ہے کہ وہ بنی آدم کا دم نکلنے کے بعد عالم بالا پر اسکا جانشین ہوتا ہے، ملک کے نام سے تعبیر کیا ہے، لیکن ہم اس لفظ کو اپنے لفظی جغرافیہ میں منفصل نہیں کریں گے اور اس مخلوق کامل کو جو ہمارے اعتقاد کے موافق انسان کے بعد نیچر کے مدارج ترقی کے سلسلہ میں آتا ہے، مافوق الانسان کہیں گے ؛

سید شوکت دہلوی

غزل

از شمس العلماء میرزا موسے کوثر صاحب

تحمل سخت مشکل ہے بیان ماجرا مشکل　　عجب حالت ہوئی آساں کرے میری خدا مشکل
کہوں کس منہ سے اور اب کیسے مطلب ہو کیونکر　　سکوت و صبر مشکل عرض حال و مدعا مشکل
علاج دردِ دل میرا کرے وہ آپ ہی ورنہ　　مداوا میری مشکل ہے دوا مشکل شفا مشکل
نہیں مشکل رہائی رنج سے اشکال ایسے ہیں　　پڑی مشکل میں جاں ایسی کہ جینا ہو گیا مشکل
بقا سے تنگ ہوں بعد از فنا کیا جانوں کیا ہوگا　　مجھے ہر طور مشکل ہے بقا مشکل فنا مشکل
رواں کی میں نے کشتی کہکے بسم اللہ مجریہا　　نہ اب دریا نے غم مشکل نہ طوفاں بلا مشکل
نہو کوثر ہراساں صبر ہے ہر حال میں اچھا　　کرینگے لطف سے آسان میری مشکل کشا مشکل

اسلام

مولوی سید علی حیدر صاحب زیدی ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے اپنے برادر عزیز سید محمد مستحسن صاحب زیدی بی۔اے کی یہ نظم ہمیں عنایت فرمائی۔ یہ نظم سید محمد مستحسن صاحب کی پہلی نظم ہے جو تمدن کے پہلے پرچہ میں شائع ہوتی ہے۔

اسلام راہ راست ہے۔ بھٹکے ہوؤں کیواسطے
بھوکوں کی خاطر ہے غذا۔ کپڑا ہے ننگوں کے لیے
پونجی ہے یہ نادار کو۔ قوت نحیف وزار کو
مردہ کو ہے یہ زندگی۔ صحت ہے یہہ بیمار کو
اندہے کو بینائی ہے یہہ۔ لنگڑے اپاہج کو عصا
امید ہے بیکس کی۔ ساتھی ہے یہ بے یار کا
اس کا گدا ہے بادشاہ۔ اس کا غلام آزاد ہے
جس دل میں ہے یہ جلوہ گر۔ وہ دل ہمیشہ شاد ہے
ہے وہ دریکتا۔ جسے۔ کوئی چرا سکتا نہیں
ہے وہ خوشی۔ کوئی جسے۔ ہرگز مٹا سکتا نہیں

(مستحسن زیدی از کیمبرج)

قطعہ

طفلی تھی یا کہ عیش و مسرت کا ایک خواب ‌ ‌ سمجھا نہ میں کہ نیند کا جھونکا تھا یا شباب
ناپائدار زیست کی اب کیا امید ہو ‌ ‌ پیری بھی دے چکی مجھے دنداں شکن جواب

(محمد ہادی۔ عزیز ہا)

اور سچ ہی یہ ہے کہ پردہ نہ کبھی محافظ عصمت ہوا۔ نہ اب ہی۔ نہ آئندہ ہوسکیگا!! اسکی مخالفت کرنا امر حق بجانب ہے اور اس کی اعانت کرنا پرانی لکیر پر فقیر ہونا، اور آنکھیں ہوتے ساتھ ہی اندھا بننا ہے!"

یہ ہیں وہ دلیلیں جو پردہ کے مخالفین پردہ کے معاونین کا ضحکہ اڑانیوالے صاف صاف لفظوں میں یا ہیر پھیر کر بیان فرمایا کرتے ہیں، اور بڑے فخر اور غرور کیساتھ مخاطب کو جاہل اور بیوقوف سمجھکر۔ ارشاد کیا کرتے ہیں! سب باتوں کو چھوڑکر اسقدر تو ہم بھی مانیں گے کہ یہ دلائل و براہین بادی النظر میں تو اچھے سے اچھے کو اپنا ہم زبان بنالیں گی! اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں، تم ہی بتاؤ کہ اس تقریر کو پڑھکر تمھارا خیال پردے کی نسبت کیا قائم ہوا؟ غالباً تم بھی تھوڑی دیر کے لیے تو پردہ کو برا سمجھنے لگی ہوگی۔ اور ہونا بھی یہ ہی چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں، پیاری بہن، ناسمجھ بہن! میں تمھیں بتاؤنگا کہ یہ ساری دلیل مغالطہ اور دہوکا ہی دہوکا ہے! ایسے طریقہ استدلال کو لاجک یا منطق کی اصطلاح میں ڈائی لما کہتے ہیں! تم شاید یہ انگریزی کا لفظ نہ سمجھو۔ خیر۔ میں تمھیں اور طرح سمجھاؤں گا!!

میں کہتا ہوں کہ قانون فوجداری جرائم کی سزا دینے کا قانون۔ یا تو محض فضول ہے یا بےسود! تم شاید اس دعوی پر ہنسوگی۔ مگر نہیں پہلے میری دلیل سن لو پھر کچھ رائے قائم کرنا:۔ "انسان بلحاظ اپنے چال چلن کے دو گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نیک یا بد۔ نیک سرشت حضرات خدا نہ کرے جو کبھی بھولکر بھی چوری، جوئے، ڈاکے، قتل وغیرہ کے مرتکب ہوں۔ وہ بغیر کسی خاص وجہ کے خود ان حرکات ہی کو نہایت ذلیل سمجھتے ہیں اور کسی حالت میں بھی۔ بڑی سے بڑی مجبوری اور تکلیف میں بھی ایسے جرم کا ارتکاب نہیں کرسکتے! اس لیئے قانون فوجداری کم از کم ایسے حضرات کے واسطے فضول ہے۔! اب رہے۔ بد اطوار،

آوارہ، بدمعاش، ایسے لوگ صاف ظاہر ہے کہ بید کی سزا جھیلتے ہیں، قیدیں کاٹتے ہیں، حوالات بھگتتے ہیں، لیکن پھر بھی آجتک تو سُنا نہیں گیا کہ کسی ایک بدمعاش کو بھی حوالات، جیلخانہ، اور پھانسی کے خوف نے۔ صرف ان ہی باتوں کے خوف نے ارتکاب جرم سے باز رکھا ہو اور بگڑے ہوئے کو سنبھال لیا ہو! لہٰذا ان کے لیے بھی قانون فوجداری قطعی بے سود ہے! اب نتیجۂ آخری کیا ہوا؟ یہ ہی نا، کہ قانون فوجداری محض فضول ہے یا قطعی بے سود! یعنے محکمۂ پولیس لغو محکمہ! امن قائم رکھنے کی کوشش مجنونانہ خیال!! اور قوانین موجودہ از سرتا پا مہمل اور بیکار!!! صاف ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں تمام اقوام نے غلطی کھائی۔ تمام سلطنتیں اس غلطی میں مبتلا رہیں۔ اور موجودہ زمانہ میں بھی۔ نہایت ترقی یافتہ زمانہ میں بھی۔ اسی غلطی میں گرفتار ہیں!! کیا خوب کیسا اچھا اور بانکا نتیجہ نکلا ہے؟ اگر منطق اور استدلال اسی کا نام ہے تو ہمارا تو دور سے ہی سلام ہے!"

پیاری بہن! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر یہ قانون قطعی منسوخ کر دیا جائے اور پولیس کا محکمہ بھی توڑ دیا جائے۔ تو کیا ہوگا؟ دن دہاڑے چوری، اور رستہ چلتے قتل و غارت!! یہ کیونکر معلوم ہوا؟ زندگی کا مشاہدہ اور روزمرہ کا تجربہ خود بتا رہا ہے، ہماری عقل اور ہمارا دماغ خود مان رہا ہے اگر جو نتیجہ کہ منطق سے نکلا ہے وہ کیوں غلط ہے؟ اب اسکا جواب شاید تم نہ دے سکو، مگر نہیں میں تمہیں خلاف اصلیت یا غلط نتیجہ نکلنے کی وجہ بھی بتاؤنگا! انسان کی تقسیم بلحاظ عادات و چال و چلن کے دو گروہوں پر۔ صرف دو گروہوں پر کرنا بہت بڑی غلط فہمی ہے! نیک طینت گروہ اور بد باطن حصہ، دو انتہائی حدود ہیں۔ جن کے درمیان میں ایک گروہ ہے! یہ درمیانی گروہ، وہ گروہ ہے جو بے عزتی، رسوائی، سزا، جیل، وغیرہ کے خوف سے نیک ہی۔ جو نیک رہنے پر مجبور کیا جائے تو نیک ہے! اور جسے ایسے قوانین کی غیر موجودگی میں

بہت ممکن ہے۔ بلکہ یقین ہے۔ کہ کسی نہ کسی جرم کا ارتکاب۔ رضا و رغبت سے نہ سہی تو بہکانے سکھانے یا کسی فوری جذبہ و جوش کی وجہ سے ہی۔ ہو جائے!! یہی گروہ درمیانی گروہ۔ تعداد میں اور گروہوں سے بڑا ہے اور اسی کے لیے قوانین کی در اصل ضرورت ہے!!! اب تو شاید تم بغیر سمجھائے ہی سمجھ گئی ہو گی کہ یہی دہو کا پردہ والی دلیل میں بھی ہے! عورتوں کے دو حصے۔ نیک اور بد۔ دو انتہائی حدود ہیں:- درمیانی حصہ یہاں بھی غائب ہے! یعنی وہ بڑا حصہ جسکو ہم کچی لکڑی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ایسی چیز جو نہایت آسانی کے ساتھ، اپنے آپ نہ سہی دوسرے کی قوت سے، جا ہے جسطرف جہکائی جا سکتی ہے! وہ گروہ جو گرم و سرد زمانہ کا اثر بہت جلد قبول کر لیتا ہے یا جسپر صحبت کا اثر دیکھتے ہی دیکھتے بہت گہرے نقش ڈالدیتا ہے یہ ہی گروہ بڑا گروہ ہے، اور اسی گروہ کے لیئے پردہ نہایت ضروری چیز ہے!! تم خود سوچو کہ بری صحبتوں، بری نگاہوں، اور شیطان صفت انسانوں سے بچنے کی لیے پردہ سے زیادہ کوئی اور بہتر، آسان، اور اچھا طریقہ ہو سکتا ہے؟ پردہ کے معنی "زندہ درگور ہو جانا یا چار دیواری میں مقید رہنا" اگر لیئے جائیں تو سب سے پہلے میں اسکا مخالف ہوں؛ لیکن نہایت آزادی کے ساتھ اس کو ملیامیٹ کر ڈالنا بھی خود اپنی تمام خوبیوں کی جڑ آپ ہی کاٹنا ہے! قوانین کی ضرورت عملی زندگی کے مشاہدے اور روزمرہ کے تجربوں سے ثابت ہوتی ہے، تو پردہ کی خوبیاں ہندوستان اور یورپ کی موجودہ حالت اور حالات کا موازنہ کرنے سے اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں!!

کیا صرف تحریر اور تقریر میں "مائی ڈیر ہسبنڈ"۔ میرے پیارے شوہر لکھنا اور بولنا، اور در اصل شوہر سے سچی محبت یا اُس کی قدر و عزت اتنی بھی نہ کرنا جتنی ہندوستان کی ایک بے پرداہ بیوی کرتی ہے کچھ لیاقت کی بات ہے؟ کیا

زبان کو جھوٹی محبت بھرے الفاظ کا۔ صرف کانوں کو بھلے معلوم ہونے والے الفاظ کا عادی بنانا تہذیب ہے؟ کیا پوڈر اور پوشاک سے نت نئی رنگتیں بدلکر نوجوان طبیعتوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرنا عقلمند اور ترقی یافتہ ہونیکا ثبوت ہے؟ کیا مردوں کے سامنے دل لبھانے والی ادائیں۔ بناوٹی تبسم، جھوٹا بھولاپن، اور خواہ مخواہ کی نزاکت۔ پیدا کرنا خوش خلق ہونے کی دلیل ہے؟ کیا سینیوں مداح حسن اور سینکڑوں کشتہ ادا پیدا کرنا حسین ہونے کی پہچان ہے؟ کیا بازار میں نیچی نگاہ کیئے، متانت کا چہرہ بنائے چلنا، اور جلسوں اور ناچ وغیرہ میں تقریباً نیم برہنہ ہوکر جلوہ افروز ہونا حیا و شرم کا تقاضا ہے؟ کیا اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر شوہر سے اور ہزاروں مردوں کے سامنے بلاتکلف رخصتی بوسہ عنایت فرمانا ہی سچی محبت کی علامت ہے؟ اگر یہ ہی وہ باتیں ہیں جن پر ہمارا ملک دلدادہ ہے تو بسم اللہ۔ "یہ ناؤ آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی"۔ اور اگر ان حرکات کو برا سمجھا جائے تو میں کہونگا، ضرور کہونگا، اور ڈنکے کی چوٹ کہونگا۔ کہ جس چیز نے یہ رکیک اور نازیبا حرکت یورپ میں حد سے زیادہ بڑھادیں وہ بے پردگی ہے اور جس نے بفضلہ اب تک ہم کو اس ناپاک اثر سے محفوظ رکھا جس پر ہمیں فخر ہے اور رہے گا۔ وہ پردہ ہے اور محض پردہ ہی!

رہی یہ صورت کہ پردہ اٹھایا جائے اور آزادی نہ دی جائے میرے خیال میں یہ امید بالکل ایسی ہے کہ بیوٹس میں دیا سلائی دکھائی جائے اور امید رکھی جائے کہ وہ آدہا جلیگا اور آدھا بچ جائیگا! کسی راہ پر طبقہ نسواں کو ڈالدینا اور پھر کچھ آگے جا کر بڑھنے سے روکنا، ناممکن! ترقی کی رفتار پھر کسی روحانی قوت کے بس کی بھی نہیں؛ وہ بڑھے گی، تیزی سے ساتھ بڑھے گی، تمام مدارج کو طے کرکے اس حد تک پونہچے گی اور پونہچ کر رہے گی، جہاں یورپ کی بےپردہ اقوام اسوقت ہیں! بے پردگی کی وبا نے عالمگیر یورپ میں رفتہ رفتہ ہی اس

حالت ناممکن العلاج تک پونہچی ہے جہاں اب ہم اُسکو دیکھتے ہیں!! اور خدانخواستہ اگر جدت طبع،" اور کل جدید لذیذ"، کی ہوا اسی زور و شور کے ساتھہ رہی تو اس طوفان ناعاقبت اندیشی کے ہاتھوں آنے والی نسلیں انجمنوں اور سوسائٹیوں کے پردے میں اور ٹینس اور باڈمنٹن کی آڑ میں ایسی کھل کھیلیں گے کہ سننے والے دانتوں میں انگلیاں دے لیں تو سہی!!

تعلیم نسواں کے خلاف ہونا عقل کی آنکھوں سے اندہا ہونیکی دلیل ہے! لیکن تعلیم اور پردے میں آگ اور پانی کا بیر تو نہیں! پردہ کے سایۂ عاطفت میں رہکر تعلیم کے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور سے آراستہ ہونا، ممکن تو کیا مشکل بھی نہیں! خانہ داری کی زندگی ہزار طرح سے روشن و منور ہوسکتی ہے۔ اور ترقی کے مدارج پردے کی اتالیقی میں تعلیم حاصل کرنے سے طے ہوسکتے ہیں!! پردہ کی ناجائز اور جابرانہ سختی واقعی خلاف انسانیت ہے، اور خواہ مخواہ کی بدظنی اور بیہودہ شک اوّل درجہ کی حماقت ہے! میرے خیال میں۔ شوہر یا بزرگوں کی اجازت سے کسی کے ہاں ملنے جانا۔ "الصّٰلِحٰتُ حٰفِظٰتٌ قٰنِتٰتٌ لِلْغَیْبِ" کا خیال رکھہ کر جانا۔ کوئی عیب نہیں، اور عجائبات دنیا کو اپنے شوہر یا بزرگوں کے ہمراہ دیکھنا۔ خود اپنے چہرے یا جسم کو کسی غیر محرم کو دکھائے بغیر دیکھنا۔ چنداں ہرج نہیں! مگر پیاری بہن! اسقدر آزادی بھی اسیوقت اچھی ہوگی جب کہ کوئی نگراں ہو۔ خفا نہ ہوجانا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ خدانخواستہ تمھاری طرف سے طبقۂ نسواں کیطرف سے بدگمانی ہے! نہیں بلکہ، اُن زہریلی نگاہوں اور اُن متعدی امراض جیسا اثر رکھنے والے الفاظ سے بچانا مقصود ہے۔ جو زہر سے زیادہ برا اور وبا سے زیادہ خراب اثر رکھتے ہیں!!

اگر میری ذاتی رائے پوچھو، تو۔ عورت ایک ناقابل تشبیہ دُر آبدار۔ خدا سی

بے احتیاطی سے میلا ہو جانے والا موتی: یا ایک دلاویز غنچہ عفت وحیا تھوڑی سی تمازت سے کھل جانیوالا پھول ہے!! یہ موتی ہمارے تاج میں رہنے کے قابل، اور یہ پھول ہمارے زیب سینہ ہونے کے لائق: لیکن موتی کو موتی اور پھول کو پھول سمجھ کر رکھنا ہی ہمارا فرض ہے! اگر خدانخواستہ اس موتی کی آب وتاب میں یا رنگ وبو میں فرق آجائے۔ خود ہماری غفلت اور غلط فہمی کیوجہ سے فرق آجائے، تو ہم۔ جو اُس کی حفاظت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ اس بے عنوانی کا کیا جواب دیسکتے ہیں؟ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ملک نے پردہ دور کرکے۔ جہاں جہاں ایسا ہوا ہے۔ کوئی اچھی مثال پیش نہیں کی! "پہلی بسم اللہ ہی غلط" کی تعداد پرتو۔ جس میں ہر قسم کی گنجائش اور آسانی کیوجہ سے خوبی ہی خوبی کی امید ہے۔ یہ حالت ہے اگر زیادتی ہوئی تو بس خدا ہی مالک ہے! مجھے افسوس اور سخت افسوس ہے کہ میری آنکھوں اور میرے کانوں نے۔ بے پردگی کی تصویریں اور آزادی کی خبریں شرمناک ہی دیکھیں اور افسوسناک ہی سنیں!! بہت ممکن ہے کہ یہ میری کمیٔ علم کا قصور ہو! بہر حال، میں تو یہی دعا کرونگا کہ خدا انہیں نگاہ بد اور صحبتِ بد دونوں سے بچائے اور عقل سلیم اور دماغ صحیح عطا فرمائے! آمین!!

میں ہوں تمھارا خیر اندیش بھائی

سلطان حیدر جوش!

علیگ

شعر

اب تو یوں ہمسے کوئی اہلِ سخن ملتا ہے
جیسے غربت میں کوئی اہلِ وطن ملتا ہے (نیرنگ)

حبیب ابن مظاہر

از سید الشعرا خان بہادر مولانا شاد صاحب

دوستی چیز ہے کیا لذت نفسانی ہے
جسم سے گر متعلق ہو تو جسمانی ہے

روح پر محض اثر ہو تو وہ روحانی ہے
دین سے ہو اسکا تعلق تو وہ ایمانی ہے

ہے یہ واجب کہ بشر سب کے مدارج سمجھے
یہ محاسن نہوں جسمیں اسے خارج سمجھے

اے خوشا وہ کہ اس اخلاق کا جو بانی ہو
جملہ اوصاف میں اس چیز کے لاثانی ہو

شیفتہ دل تو زباں محو ثنا خوانی ہو
حب نفسانی و روحانی و ایمانی ہو

یوں تو ٹلنے کے لیے کوہ گراں بار ٹلے
دوست وہ ہے جو کسی حال نہ زنہار ٹلے

سچ ہے اسطرح کے ہیں دوست جہانمیں نایاب
فرد تھے آہیں حسین ابن علی کے احباب

اس محبت کا بھلا ہی کہیں دنیا میں جواب؟
پہلے ہم صدقہ ہوں اس فکر میں سب تھے بیتاب

ذکر اب دوستی باطن و ظاہر کا سنو
غور سے حال حبیب ابن مظاہر کا سنو

آب زر سے جسے لکھیں وہ بیاں کس کا ہے؟
سائباں جسکا فلک ہو وہ مکاں کس کا ہے؟

نور عرفاں کیطرح وصف عیاں کس کا ہے؟
مدح گو کس کا ہے دل مرتبہ دان کس کا ہے؟

مہبط نور خدا ظاہر و باطن کس کا؟
نام نامی ہے حبیب ابن مظاہر کس کا؟

عہد طفلی سے بنایا تھا انہیں حق نے سعید
ان کے اخلاق اسیوقت سے تھے لائق دید

جتنی خوبی تھی ہوئی آ کے جوانی میں مزید
ہوئی پیری یہ مبارک کہ ہوئے آپ شہید

رشتہ محکم ہوا خالق کے ولی سے انکا
مل گیا خون حسین ابن علی سے ان کا

حق پسند اہل کرم عاشق دیں اہل سخا
خلق باتوں سے عیاں طینت و فطرت میں وفا

دل میں بچپن سے بھری اہل پیمبر کی ولا
اہل حاجت کا لحاظ اہل ضرورت سے حیا

آبرو قوم کی فخر و بجا سے کوفہ
شرف موطن و آس پاس اثر دسلسے کوفہ

مسز اور مس الیٹ

کسی ملک یا قوم کے واسطے اس سے زیادہ اور کیا افسوس کا وقت ہوگا کہ غیر بھی اسکی حالت پر آنسو بہائیں ولایت کے ایک مشہور اخبار ڈیلی کرانیکل کے ایک نامہ نگار نے اپنے زمانہ سیاحت ہندوستان میں ہمارے موجودہ تمدّن پر ۹ مارچ کے پرچہ میں اس عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ کرانیکل کے نامہ نگار پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اسنے چند بڑھیوں ٹھریوں یا باہر کی پھرنے والی گنواریوں کو دیکھکر یہ نتیجہ نکال لیا کہ تمام ہندوستان اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مگر اعتراض کس منہ سے؟ جن عالیشان محلسراؤں اور پردہ دار حویلیوں میں کرانیکل کے نامہ نگار کا گذر بھی نہیں ہوسکتا تھا وہاں کی حالت ہم جانتے ہیں اور بآواز بلند کہتے ہیں کہ باستثنار چند عام طور پر ان گھروں کی حالت بھی قریب قریب ایسی ہی ہے البتہ ہم قابل نامہ نگار سے اتنا ضرور کہیں گے کہ عورتوں کے حقوق کا غصب کر لینا ہمارا ذاتی فعل ہے ورنہ عیسائیت سے بہت زیادہ اسلام نے عورت کے جائز حقوق کی حمایت کی ہے۔

کرانیکل کا نامہ نگار اس مضمون کے لکھنے میں اگر اتنا اور ملحوظ رکھتا کہ ہندوستانی عورت کے حسن کا جزو اعظم شرم وحیا ہے تو یہ مضمون بہت زیادہ وقعت کے قابل ہوتا۔ گو اب بھی ان دو تین باتوں سے قطع نظر کرکے ہماری حالت زار کی یہ سچی تصویر ہے۔

ہم اس مضمون کا ترجمہ شائع کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ملک اور

قوم دونوں کو یہہ دیکھکر افسوس ہوگا کہ ہماری خود غرضی اور نفس پروری نے ہماری کیا حالت کر دی +

کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ جس گھر میں عورت کی عزت ہوتی ہے وہاں خدا بھی مہربان ہوتا ہے۔

ہندوستان کی سیر کرنے والا اپنے سفر میں اس مقولہ کو ہر قدم پر یاد کرے گا وہ خواہ شہر میں آرام کر رہا ہو یا ریل کی کھڑکیوں میں سے کھیتوں کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے دل میں سب سے پہلے یہی خیال پیدا ہوگا۔ کیونکہ وہ اس مقولہ کی صداقت کا پتہ ہر جگہ سے پائے گا اور دیکھے گا کہ ہندوستان میں عورتیں کیسی حقیر ہیں اور انکی عزت جوتی کے برابر بھی نہیں ہے جوں جوں وہ لوگوں کے حالات کا زیادہ مطالعہ کرے گا وہ دیکھیگا کہ اس شاداب زمین پر کچھہ قدرت کی ناخوشی ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ ہندوستان خوبصورت ہے مگر مغموم اسمیں چمک دمک ہے مگر جذبات مفقود ہیں ہندوستان میں جس عورت کی عزت کی جاتی ہے وہ صرف گائے ہے مرد بادشاہ ہے لڑکا ولیعہد اور عورت انکی غلام وہ دنیا میں اس غرض سے نہیں آئی ہے کہ زندگی کی خوشیوں اور رنجوں میں شریک ہو بلکہ اپنے آقا کی وحشیانہ خدمات انجام دینے کے واسطے۔ اسکا فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کا کھانا پکائے مگر خود ہرگز نہ کھائے۔ جب تک کہ اسکا آقا اور آقا کے لڑکے نہ کھالیں وہ اس کے ساتھ گاؤں میں جائے مگر اس کے برابر ہرگز نہ چلے وہ شہر بوجھ ڈھوئے مگر اسکا ہاتھ ہرگز نہ پکڑے ایسی کوئی مثال کہ کسی مرد یا عورت کو ہشاش بشاش برابر کی حیثیت سے سڑک پر پھرتے ہوئے دیکھا ہو میری نظر سے نہیں گذری ایسی کوئی مثال کہ تمام خاندان ایک دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہو۔ میں نے چار ہزار میل کے سفر میں کبھی نہ دیکھی اور جو ہندوستان سے

واقف ہے یہی کہے گا کہ میری آنکھیں ایسا سماں کبھی نہ دیکھیں گی۔ ہاں میں نے سخت گرمی میں دوپہر کے وقت جلتی ہوئی دہوپ میں عورتوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا میں نے انکو کھیتوں میں اناج کاٹتے ہوئے اور شہروں میں سڑک کوٹتے ہوئے بارہا دیکھا میں نے انکو صبح کے وقت سر پر بوجھ رکھے ہوئے اونٹوں کی قطار کی طرح نکلتے ہوئے اکثر دیکھا او میں نے ہر ضعیف عورت کی آنکھ میں جسکو میں نے دیکھا تکلیف افلاس اور رنج کے آثار پائے تمام ملک میں ایک بڑھیا کو خوش نہ دیکھا ہندوستان کی اشیا میں سے سب سے زیادہ مغموم چیز عورت کا بڑھاپا ہے۔ جہاں وہ چالیس برس کی عمر میں بڑھیا سمجھی جانے لگتی ہے یورپ میں ہر شخص اس عمر کی عورتوں کو نہایت خوش اپنے زندگی سے مطمئن دیکھے گا۔ اور ایک ایسی قسم کی تمکنت پائے گا جسکی لڑکپن اور جوانی دونو عزت کریں گے لیکن ہندوستانی بڑھیا کی آنکھ کے واسطے کسی شارح یا مترجم کی ضرورت نہیں ہے اسکی آنکھ خود ہی یہ کہے گی کہ میں کیسی بدنصیب ہوں اب تک اس سخت دنیا میں زندہ ہوں میں اب تک اس گرم سورج میں رینگنے کو موجود ہوں اور اب تک مرد کی بے التفاتی دیکھنے کے لیے زندہ ہوں افسوس ہے اس عورت پر جس کے بال سفید ہو گئے جس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئیں اور اسکو زندگی کا یہ نتیجہ ملا۔ اس بدنصیب بڑھیا عورت کی طرف دیکھو جس کے ہاتھ پاؤں خاک میں اٹ رہے ہیں کپڑے پھٹ گئے ہیں اور بدن کی ہڈیاں دکھلائی دے رہی ہیں اسکی آنکھوں میں پانی ہے اس کے اعضا میں درد ہے اور سفید بال کانوں سے لپٹے ہوئے ہیں اسنے تمام دن اپنا فرض انجام دیا ہے لیکن اس وقت اس کی کیا وقعت ہوگی کوئی بچہ مؤدبانہ اسکی طرف نہ دوڑے گا اور نہ کوئی عزیز اس کے تفکرات میں مددگار ہوگا۔ یہ شام کے وقت لیٹ جائیگی اور اسکے تفکرات اسکے ساتھ ہونگے

ہندوستان میں عورت کی تقدیر کا یہ حشر ہے کہ شاید عالم شیر خوارگی میں وہ فضائے آسمانی کو دیکھکر خوش ہولیتی ہو۔ یا ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کا لطف اُٹھالیتی ہو۔ لیکن جب وہ ماں کی گود سے اتر کر چلنے کے قابل ہوئی تو وہ وقت آجاتا ہے۔ جب ہندوستان کا تمدن بیٹے اور بیٹیوں میں ایکقسم کی تفریق کردے اور اسوقت گویہ بیٹیاں تو اپنی ماں باپوں کی ہوتی ہیں۔ جنکے بیٹے مگر زیادہ تر یہ بہن ہونے کی حیثیت سے بھائیوں کا کھلونا ہوتی ہیں اور اسوقت سے بیوی ہونے تک انکو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ انکا درجہ بنی نوع انسان میں نہایت کم ہے ماں ہوجانا کبھی کسی عورت کے واسطے کوئی برکت نہیں ہے اور نہ اسکی محنت میں کمی کرسکتا ہے۔ وہ ملازم ہے مگر بلا تنخواہ اور ایسی ملازم کہ اسکو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اس نوکری کو چھوڑ کر دوسری نوکری کرے۔ اس کے سامنے دوامی غلامی ہے اور اگر قدرت اسسے اتنی ناخوش ہے کہ وہ بڑھاپے تک زندہ رہے گی تو اسکا نوشتۂ تقدیر مایوسی رنج والم اور تفکرات کا ساتھ ہے میں نے عورت پر افسوس کے معنی اسوقت تک نہ سمجھے جب تک کہ مینے ایشیائی آسمان کے نیچے عورت کو نہ دیکھا۔

طبقۂ اعلیٰ میں عورتوں کی حالت گو ایسی نہو مگر وہ بھی اپنے شوہروں کی قیدیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں گو وہ کھانا پکانے یا شوہر کی خدمت کے سوا کوئی خاص محنت نہیں کرتیں لیکن وہ دنیوی خوشیوں سے بالکل اسیطرح محروم کردی گئیں جسطرح گرجا کی ننیں انکو بعض حالتوں میں تو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ شوہروں کے مرد رشتہ دار کون کون ہیں وہ ان جانوروں سے جو کھلاڑیاں کرنے کے واسطے پنجروں میں قید کیے جاتے ہیں کچھ ہی زیادہ وقعت رکھتی ہیں۔

یہ ہے عورتوں کے ساتھ پیش آنے کا طریقہ جو مردوں نے اختیار کر رکھا ہے اور یہ ہے وہ طریقہ جس کے ساتھ ہندوستان گرتا پڑتا ترقی کر رہا ہے جب عیسائیت نے عورت کو مرد کا محبوب ساتھی بنا دیا تو یورپ نے تہذیب کو جگایا اور لفظ ماں کو انسانیت نے اعلیٰ مدارج عطا کروا دیئے۔ یقیناً مشرق مغرب کی طرح اسوقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک عورت کی عزت نہ کرے اور جب تک کہ مشرقی مرد کے دلمیں عورت کی واقعی عزت ہو اور وہ اسکی وقعت کو پہچانے۔ اسوقت تین ملک ہیں جہاں عورت کی عزت کیجا رہی ہے اور جہاں ماں کی اتنی عزت کی جا رہی ہے جتنی کسی حکم مذہب کی۔ جرمن امریکہ اور برطانیہ کلاں +

کیا ترقی کرے گا وہ ملک اور وہ قوم جسکی مائیں قیدی کیطرح زندگی بسر کر رہی ہوں خوش نصیب ہے وہ قوم جسمیں بہت سے خوش گھر ہوں اور روزمرہ زندگی اطمینان سے بسر ہو رہی ہو اور جہاں عورت کی واقعی عزت ہو اور جہاں ماں ہونا قدرت کی ایک بڑی نعمت سمجھی جائے۔

لیکن جہاں عورت غلام ہے یا جہاں وہ بالکل ایک کھلونا ہے وہاں خوشی یا پورا اطمینان کبھی نصیب نہ ہوگا۔ نظام قدرت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انسانی ترقی صرف ماؤں کے ہاتھ میں ہے +

ترجمہ

حسن و تخیل

یہ دونو تصویریں جو زیب ورق اول ہیں ایک انگریزی تصویر کی صناعی کا نمونہ ہیں جسمیں مختلف کیفیت انسانی کا اظہار ہے۔ کائنات کی بہترین شے انسان کے مطالعہ کا یہ پہلا سبق ہے کہ کسطرح واقعات زندگی سے قبلیت متاثر ہو کر حالت ظاہری میں تغیر پیدا کر دیتا ہے پہلی تصویر جو حسن کے نام سے پیش کیگئی ہے ایکخاص ملک اور قوم کا مذاق ہے لیکن یہی عورت جو اسوقت کسی خاص کیفیت میں مصروف یا حالت سے متاثر نہیں ہے تخیل میں گھر کر ایک اور ہی صورت میں نظر آ رہی ہے امید ہے کہ قابل مصور کا یہ سلسلہ جسمیں تخیل مطالعہ خوشی محبت امید کی وہ تصویریں ہیں جو انسانی تمدن کا جزو لاینفک ہے وقعت سے دیکھا جائیگا +

عصرِ جدید

وہ پچھلے دور بدلے اور وہ اندازِ جہاں بدلا
ورق الٹا زمانہ کا طریقِ آسماں بدلا

طبیعت میں زمانے کی تغیر ہوگیا پیدا
زمیں بدلی فلک بدلا مکیں بدلے مکاں بدلا

سند بدلی فضیلت کی ہوئیں اب ڈگریاں قائم
نئے اسکول نکلے اور وہ طرزِ امتحاں بدلا

نیا طرزِ تمدن ہے نئی باتیں ہیں دنیا کی
نئی لفظیں[۱] ہوئیں ایجاد اندازِ زباں بدلا

نئی صورت سے اب ہونے لگی میت کی آرائش
نیا ماتم ہوا ایجاد طرزِ نوحہ خواں بدلا

طلائی ہیکلیں ہیں اور نہ وہ منت کے طوق آتے ہیں
وہ وضعِ مشرقی بدلی وہ اندازِ بتاں بدلا

نئی تہذیب ہے اخلاقِ نو کا دور دورہ ہے
وہ طبعِ میزباں بدلی مزاجِ میہماں بدلا

نہ وہ شوخی نہ وہ سیرت نہ وہ اگلی سی آرائش
وہ شانِ حسن بدلی اور مزاجِ گلرخاں بدلا

کمی ہو جائیگی اب تو تمھاری جوشِ سودا میں
مبارک ہو کہ رنگِ گیسوئے عنبر فشاں بدلا

حقیقت کو تری حدِ نظر دنیا سمجھتی ہے۔
مرے نالے بھلا کیا تجھ سے لینگے آسماں بدلا

عزیز اب مجلسِ گیتی سے ہو کیا خاک دلچسپی
وہ اگلی صحبتیں بدلیں وہ دنیا کا سماں بدلا

میرزا محمد ہادی عزیز

رُباعی

نالے سے میرے کسکو نہ کچھ جوش ہوا
نغمہ میرا کس کا نہ درگوش ہوا

تھی آہ میں میری بیخودی کچھ ایسی
جسنے اسے سن لیا وہ بیہوش ہوا

ابو المعانی آزاد دہلوی

---

[۱] دلی والے لفظ کو مذکر کہتے ہیں اور جمع نہیں استعمال کرتے +

ہر زمانے کے مؤرخ

(اُنکی فروگذاشت۔ اور روایتی تمثیلوں سے اس امر کا ثبوت)

چونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کو مختلف الطبائع پیدا کیا ہے پس اگر وہ مختلف الارائے بھی ہو تو یہ اُس کا قصور نہیں*

جسوقت کوئی مؤرخ تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو گو اُس کا ارادہ یہی ہوتا ہے کہ میں اپنے زمانہ کے تمام واقعات صحیح صحیح قلمبند کر دونگا۔ اور جہانتک بنے گا ادنے سے ادنے واقع کو بھی نہیں چھوڑونگا۔ مگر اُس کی طبیعت کا رجحان۔ اُس کے دل کا میلان اُسے اس ارادے میں پورا نہیں اترنے دیتا۔

کوئی مؤرخ صرف بڑے بڑے واقعات کو لیتا ہے۔ کوئی تمدنی حالات پر گرتا ہے کوئی اخلاقی اوصاف پر جھکتا ہے۔ کوئی عقائد پر زور دیتا ہے۔ کوئی مذہبی امور پر بحث کرتا ہے۔ کوئی صرف انتظام کو لیتا ہے۔ کوئی فقط انصاف کی داد دیتا ہے۔ کوئی بادشاہِ وقت کے ذاتی واقعات پر جھک پڑتا ہے لیکن ایسی باتوں کو کوئی مورخ نہیں لیتا جن سے اُس کی تاریخ آسمانی کتاب سمجھی جائے اور آیندہ نسلوں کے واسطے عبرت ونصائح کا مجموعہ بنجائے۔ کیونکہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور فطرت کیا ہے ایک صحیفۂ قدرت ہے۔

مورخ وہی ہے جو بے لاگ ہر ایک بات پر غائر نظر ڈالتا چلا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادشاہِ وقت کا ڈر۔ خوف۔ رعب۔ اُسے تختِ موجودہ کے برخلاف لکھنے سے روکتا ہے۔ مگر جن کو خدا تعالیٰ نے خاص ایسے کاموں کا مادہ دیا ہے وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھ ہی جاتے ہیں۔ خافی خاں نے خفیہ نویسی میں نام

پایا اور باوجودِ ممانعتِ شاہی خفیہ خفیہ تاریخ لکھ ڈالی۔ نعمت خاں عالی بھی اپنی فطرت سے باز نہ آیا۔ یہ دونوں عالمگیری مورخ ہیں۔ مگر انہوں نے بھی بعض باتوں کو اور نے بعض کو فضول و بیکار سمجھ کر چھوڑ ہی دیا۔ بلکہ اور زمانوں میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ عوام الناس کے حالات اور واقعات کو سب نے قلم انداز کر دیا ہی جس بات کی دُھن باندھی ہے۔ اُسی پر زور دیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی باوجودیکہ اکبر کا امام اور ابتدائی زمانہ میں اس کا یہانتک مدّاح تھا کہ تاریخ کشمیر کے دیباچہ کو اُسکی خیر خواہی اور مدح سرائی سے بھر دیا مگر اخیر کو جو دشمنی پر کمر باندھی تو دہریہ لامذہب اور خدا جانے کیا کیا لکھ گیا۔ اپنی تاریخ میں فتوحات کی تفصیل تو چھوڑ دی مگر ذاتیات اور اندرونی راز یا مخالفول کی خبر لینے پر اُتر آیا۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہی باتیں لکھیں جن سے اکبر کی بُرائی اور اُس کا دہریہ پن ثابت ہو۔ عبدالقادر پر یہ بڑا بھاری الزام ہے کہ اس نے ضروری واقعات کو قلم انداز کر دیا ہے۔

تاریخ تیموریہ کا ایک دمشقی ہمعصر مصنف ابن شہاب انصاری جو اُس کی برائیوں پر گرا تو واقعات و فتوحات عراق و عرب کو سرتاسر ظلم اور تیمور کو اپنے نزدیک غاصب و ظالم اور بددین ثابت کرکے رہا لیکن زمانہ ایک عجیب اور سچا واقع نگار ہے۔ یہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ جو کچھ لکھا پڑھا جائے وہی تو درست ہو اور قائم و برقرار رہ جائے۔ باقی حالات دب کر زمین کا پیوند ہو جائیں۔ وہ مورخوں کا کام زبانی روایتوں۔ اُسوقت کی نظموں۔ اُسوقت کے گیتوں۔ اُس وقت کی زبان۔ اُس وقت کے دوہوں۔ اُس وقت کے مذاق۔ اُس وقت کے خیالات اور ضرب الامثال سے لے ہی لیتا ہے کرشن جی کی بہت سی لیلائیں کتابوں یا تاریخوں میں نہیں پائی جاتیں مگر اُن کی صداقت اُس زمانہ کا برتاؤ۔ اُس زمانہ کا رسم و رواج اور مذاق برابر

کر رہا ہے سینکڑوں باتیں نہایت سچی اور ایسی ہیں کہ وہ سینہ بسینہ یا خاندان خاندان چلی آتی ہیں +

کوئی نہیں جانتا کہ بابر و ہمایوں کے رفیق۔ اکبر خاں بابا اور اتالیق بلکہ سپہ سالار جان نثار دلی خیر خواہ بہرام خاں کا مزار کہاں ہے۔ مآثر الامرا۔ تاریخ بدایونی سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی بغاوت سے پشیمان ہو کر بادشاہ سے معافی حاصل کی بادشاہ نے اُسے اختیار دیا کہ چاہے چندیری کی جاگیر لے کر وہاں راج کرے چاہے میری مصاحبت میں رہے۔ چاہے بیت اللہ کے حج کو چلا جائے مگر اُس نے تارک الدنیا ہونا اور زیارت متبرکہ و کعبہ کو جانا پسند کیا۔ حاجی محمد خاں سیستانی جو بہرام خاں کا جانی دوست تھا حسبِ ارشادِ بادشاہِ جم جاہ حفاظت جان و مال اور آسائش راہ کیواسطے مع فوج اُسکے ہمراہ ہوا۔ بخیریت گجرات پہنچا حاکم گجرات موسیٰ خاں فولادی نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ لیکن کینہ توز مبارک خاں لوہانی ملاقات کے بہانے سے بہرام خاں کے پاس آیا۔ جونہیں مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا۔ کم بخت نے ایسا خنجر مارا کہ سینہ کے پار ہو گیا۔ ایک اور ظالم نے سر پر تلوار کا وار کر کے رہا سہا کام تمام کر دیا۔ باعثِ دشمنی یہ بتایا کہ ماچھی واڑے کی لڑائی میں ہمارا باپ اسکی سپہ سالاری کے وقت میں مارا گیا تھا جسکا وہ بدلہ لیا ہے۔ لیکن اس زمانہ کے واقعات ماہم انگہ اور اسکے بیٹے شمس الدین کوکہ کی سازش کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ "شہید شد محمد بہرام" تاریخ نکلی ۹۶۳ سرِ دست اس شہید بے گناہ کی نعش شیخ حسام الدین کے مقبرے میں سونپی گئی اور بعد میں دہلی آئی لیکن یہ کوئی نہیں لکھتا کہ دہلی میں آکر کس جگہ دفن ہوئی۔ البتہ اتنا سراغ اور چلتا ہے کہ حسین قلی خاں جہاں ۹۸۵ھ میں یہاں سے مشہد لے گئے۔ مگر اس زمانہ کی سینہ بسینہ روایتیں۔ پٹواریوں کی کھوٹ یا کھتونی اور بندوبست کی لال کتاب

نیز مالکانِ زمین کا قبضہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ نعش وہاں سے لاکر اُس کے آقائے قدیم ہمایوں بادشاہ کے قرب و جوار اور اُن کے محسن عیسیٰ خاں حجاب شیر شاہی و سلیم شاہی سپہ سالار کے مقبرے کے جانب غروب صرف ایک دیوار بیچ فاصلہ پر رکھی گئی جسکا ٹوٹا پھوٹا چبوترہ اب تک موجود ہے اور اُس سرزمین کا نام بھی اسی وجہ سے بیرم[۵] ہے۔ جس زمانہ میں شیر شاہ نے بیرم خاں کو گرفتار کر لیا تھا تو عبدالوہاب رئیس سنبھل نے عیسیٰ خاں کو بیچ میں ڈال کر ان کی جان بخشی کرائی تھی۔ اس کے علاوہ ہمایوں بادشاہ کی ملکہ نواب حمیدہ بانو مریم مکانی کی قبر بھی ہمایوں کے برج میں ہی واقع ہے جنھیں بہرام خاں کی وفاداریوں اور جانفشانیوں کے سبب اُس کی زندگی میں اسکی بہت بڑی قدر رہی۔ پس ان وجوہ سے اُسکا یہاں دفن ہونا قابل وثوق ہے۔ جس زمین کا نام بیرم ہے وہ اب تک عرب سرائے کے عربوں باعبود قبیلہ کے قبضہ میں ہے۔ یہ عرب وہی ہیں جن کو نواب حمیدہ بانو بیگم معروف بہ نواب حاجی بیگم صاحبہ والدہ جلال الدین اکبر نے اپنے پیارے خاوند ہمایوں بادشاہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے واسطے عرب جا کر حضر موت واقع صوبہ یمن کے زہاد و عبّاد کو باجازت سلطان روم ۱۴ سنہ جلوس اکبری مطابق ۹۷۹ھ ہجری میں ساتھ لائیں اور ہمایوں کے مدفن کے پاس بسا کر اُسجگہ کا نام عرب سرائے رکھا۔ وہیں ۹۶۹ھ ہجری میں ہمایوں کا مقبرہ بنا۔ ان میں سقاف۔ باعبود۔ باکثیر۔ باحسن جمل اللیل۔ باطہ۔ بالتوربالشداو نیز قبیلوں کے عرب تھے جن کی یادگار مولوی سیّد عبداللہ صاحب بالفقیہ ہمارے ماموں مع شجرہ

---

[۵] بیرم ترکی زبان میں عید جشن کے معنی میں آتا ہے۔ اور اسی وجہ سے بہرام خاں نے اپنا تخلص بھی بیرم رکھا تھا۔ اس مناسبت سے بیرم ایک اچھا اور بامعنی لفظ قایم رہا۔ غالباً اُسی زمانہ میں یہ نام پڑا۔ اور صحت کے ساتھ پڑا +

قدیم جو اُن کے ہمراہ آیا تھا ابتک زندہ و سلامت مستغرق الی اللہ موجود ہیں +

عبدالرحیم خان خاناں بیرام خاں کے خلف الصدق کا مقبرہ بھی جانب جنوب کوئی دو تیر کے فاصلہ پر اتنک قایم اور اوسکی تمام زمین خان خاناں کے نام سے موسوم ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جو ہم کو اس قبر کا نشان بتایا وہ بالکل درست ہی جس موضع کے یہ زمین متعلق ہے اُس کا نام غیاث پورہ ہے یہ عجیب بات ہے کہ جسطرح حیات میں عیسےٰ خاں نے انکا ساتھ دیا تھا اسیطرح بیرام خاں ممات میں بھی اس احسان کے شکریہ میں اُنہیں کے زیر سایہ آکر آسودہ ہوئے عیسے خاں کے کوٹلہ کی دیوار کے پیچھے ہی جو احاطۂ مقبرہ کی چار دیواری ہے وہیں بیرم خاں کا مدفن واقع ہے +

اسی ضمن میں ایک اور مشہور روایت ملاحظہ فرمایئے جسکا تاریخوں میں ذکر نہیں۔ مگر بالکل ٹھیک اور واقعہ کے مطابق ہے فیضی نے ایک خواب گھڑا کہ اکبر بادشاہ کو پیغمبری ملی اور ایک جدید قرآن بھی نازل ہوا جو فلاں درخت کی کھو سے نکلے گا اور یہ شعر زبان پر لایا ؎

شکر صد شکر کہ خیرالبشرے پیدا شد　　　یک نبی رفت و بجایش دگرے پیدا شد

ان کے مخالف مُلّا عبدالقادر بدایونی کو بھی خبر لگی اور یہ شعر اُن کے کانوں تک پہنچا۔ چونکہ مُلّا اپنے مذہب کے پکے اور بڑے سکے تھے اُنہوں نے جھٹ اس شعر کے جواب میں دوسرا شعر کہہ مشہور کردیا ؎

حیف صد حیف کہ شرالبشرے پیدا شد　　　یعنی در دین نبی رخنہ گرے پیدا شد

چونکہ اس میں بادشاہ وقت کی سخت گستاخی تھی لوگوں نے دتبو دتبو کر دیا۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ زبانوں پر نہ سہی مگر دلوں میں۔ گھر وہیں یہ بات جڑ پکڑ گئی اور دینداروں نے بے نقط سنانی شروع کیں اور فیضی بھی

دم کو سے رہا اور اس بات کو گھٹنوں نہ چلنے دیا۔ البتہ تفسیر سواطع الالہام بے نقط لکھ کر اِس عتراض کو مٹا دیا اور جو کچھ قصور ہوا تھا اُسے دبا دیا۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے تو وہ روائتیں۔ حکایتیں یا کہاوتیں جو یکساں حالت میں باتیز خاص و عام ہوں کسی حالت میں بھی اپنا وثوق اور اعتبار گھٹانے کے قابل نہیں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قطب الدین ایبک وہی شخص ہے جس نے اسلامی حکومت کا ہند میں مستقل جھنڈا گاڑا مگر اُسکی سخاوت اور دان وتاری نے ہندوؤں تک کے دلوں کو تعصب سے آشنا ہونے دیا مسلمانوں نے اُسے لکھ بخش کا خطاب دیا تو ہندو لکھ داتا کہنے لگے۔ سخی کی بجائے پیر مانا گیا اور اُس کے نام کے چھنجے ہر ایک مُراد بر آنے کیواسطے قائم ہوئے چھنجے میں کیا ہوتا ہے؟ ڈھول بجتا ہے۔ پہلوان جمع ہوتے ہیں کُشتیاں لڑی جاتی ہیں اور لکھہ داتا کے نام کا چڑھاوا بطور انعام واکرام ان لوگوں کو دیا جاتا ہے اور تو اور ہمنے شملے کے ہندو پہاڑیوں تک میں لکھہ داتا کے نام کی چھنج کا تماشا دیکھا اور اُن کی اس خوش اعتقادی کو سراہا کہ چھ سَو برس کے قریب قطب الدین ایبک کو دنیا سے رخصت ہوئے گزر گئے مگر اُسکی داد و دہش ابتک اُس کے نام کو زندہ وسلامت ثابت کر رہی ہے۔ جلال الدین اکبر کے زمانے تک یہ بات تھی کہ جو شخص بہت بڑھ کی دریا دلی دکھاتا تو اُسے قطب الدین ثانی کہتے +

نواب عبد الرحیم خان خاناں کی فیاضیاں۔ رحم دلیاں۔ قدر دانیاں تو کتابوں میں بعض جگہہ دیکھی ہونگی مگر اُس کے وقت کی ضرب المثلیں جو اُس کے واقعات اور حالات کا سین پیش کر رہی ہیں ان پر مؤرخوں نے بہت کم نظر ڈالی ہے بعض باتوں کو خلافِ عقل بعض کو خوشامد بعض کو خلافِ تہذیب سمجھہ کر چھوڑ دیا۔ مگر یہ نہ جانا کہ دل کے بھیدی اُس راز کو حسنِ عقیدت سے ظاہر کیے

بغیر نہ رہیں گے چنانچہ ہم تمثیلاً چند حکایتیں جو تاریخوں میں شاذ و نادر پائی جائینگی اس جگہ نقل کرتے ہیں جس سے اُس زمانہ کی تاریخ میں جو کمی ہے وہ پوری ہو سکتی ہے بشرطیکہ کوئی مورخ ان روایتوں کو بہم پہنچا کر ایک جگہ جمع کرے۔ اِن سے اُس زمانہ کا رنگ ڈھنگ ہی معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ بادشاہ و اراکین سلطنت کی طبیعتیں۔ بدظنیوں کی سدِ راہ تھیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں جو بدگویوں چغل خوروں بدگمانوں فتنہ پردازوں کا ذرا شاہی دربار وں میں گزر نہیں ہونے دیتی تھیں۔

ایک مشہور مثل چلی آتی ہے کہ نواب خانخاناں جن کے کھانے میں **بطانہ**

جس سے خانخاناں کی شریف پروری اور انسانی ہمدردی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے جسطرح اگلے زمانے کے بادشاہ گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پھر کر رعایا کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ اسیطرح نواب خانخاناں۔ آفت زدہ مصیبت رسیدہ خاندانیوں کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بگڑی بات بنایا کرتا تھا۔ جہاں اُسے خبر لگی کہ فلاں محلہ میں فلاں شریف زادہ یا کوئی غریب زادہ نان شبینہ سے محتاج ہے یہ اُسی کی دعوت کر دیتا۔ زردے۔ پلاؤ۔ بریانی کی قابیں بھرواتا۔ اُن کے اندر مٹھیاں بھر بھر اپنے ہاتھ سے اشرفیاں رکھتا اور بے معلوم کرکے صرف کھانے کے بہانے سے بھیج دیتا۔ چونکہ **بطانہ** پگڑی کے نیچے کا وہ کپڑا ہوتا ہے جسے رکھکر اوپر سے پگڑی باندھا کرتے ہیں اسوجہ سے یہ لفظ مثل میں لایا گیا تھا لیکن لغت ناآشنا لوگوں نے اسے بتانا۔ یا بتلانا کر لیا +

ایک اور کہاوت ہے کہ "کماویں نواب خان خاناں۔ اُڑاویں میاں فہیم" فہیم انکا ایک دست گرفتہ لے پالک راجپوت زادہ تھا۔ جسے علمی و اخلاقی تعلیم دیکر خانخاناں نے اپنا دار و غہ بنا لیا تھا۔ میاں فہیم سا نمک حلال۔ وفادار تہجد گزار پکا مسلمان اور دیندار آدمی جس نے اپنے آقا پر اپنی جان تک نثار کر دی بہت کم سننے میں

آیا ہوگا فہیم کی قبر۔ خانخاناں کے گنبد کے جانب غرب ایک چھوٹے سے گنبد میں بنی ہوئی ہے۔ ہم بچپن میں گنوار دل تک سے سُنا کرتے تھے کہ فہیم کے گمٹ میں کوئی ہمارے لوارے گھیر کر بند کر گیا۔ کوئی کمہار کہتا ہوا آتا تھا کہ فہیم کے گمٹ کے پاس سے گدھے گھیر کر لایا ہوں۔ مورخ ماثر الامرا نے غلطی سے نیلا گنبد اُس کا مدفن لکھدیا ہے حالانکہ سر سیّد نے بھی آثار الصنادید میں نیلے گنبد کو فہیم کا مرقد قرار نہیں دیا صرف اِتنا لکھا کہ شاہی حجام کا گنبد مشہور کرتے ہیں ورنہ سیّد جیسا وسیع معلومات والا ضرور اسکو بھی اسیطرح جتاتا جسطرح دیگر مقامات اور مدفنوں کو کتبِ تواریخ سے ثابت کرتا چلا گیا ہے۔ چونکہ ہم نے وہاں پرورش پائی اور چپہ چپہ زمین پر ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے قدم پھرے۔ بڑے بوڑھوں کی زبان سے اُس مقبرے کے مدفنوں کا نام سُنا۔ بار بار وہاں جاکر کھیلے۔ لڑکوں کی پلٹنیں بناکر لڑے اور اُس برج میں چھپے ہم کیونکر یقین کریں کہ نیلا گنبد فہیم کا مدفن ہے۔ یہ صرف گھڑت ہے۔ اور کسی تاریخ سی نہ ثقات سے یہانتک کہ سر سیّد کی تحقیقات سے بھی اس نیلے گنبد کا پتا نہ چلا بھلا نیلا گنبد کہاں اور فہیم کا مقبرہ کہاں۔ یہ تو اپنے آقا کے احاطہ میں رکھا گیا اور آقا کی عنایت سے اُس شہیدِ وفا کا تابوت یہاں لایا گیا +

اس کہاوت نے میاں فہیم اور نواب خانخاناں کو آبِ حیات کا لطف دکھا رکھا ہے ہم اسے صحیح تاریخ نہ مانیں تو کس دلیل سے نہ مانیں فہیم کے ہاتھ سارا خرچ تھا۔ آقا کا حکم بے کم و کاست بجا لاتا۔ اُسے کریم الطبع۔ کریم النفس دیکھ کر آپ بھی سخی کہلانے کا وسیلہ ڈھونڈھتا۔ اور اپنی ذاتی آمدنی اپنے آقائے نامدار کی طرح خود بھی لُٹا دیتا تھا۔

خانخاناں کی فیاضی کے متعلق دو اور بھی عجیب حکایتیں مشہور ہیں جنہیں کسی مُورخ یا تذکرہ نویس نے بھی نہیں لکھا۔ مگر ہم گو خلافِ عقل ہی سہی اُنہیں لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اکثر باتیں جو فی زمانہ ہمیں خلافِ عقل اور ڈھکوسلا معلوم ہوتی ہیں

وہ اب محققوں کی نظروں میں ازروئے تجربہ صحیح ثابت ہوتی چلی جاتی ہیں۔ گرگٹ

ان حکایتوں میں ایک حکایت تو یہ ہے کہ کسی جوگی کا بالکا جے پور سے منہ میں گٹکا رکھ کر اڑتا اور جمنا جی سے جل لیجا کر اپنے گرو کو جا دیا کرتا تھا۔ شب کے وقت جو نواب خانخاناں کے محل کی چھت سے گزر ہوا۔ تو صاف ستھرا کسا کسایا پلنگ بچھا ہوا دیکھکر وہیں آرام کی ٹھیرائی۔ لیٹا ہی تھا کہ آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں خانخاناں اوپر آئے دیکھا کہ منہ سے گٹکا نکلا پڑا ہے اور ایک شخص جوگیا لباس پہنے پڑا سوتا ہے۔ انہوں نے وہ گٹکا تو اٹھا لیا اور آپ نیچے آکر دوسری جگہ سو رہے۔ دفعتہً جو بالکے جی کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نہ گٹکا ہے نہ اصلی مقام ہے۔ بہت سٹ پٹائے۔ خانخاناں نے اسے بلایا اور کہا جوگی جی گھبراتے کیوں ہو۔ اپنا گٹکا لو اور گرو جی کے پاس پہنچو۔ گٹکا ایک قسم کی طلسماتی گولی سیماب یا اسٹ دھات کی آمیزش سے بنائی جاتی اور اس میں ایسی برقی قوت پیدا کی جاتی تھی کہ جس کے زور سے آدمی قوت پرواز بہم پہنچا کر اڑجاتا تھا جس طرح اڑن کھٹولے کا پہلے یقین نہ آتا تھا اور اب ہوائی جہاز اور ہوائی پرواز نے اسے ثابت کر دیا۔ اسیطرح کوئی دن جاتا ہے کہ گٹکے کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ جس حالت میں ٹرمیے ایک پتلے سے تار کی قوت سے بڑا بھاری بوجھ لے کر دوڑتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ اسی طرح گٹکے میں بھی ایسی قوت پیدا کر دیجاتی ہو۔ بہرحال اس کی بھی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے جو شعرا تک نے مثالاً اپنے اشعار میں باندھا ہے۔ ذوق سے

جاں ہوائیں ہوئی اس خال کا بوسہ لیکر ذوق جیسے اڑجائے دہن میں کوئی گٹکا لیکر

لیا گر عشق نے منہ میں دل بیتاب کا گٹکا انشا تو جوگی جی دھرا رہجائیگا سیماب کا گٹکا

علےٰ ہذا۔ عروس نوازی۔ جسکا قصہ اسیطرح مشہور ہے کہ نواب خانخاناں نے کسی دلپسند جگہ اپنی شادی کا پیغام دیا تھا دلہن والے ان سے راضی ہوگئے تھے مگر اسی جگہ کسی اور کا بھی دل تھا۔ اگرچہ وہ غریب تھا لیکن کیا کرے دل اسی جگہ آیا ہوا تھا۔

لیکن وارثانِ عروس نے انکار کر دیا تھا وہ یہ خبر سنکر خانخاناں کے پاس پہنچا خانخاناں دہاں شادی کرنے سے باز رہا۔ اور حسن ودولت کیوجہ سے وہ خانخاناں کو پسند کرتے تھے اس غریب کو مالامال اور نہال کرکے دلہن کے والدین کو راضی کر دیا۔ اس قصہ کو ہمنے نہایت مختصر کرکے لکھا ہے باقی باتیں مآثر الامرا وغیرہ میں بتفصیل ملتی ہیں منگیتر کو چھوڑنا اسی عالی حوصلہ کا کام تھا جس نے اس کہاوت کو رد کر دیا "بیاہی چھوٹی جاتی ہے منگیتو نہیں چھوڑی جاتی"

اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ جب کسی شخص کو اخلاق شجاعت یا سخاوت وغیرہ میں اعلیٰ درجہ کا ثابت کرنا چاہتے ہیں تو وہ دیگر خلیق۔ شجاع۔ اور سخی لوگوں کی صفتیں بھی اُس کے نام میں شریک کر دیا کرتے ہیں۔ جیسے راجہ بھوج۔ اور راجہ بکرماجیت کے ذکر میں اس قسم کی تعریفیں جمع کر دی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک نہ ایک وصف یا نقص ہونے پر متصف کو بڑھایا یا خواہ گھٹایا جاتا ہے بے اصل کوئی بات نہیں ہوتی ✤

اسیطرح ایک اور مثل مشہور ہے کہ جدھر مولا اُدھر آصف الدولہ۔ یعنے جیسے خدائے تعالیٰ کو دینا منظور ہوتا ہے آصف الدولہ سا دریا دل۔ غریب نواز بھی اُسی کو دیتا ہے اِس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آصف الدولہ اپنے وقت کا حاتم صفت نواب تہا اور سنیئے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" یہ کہاوت کس منہ سے راجہ رامچندر اور راون کے بھائی ببھیکشن کے تاریخی واقعات کو ثابت کر رہی ہے۔ علیٰ ہذا "چام کے دام" نظام سقہ کی کیسی خیر خواہی۔ اور وفاداری دکھا رہی ہے" اورنگ زیبی پھوڑا" گولکنڈے کے اُس دیرطلب محاصرے کو جسمیں اجتماع لشکر و اختلافِ آب ہوا کے سبب اکثر لشکریوں کے خون میں سوداے غیر طبیعی کا مادہ غالب ہوکر پھوڑے نکل آئے تھے۔ کس عمدگی سے اُس دیرینہ مواد کا اظہار کر رہا ہے ✤

پس اس تمام تمہید سے ثابت ہوگیا کہ جو تاریخی باتیں مؤرخ نہ لکھیں یا ضبط تحریر میں نہ آئی ہوں وہ اس قابل نہیں ہیں۔ کہ انہیں بے اعتبار محض گھڑت یا غلط سمجھا جائے راجپوتانہ کے۔ کاٹھیاواڑ کے۔ مالوے کے بہت سے خاندان ایسے ہیں کہ اُنکو اپنے بزرگوں کے نام اور اُن کے حالات کی خبر یا تو بھاٹوں کے گیتوں سے ملی ہے یا اپنے بڑے بوڑھے پُرکھاؤں سے اسیطرح عالمگیر کے زمانہ کی وہ مشہور روایتیں دوہے۔ اور گیت وغیرہ ہیں جو دکن پر فوج کشی کرنے اور وہاں ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دینے کے متعلق زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان سے سپاہیوں کی فراق زدہ بیویوں کی گزارش اور عالمگیر کے جواب کی ایک عجیب کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ بیوی کو اپنے خاوند کی جدائی کیسی شاق گزرتی ہے اور خاصکر ساکنانِ ہند میں کہ جہاں نہ طلاق کا دستور ہے نہ خاوند کے چھوڑ دینے کا رواج۔ یہانتک کہ اگر چھوٹی عمر یا عین عالمِ شباب میں کوئی بیوہ ہوجاتی ہے تو اس کا بھی دوسرا نکاح جائز نہیں سمجھتے۔ ایسے ملک کی عورتوں کو کسقدر اپنے خاوندوں سے تعلق ہونا چاہیے ستی ہونے کی رسم اسی برہ کیوجہ سے نہایت خوشی اور استقلال کے ساتھ ہند کی عورتوں نے گوارا کی تھی۔ چنانچہ امیر خسرو دہلوی نے کس خوبصورتی سے اپنے دو ایک شعروں میں اس رسم کا اظہار کیا ہے۔ گو یہ رسم وحشیانہ ہے۔ ظالمانہ ہے۔ مگر اُن کے نزدیک خاوند کی جدائی اس جلاپے سے بدرجہا بہتر اور عین سکھ ہے فرماتے ہیں ؎

ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست — سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست
خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش — کو برائے مردہ سوزد زندہ جانِ خویش را

ہندی بارہ ماسے یہاں کی عورتوں کے دلوں کا آئینہ ہیں۔ کوئی مہینا ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے خاوند کی جدائی کو ایک لحہ کیواسطے بھی پسند کرتی ہوں۔ ماں باپ کنیا کا دان کرتے ہیں اور کنیا تمام عمر کیواسطے اپنے خاوند کی کنیز بے عذر ہوجاتی اور اُس کی جدائی میں اس قسم کر

دوہے کہا کرتی ہے ؎

دوہا نمبر ۱

پیتم تیں مت جا نیو توہے بچھڑت موہے چین گیلے بن کی لاکڑی سلگت ہوں دن رین

یعنے۔ میرے پیارے خاوند یہ نہ جاننا کہ تمہارے بچھڑنے سے مجھے چین ہے۔ میں بن کی گیلی لکڑی کی طرح رات دن سلگتی رہتی ہوں ؎

دوہا نمبر ۲۔

سپنے میں موہے پی ملے کرنہ سکی دو بات سوتی تھی رو تی اُٹھی ملت رہی دو ہاتھ

یعنے خواب میں میرے میاں مجھے ملے مگر دو باتیں بھی نہ کرسکی کہ آنکھ کھل گئی یا تو پڑی سوتی تھی روتی اُٹھی اور دونوں ہاتھ ملتی رہ گئی ؎

دوہا نمبر ۳

ارے پپہا کلسرے دیت کٹے پر نون پیو میرا میں پیو کی تو پیو کہے سو کون

یعنے ارے کل سرے پپیہے تو کیوں زخم پر نمک چھڑکتا ہے۔ پیا میرا ہے میں پیا کی ہوں تو پیا پیا کہنے والا کون ہوتا ہے ؎

دوہا نمبر ۴

کاجل ڈالوں کرکرا اور سرمہ دیا نہ جائے ان نینن میں پی بسے دوجا کون سمائے

یعنے آنکھوں میں کاجل لگاتی ہوں تو کرکرا معلوم ہوتا ہے اور جو سرمہ لگاتی ہوں تو لگایا نہیں جاتا سچ ہے جن انکھڑیوں میں پیا بسے اُنمیں دوسرا کب سما سکتا ہے ؎

دوہا نمبر ۵۔

کاگا نین نکاس دوں جو پیا پاس لیجائے پہلے درشن دکھا یو پاچھے لیجو کھائے۔

یعنے۔ ای ماس اُدھاری (گوشت خوار) کوے اگر تو بو کا ہی تو میں اپنی دونوں آنکھیں نکالے دیتی ہوں انکو میرے پتی (خاوند) کے پاس لیجا۔ پہلے انکا دیدار دکھادے پھر شوق سے کھالے۔ ایک نتیجہ دو کاج ہو جائینگے تیرا پیٹ بھرجائیگا میری تسلی ہو جائیگی ؎

دوہا نمبر ۶

سائیں بسیں پہاڑ پر ہم جمنا کے تیر ابکا ملنا کٹھن ہے کہ پاؤں پڑی زنجیر

یعنے ساجن پہاڑ پر رہتے ہیں اور ہم دریائے جمنا کے پاس بڑے فاصلے پر بستے ہیں۔ ابکی دفعہ ملنا نہایت مشکل ہے کہ اِدھر جمنا کی اُدھر فاصلہ کی زنجیر ہمارے پاؤں میں پڑ گئی ہے ؎

دوہا نمبر ۷۔

بانہ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے — ہردے میں سے جاؤ گے تو مرد بدُوں گی توئے

یعنی میرے میاں گو تم مجھے کمزور اور بے بس سمجھکر اپنی بانہ جھٹک پردیس چلے ہو۔ مگر یہ مردانگی نہیں ہے۔ مردانگی تو جب ہے کہ تم میرے دل کے اندر سے نکل جاؤ۔ کہیں جاؤ۔ رہوگے دل میں ۵

سوال — دوہا نمبر ۸۔

بھونرا رے! پردیسیا میں پوچھت ہوں توئے — سب تن تیرا سانورا مُکھ کیوں پیرا ہوئے

یعنی اے پردیسی بھونرے! میں تجھسے پوچھتی ہوں کہ تیرا تمام جسم تو سانولا ہے۔ مگر یہ تو بتا کہ منہ کیوں زرد ہے۔ ۵

جواب — دوہا نمبر ۹۔

دُکھیں کے مکھ پیرے مرم نہ جانے کوئے — جا مکھ میں پیا بسے سو وہ مکھ پیرا ہوئے

یعنی دُکھیاروں کے مُنہ زرد ہی ہوا کرتے ہیں مگر اس رمز اور بھید کو کوئی نہیں پاتا کیونکہ جس منہ میں پیا بستا ہو وہ اسکی جدائی میں زرد ہی رہا کرتا ہے۔ ۵

دوہا نمبر ۱۰

لگا اساڑھ سہاؤنا گرجت ہے چہوں اور — پی پی کرت پپیہا۔ راسو بولت دادر مور

یعنی اساڑھ کا مرغوب الطبع مہینا شروع ہوگیا چاروں طرف گھنگور گھٹا چھا کر گرجنے لگی۔ پپیہے نے پی پی کی رٹ۔ مینڈک اور موروں نے جھنگارنے کی جھڑی لگادی مگر اب تک میرا ہی خاوند نہ آیا۔

اور تو اور ان عورتوں کو جانوروں کے جوڑے کے بچھڑنے کے ساتھ بھی وہی ہمدردی و دلسوزی ہے جو اپنی ذات کے ساتھ ہے۔ ہند میں مشہور ہے کہ چکوا چکوی یعنی سُرخاب کا جوڑا یہ دونوں پرند۔ دن کو تو سارس کی طرح ہر وقت ساتھ رہتے ہیں مگر تقدیر تمام رات کو جُدا جُدا ہو جاتے ہیں۔ اگر دریا کے اس پار چکوی ہے تو اس پار چکوا چلا جاتا ہے۔ اور رات بھر ایک دوسرے کو پکارتا رہتا ہے چنانچہ امیر خسرو نے بھی اس امر کا ایک موقع پر اظہار کیا ہے پس اس کی جدائی بھی ہمانکی عورتوں کو ایسی ہی ناگوار ہے جیسی اپنی اور اپنے خاوند کی چنانچہ اس امر کے ثبوت میں

یہ دوہا کافی ہے ۔ ؎ دوہا نمبر ۱۱

چکوا چکوی دو جنے اِن مت مارے کوئے   یہ مارے کرتار کے رَین بچھویا ہوئے

یعنے چکوا چکوی دو جنے (تنفس) ہیں۔ انہیں کوئی نہ مارو یہ تو خود ہی خدا کے مارے ہوئے ہیں کہ رات بھر باہم جدا اور فراق زدہ رہتے ہیں +

کہتے ہیں کہ جب عالمگیر کو دکن کی چڑھائی پیش آئی اور ہند کی فوج جمع کرکے وہاں لیگیا تو اُسے وہاں پڑے پڑے بارہ برس ہوگئے مگر دکن سر نہوا۔ اِس موقع پر اُن سپاہیوں کی عورتوں نے جو اپنی شادیاں کرتے ہی حکم پر چلے گئے تھے مشورہ کرکے ایک دوہا بطورِ عرضداشت لکھکر کسی قاصد کو دیدیا کہ جہاں تو اور سرکاری کاغذ دے وہاں یہ بھی اُسمیں رکھ دیجیو شاید عالمگیر کو رحم آجائے اور وہ ہمارے خاوندوں کو کچھ دنوں کے لیئے رخصت دیکر یہاں بھیجدے۔ وہ دوہا یہ ہے ؎ دوہا نمبر ۱۲

دلی شہر سُہاونا اور برسے کنچن نیر   سب کے کنتھ بٹور کے لے گیو عالمگیر

یعنے دلی ایک بڑا اچھا اور خوش آیندہ شہر ہے جہاں سونے کا مینہ برس رہا ہے مگر یہ دولت اور یہ ثروت کس کام کی جبکہ عالمگیر بادشاہ سب کے خاوندوں کو سمیٹ سماٹ کر دکن لے گیا۔ دولت کا لطف تنہا نہیں آتا۔ کیسی ہی بخشش قرار تنخواہیں کیوں نہوں ہمارے حق میں تو وہ زہر ہلاہل ہیں عالمگیر نے دوہے کے جواب میں یہ دوہا بطور حکم لکھکر واپس کیا ؎ ۔ دوہا نمبر ۱۳

بیٹھی رہو قرار سے من میں راکھو دھیر   صاحب سے منتی کرو جو بَسریں عالمگیر

یعنے بے تاب نہو تحمل سے صبر کئے بیٹھی رہو اور خدا تعالیٰ سے عاجزی کیساتھ دعا مانگو تاکہ عالمگیر کامیاب ہوکر فتح کا ڈنکا بجاتا ہوا آئے اور دونوں گھر آباد ہیں اس حکم پر صبر نہ آیا تو انہوں نے پہلی طرح پھر ایک اور دوہا لکھکر روانہ کیا۔ جو یہ ہے ؎ دوہا نمبر ۱۴

سونا لاون پی گئے اور سُونا کر گئے دیس   سونا ملا نہ پی ملے رُوپا ہوگئے کیس

یعنے ہمارے سوامی کما دھما کر سونا لینے تو چلے گئے مگر یہ خبر نہ رکھی کہ اُن کے جانیسے

ہمارے نزدیک سارا دیس اُجاڑ اور سنسان ہو گیا۔ نہ تو سونا ہی ہاتھ لگا۔ نہ ساجن ہی پھر کر آئے یہاں تک کہ جوانی سے بڑھاپا آ کر ہمارے بھونرلے بال بھی چاندی کیطرح سفید ہو گئے۔

اِس کے جواب میں عالمگیر نے یہ حکم چڑھا کر دھے میں بھیجا ۔ دوہا نمبر ۱۵

ڈاڑھی ہتی۔ سوَن بھئی آنکھیں بھئی سیرش جیسے کنتھا گھر رہے ویسی رہے بدیش

یعنے اس مدت میں تمہارے گبرو خاوندوں کی ڈاڑھیاں سن کیطرح سفید ہو گئیں اور آنکھیں بڑھاپے کے مارے بیٹھ بیٹھ کر سریش بن گئیں۔ اب اُنکا آنا نہ آنا برابر ہے سمجھ لو کہ جیسے کنتھا گھر رہے ویسے بدیس رہے۔

گو اِن دوہوں پر کلّی اعتماد نہو مگر مورخانہ نظر اُس زمانہ کی وہ چڑھائی جو عالمگیر کیطرف سے دکن پر ہوئی۔ اُسکی درازی مدت سپاہیوں کی بیویوں کی بیکلی اور عالمگیر کا منشا بخوبی ظاہر کر رہی ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جس بادشاہ کو اپنے ملک میں امن و امان رکھنا ہو۔ وہ مدت دراز کے واسطے ایک ہی فوج کو اُن کے ملک۔ اُن کے دیس۔ اُن کے کُنبہ عزیز و اقارب سے جدا نہ کرے تاکہ وہ دل مار کر بیدل ہو کر اپنی جوانمردی کو بزدلی سے اور بہادری کو نامردی سے بدل کر شکست کا موجب نہو جائے۔ بال بچّوں میں رہنے کی خوشی بہادری کے تمغوں کی خوشی کو پرے بٹھاتی ہے۔ انگریزی حکومت نے فوج کے واسطے رخصت چھٹی جس قاعدے سے مقرر کی ہے وہ ایسے خیالات سے بچاتی ہے +

اِن معروضانہ دوہوں کی نسبت یہ بھی مشہور ہے کہ یہ کھتریانیوں کی طرف سے گئے تھے۔ اگرچہ اس کا کوئی اور ثبوت نہیں مگر کھتریوں کا فوج میں ملازم ہونا محمد شاہ اور احمد شاہ کے وقت میں بھی پایا جاتا ہے اور رسالہ ہفت چمن سے بھی جو مرہٹہ گردی کے زمانہ کے ایک سپہ سالار کے خاندانی آدمی کا لکھا ہوا ہے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہتے ہیں جسوقت نادر شاہ محمد شاہ پر چڑھکر آیا تو قزلباشوں کے علاوہ کابلی

کھتریوں کا ایک رسالہ بھی تھا جسے محمد شاہ نے پسند کیا اور نادرشاہ نے ازراہ دوستی اُس کی نذر کر دیا۔ یہ رسالہ احمد شاہ خلف محمد شاہ کے وقت میں بھی موجود تھا جب احمد شاہ ابدالی اپنے ہمنام پر یورش کر کے آیا اور یہ رسالہ اپنے بادشاہ کیطرف سے کٹکر لڑا اور لوٹ کر مرا تو اُسوقت دُرانی نے اس رسالہ کی بہادری دیکھکر اُس کے افسروں اور سواروں سے کہا کہ تم ہمارے ملک کے ہو۔ اور ہماری سلطنت کے نمک خوار رہے ہو ہم سے مل جاؤ۔ مگر اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم تو آج نہیں مرے کل مرجائیں گے مگر یہ نمک حرامی اور بیوفائی کا داغ ہماری زندگی میں ہمارے ماتھوں سے اور ہمارے بعد ہماری قوم اور نسلوں سے مٹائے نہ مٹیگا جس حالت میں ہمارا آقا نادرشاہ دہلی کے بادشاہ کے سپرد کر گیا۔ اور ہم اُن کے نمکخوار ہو گئے تو اب کس مُنہ سے بیوفائی اور کورنمکی قبول کریں +

جسوقت عالمگیر کے پاس ان عورتوں کی اخیر درخواست پہنچی تو اُس نے اُن کے بڑے بوڑھوں اور وارثوں کو کہلا بھیجا کہ ان عورتوں کی دوسری شادی کر دو۔ ان لوگوں نے جواباً گزارش کیا کہ ہماری قوم میں یہ دستور نہیں ہے پس اُسوقت سے عالمگیر نے کھتری قوم کو فوج میں رکھنا موقوف کر دیا۔ اور سابقہ خدمات کے صلہ میں ہمیشہ کے واسطے خاص اِس قوم کے نام دہلی کی دلالی چڑھا دی۔

اس روایت سے بعض تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

عالمگیر کی اس رعایت پر ہمیں اُسوقت کا ایک ایسا ذکر یاد آ گیا جس سے اُس کی رحمدلی اور حق شناسی بخوبی مترشح ہے ہمنے اِس ذکر کو اپنے کئی بزرگوں سے متواتر سُنا تھا جس کے باعث لکھنے کی جرأت ہوئی +

مُلّا جیون جو ایک بہت بڑے فاضل اور فتاویٰ عالمگیری کے جامع ہیں اُنکے اُستاد تھے۔ عالمگیر کی شہزادگی کا زمانہ تھا۔ وہ انکی بہت ہی خاطر کیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب

زبان کا چسکہ اور کھانے پینے کا شوق ہوتا ہی ہے طرح طرح کی چیزوں پر دل چلنا اور دعوتوں میں جانا انکی عادت میں داخل ہے۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کہ مُلّاجی کا دل گلگلوں پر چلا اور بے تکلفانہ سیدھے سبھاؤ عالمگیر سے کہدیا کہ صاحب عالم! آج تو گلگلوں کی بہار ہے۔ عالمگیر جھٹ تاڑ گیا کہ آج مُلّاجی کا دل گلگلوں کو چاہتا ہے۔ فوراً میر مطبخ کو حکم دیا۔ وہ آن کی آن میں قند کے نہایت لطیف اور خوش ذائقہ گلگلے تلوا کر قابوں میں سجا حاضر ہوا۔ مُلّاجی کے آگے آبدار گلگلے رکھے گئے۔ آپ نے اُن میں سے ایک اُٹھا کر کھایا اور کہا کہ صاحب عالم سب کچھ ہے مگر انمیں گڑھیت نہیں ہے۔ عالمگیر مسکرایا اور فرمایا حضرت اس گڑھیت کے صیغہ اور مصدر کو میں نہیں سمجھا۔ ذرا اس کی بھی تشریح کر دیجئے۔ مُلّاجی نے کہا سُنو! بھائی گڑھیت اسے کہتے ہیں کہ چھاچھم مینہ برس رہا ہو۔ بچے کڑھائی کے واسطے سر ہو رہے ہوں۔ ہم دوڑے دوڑے بازار گئے ہوں۔ وہاں سے بھیگتے بھاگتے لتھ پتھ۔ چادرے کے ایک کونے میں میدہ۔ دوسرے میں بیسن تیسرے میں گڑھ۔ چوتھے میں پھلکیوں کا مصالحہ بندھا ہوا ہو۔ ایک ہاتھ میں تیل کی ہانڈی۔ دوسرے میں لکڑیاں۔ بغل میں چادرے کی پوٹلی دبی ہوئی ہو اور خوشی خوشی گھر آ رہے ہوں۔ ہمارے آتے ہی بچوں کی ماں کڑھائی کرنے بیٹھی ہو۔ ادھر اولتی ٹپک رہی ہو۔ اُدھر گلگلے چھُن چھُن تلے جا رہے ہوں۔ پُھار کی ہلکی ہلکی بوچھاڑ آ رہی ہو۔ ٹکیاں۔ پھلکیاں گرما گرم اُتر رہی ہوں۔ ایک بچہ کہے اماں ہمیں؟ دوسرا بچہ کہے اچھی اماں! پہلے ہمیں! بچوں میں چھینا جھپٹی ہو رہی ہو۔ باوا کے پاس فریادیں آ رہی ہوں۔ ساتھ ساتھ ہم بھی کھاتے جاتے ہوں۔ بچوں کی ماں بھی کبھی کبھی مُنہ میں ڈال لیتی ہو۔ منہ میں شہد کے سے گھونٹ آ رہے ہوں میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی ہوں اس کا نام گڑھیت ہے۔ میں نے تمہارے محل میں بیٹھکر قند کے گلگلوں سے مُنہ میٹھا کر لیا اور میرے بچوں کے مُنہ میں نہ گیا۔ تو یہ قند مجھے تو ہزار قید اور بند کے برابر ہے۔

عالمگیر استاد کی اس ہمدردی اور بچوں کی محبت سے بہت خوش ہوا۔ جیب میں سے اشرفیاں نکال مُلاجیون کی خدمت میں پیش کیں اور فرمایا کہ اچھے مولوی صاحب ابھی جایئے آج اس گرھیت کے مزے آپ لیجئے اور کل اسکی خوشی سنا کر ہمیں متلذذ فرمایئے +

گو یہ سب بظاہر کتابی یا ریخی باتیں نہیں ہیں مگر ان پر اگر ذرا بھی نظر غائر سے توجہ ڈالی جائے تو یہی بہت بڑی نتیجہ خیز کہانیاں بلکہ اس زمانے کی دل خوش کن نشانیاں ہو جائیں۔ اور آپ جان لیں کہ ہر زمانہ کی زبان۔ ہر وقت کے الفاظ۔ اسوقت کی تاریخ بتلانے کو خود موجود ہیں۔ کوئی کتاب میں لکھے یا نہ لکھے۔ یہ مُنہ سے بولتے ہوئے زندہ مُورخ ہیں۔

جنگ کے موقع کے الفاظ و محاورات جنگ کا۔ صلح کے وقت یا بزم کے الفاظ صلح کا۔ اطمینان کے زمانے کے الفاظ امن و امان کا سماں باندھ دیتے اور کانوں میں جُھک کر کہدیتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں وقت فلاں فلاں موقع پر بنائے اور رواج دیئے گئے۔ فقط

سیّد احمد دہلوی۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ
ممبر ہسٹوریکل سوسائٹی (پنجاب)

افسوس ہے کہ ضمانت اور ڈیکلریشن فارم کے جھگڑوں کی وجہ سے اپریل کا پرچہ اخیر اپریل میں شائع نہ ہو سکا اور بجائے اس کے شروع مئی میں شائع ہوتا ہے ہم اس قسم کی تاخیر کو ہمیشہ ناقابل معافی سمجھتے ہیں اور ناظرین تمدّن کو یقین دلاتے ہیں کہ آیندہ ہر مہینہ کا پرچہ حتے الوسع اسی مہینہ کی آخر تاریخوں میں شائع کرنے کی کوشش کریں گے +

منیجر عصمت و تمدّن دہلی

"نغمۂ مسرّت"

بہارِ جانفزا کیا جلوہ افروزِ گلستاں ہے — مسرت پتے پتے ڈالی ڈالی سے نمایاں ہے
تعجب کیا اگر بزمِ گلستاں شاد و خنداں ہے — کہ ہر ایک شاخسارِ گل عروسِ گل بداماں ہے
صدا یہ بلبلوں کی ٹولیوں سے پیہم آتی ہے — مُہیّا جانفروشی کا چمن میں آج ساماں ہے
قبائیں سبز کلیوں کی نہیں ہیں چاک اے بلبل — مگر یہ بھی طریقِ عرضِ حالِ جوشِ پنہاں ہے
نگاہِ دیدۂ نرگس سے ہی اندازِ رم پیدا — اسے بھی دعویٰ ہم چشمیِ چشمِ غزالاں ہے
ہوئی ہے کیا نرالی طرز کی کاشانہ افروزی — گلِ مہتاب سے روشن ہر ایک کنجِ گلستاں ہے
چمن میں لالۂ پر داغ بھی یوں ہِلکے کہتا ہے — کہ میرے دامنِ دل میں متاعِ گلفروشاں ہے
وہ زلفِ مشکبو اپنی مگر کھولی ہے سنبل نے — شمیمِ جانفزا سے جسکے گلشن عنبر افشاں ہے
جنوں انگیزیاں یوں ہی اگر ہوں سبزہ و گل کی — تو دیوانوں کا پھر چاکِ گریباں تا بداماں ہے
بہارِ آفرنیش کی حقیقت پوچھ مت بلبل — کہ پنہاں اس میں رازِ فیضِ خاکِ گلعذاراں ہے
اثر کس زلف کے سودے کا تجھپر ہی ہوا سنبل — ترے ہر یک رگِ تن پر گمانِ مارِ پیچاں ہے
حضورِ کامرانی و مسرت کا اثر دیکھو — سیہ بختی مری سرمہ کشِ چشمِ غزالاں ہے
عوض نکہت کے نغمے غنچہ منقار سے نکلے — تعجب کیا جو شاخِ گل پہ یوں بلبل غزلخواں ہے
گلے مل لو گلے مل لو کہ روزِ عیدِ قرباں ہے — میسر سیرِ گلشن - بزمِ یاراں - دیدِ جاناں ہے

خبر کرنے کوئی اوس مست صہبائے جوانی کو
شباب مبتلا و چار و نکا آہ مہماں ہے

محمد سیف الدین شباب

(از حیدرآباد دکن)

ضمیرہ

نتیجہ نکل تو یہ بھی سکتا ہے کہ بچپن ضمیرہ اور احسن دونوں کیواسطے سم قاتل ہوا لیکن ایک محلہ کے رہے ہے ایک جگہ کے اُٹھے بیٹھے ایک مکان کے کھیلے کودے اور ایک مکتب کے پڑہے بچے اگر انسان ہونے کے بعد اسوقت کو یاد کرتے رہے جب نادان تھے تو کیا گناہ کیا؟ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ دونوں کے دونوں کیچڑ میں لتھڑے تھپڑے انگنائی میں مٹی کے گھر بنا رہے ہیں ملاپ تہا لڑائی ہوئی کوسا کاٹا۔ مارا پیٹا۔ تہوڑی دیر میں پہر ایک سے ایک۔

ذمہ دار ہیں تو اور قصور وار ہیں تو وہ دونوں مائیں جنہوں نے کلیا میں گڑ پہوڑ لیا۔ بیٹا بیٹی کا بنچ منہ کا نوالہ نہ تھا کہ چپکے سے بیٹھ سر جوڑ قول قرار وعدے وعید قسما قسمی سب کچھ ہوگئی۔ یہ مانا کہ دولہا دولہن دونو اسوقت کیڑا تھے مگر ترقی عمر کے ساتھ ہی احساس کا وجود تقاضا فطرت تہا اسپر غیر متوقع واقعات حوادث سب نے ان نتائج کا جنکا ظہور یقینی وقطعی تہا۔ دونوں آشنا تھے اس خبر سے کہ ہیں اپنی عمر کا بڑا حصہ اس تعلق میں بسر کرنا ہے جس کے انقطاع کا انحصار موت اور صرف موت پہ ہے اور دونو دماغ گھنٹوں فلسفہ عقد کی ماہیت پر غور کر چکے تھے باوجود اس علم و اعتراف کے کہ یہ ننہے دماغ جنکا نشو و نما ابہی ترقی پذیر تہا اس مشکل مسئلہ پر کافی خوض سے معذور رہتے لیکن انکا خلوص صداقت طفولیت ہر چیز سفارش کرتی ہے کہ انکی یہ کوشش نمایاں عزت کی مستحق ہو۔

قیاس چاہتا ہے کہ ضمیرہ کی ما اگر اسکو موت نہ آتی تو چاہے مرجاتی مگر جو کہا تہا وہ کر دکہاتی ایک شوہر کیا کنبہ بہر ٹیتا رہتا مگر وہ یہ اندھیر نہ کرتی کہ

کہ مدتوں کی بات چھیڑا اور برسوں کے عہد توڑا بچی کو جیتے جی کنوئیں میں جھونک دے یہ تمام اتفاقات تھے کہ ماکو آئی موت باپ کی آنکھوں پر پڑا پردہ صلاح کار ملے تو کیسے؟ کہ جانی دشمن اور خون کے پیاسے. مینڈھے لڑوائے اور تماشا دیکھا۔ ضمیرہ نے مصیبت بھگتی تو اور احسن پہ آفت آئی تو انکی بلا سے۔

مقدر اگر کوئی شے ہے تو ضمیرہ چونکہ ازلی بدنصیب تھی اچھا ہوا کہ دنیا سے اٹھ گئی اور یہ جگر خراش صدمہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا گو اتنے الزام سے وہ بری نہیں ہو سکتی کہ اس فسانہ کا اصل سبب اسکا اقرار تھا اور میدان حشر برحق ہے تو باپ اسکی روح نہ شرمائے ایک ایسے مواخذہ میں گرفتار ہوگا جس سے چھٹکارا رحمت اور مغفرت کسی کے بس کا نہیں۔

آسمان ان دو معصوم بچوں پر خون کے آنسوؤں[1] سے رو رہا تھا جو ٹھیک دوپہر کے سنسان وقت میں جبکہ لو کے تھپیڑے ذی روح اور غیر ذی روح دونوں کو جھلسا رہے تھے جنوبی ہند کے مشہور قبرستان دار الاقامۃ میں ایک تازہ قبر پر سر پکڑے بیٹھے تھے ان کے ننھے دل جو ابھی ذائقہ حوادث و مصائب فراق سے قطعی نا آشنا تھے صرف اتنا محسوس کر سکتے تھے کہ اس مرحومہ کا فراق فراق ابدی ہے گو ابھی تک انکی قوت متخیلہ بہت کچھ ترقی کی محتاج تھی تاہم خیالات نے ان دماغوں میں اتنا اثر کر رکھا تھا کہ دونو حالت استغراق میں تھے دفعتہ کسی خیال نے ضمیرہ کو بیتاب کیا اسنے ایک حسرت بھری نظر چچازاد بھائی احسن پر ڈالی اور اس کے ساتھ فرط محبت میں قبر سے لپٹ گئی اور باواز بلند کہا۔ "اماں جان! آنکھ کھولیے ضمیرہ حاضر ہے"

باقی

راشد الخیری

گپ شپ

ایک ٹھیکیدار صاحب جو علم سے بالکل کورے تھے اس فکر میں ہوئے کہ کسی تعلیم یافتہ عورت سے شادی کریں اس کوشش میں کامیابی ہوئی اور ایک مہذب روشن خیال پڑھی لکھی عورت سے شادی ہوگئی دو تین روز بعد صبح کیوقت ایک دن ٹھیکیدار صاحب نے بیوی کو نہایت خاموش دیکھکر دریافت کیا خیر و عافیت ایسی خاموش کیوں بیٹھی ہو؟ طبیعت تو اچھی ہے؟

بیوی۔ کچھ نہیں! سعدی کے اس شعر پر غور کر رہی تھی سمجھ میں نہیں آتا کہ سعدی سے شخص نے یہ کس طرح کہدیا؟

زن دوست بود و بے زمانے ۔۔۔ تا جز تو نیافت مہربانے

آپ ہی اسپر غور کیجئے۔

میاں۔ میں اسکا مطلب سمجھ گیا۔

بیوی۔ (خوش ہوکر) ہاں فرمایئے +

میاں۔ بس اسکا مطلب یہ ہے کہ میری اور آپ کی گذر نہیں ہوگی۔ سلام علیکم۔

ایک طالب علم تحصیل علم کی غرض سے ایک مدرسہ میں داخل ہوگئے فارغ التحصیل ہونیکے بعد جب اپنے وطن کو جانے لگے تو مولوی صاحب نے اور چند احباب کو جمع کیا تاکہ انکو رخصت کریں اور فرمایا۔

استاد۔ میاں اب تم جاتے ہو اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو شبہ ہو تو اسوقت اپنا اطمینان کرلو۔

فارغ التحصیل۔ الحمد للہ۔ کوئی شبہ نہیں ہے ۔۔۔۔ مگر بوستاں میں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی یہ جگہ جگہ حکایت حکایت کیا لکھا ہے +

راحت زمانی

مولوی سید احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کیگئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت۔ ایک روپیہ۔ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت الخیری نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸

لڑکیوں کی انشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸؍)

منیجر عصمت و تمدن۔
(تمدن پریس دہلی)

عصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق۔ عصمت سے بہتر راہ صلاح کا رملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائے گا کہ کوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت اِن کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُرلطف و باطمینان بسر کروانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں ان کی ذمہ داریاں اُن پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے۔ عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کیساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجۂ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ہر مہینہ ۴۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول ملتی ہیں۔ سالانہ قیمت (۳ روپے)

مینیجر عصمت و تمدن (دہلی)

جلد (۱) مئی سنہ ۱۹۱۱ء نمبر (۲)

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر = شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت سالانہ قسم اول (ع۱ روپے) قسم دوم (۲ روپے)

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹

قیمت فی پرچہ (۳)

کتبہ احقر ابو الظفر حامد میرزا دہلوی

تمدن

یہ ۴۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخری تاریخوں میں اُن منتخب اہلِ قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اس وقت ملک و قوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں۔

تمدن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہے۔

تمدن ایک اکسٹرا لبرل پرچہ ہے جس میں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالیٹکس سے علیحدہ ہو اس وجہ سے ہرگز رد نہیں ہو سکتا کہ **تمدن** اس سے متفق الرائے نہیں ہے

تمدن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہونگے جو خواتین کے مطالعہ سے گزر سکیں

تمدن دو قسم کے کاغذ پر اول و دویم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اول تین روپے چھ آنہ (۳/۶) قسم دوئم ۲؎ ۔ نمونہ کا پرچہ (۶؍)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنہوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا۔

منشی حامد حسین صاحب

مولوی سیف الدین صاحب شباب

مفتی دلاور شاہ صاحب فصیح

مولوی سید ناصر علی صاحب بھوپال۔

مولوی جماد علی خاں صاحب۔ عالی۔

منیجر عصمت و تمدن

(تمدن پریس دہلی)



تمدّن

تمدّنِ اسلام

تغیر اور حدوث جو زمان و مکان میں دائر و سائر ہے، جس طرح افراد انسانی کے حالات میں چشم زدن میں زمین و آسمان کا انقلاب پیدا کر دکھاتا ہے، قوم جو افراد انسانی کے ایک بڑے مجموعہ یا گروپ سے عبارت ہے اوس کے حالات میں بھی دیگر اقوام کے دیکھتے دیکھتے وہی انقلابات برپا کرتا رہتا ہے، جس سے قومیں وجود پاتی ہیں پھولتی اور پھلتی ہیں، اور اپنی بہار دکھا کر فنا ہو جاتی ہیں، یہ سلسلہ سلف سے جاری ہے اور آخر تک رہے گا، یعنی زمانہ اسی طرح بنا بنا کر بگاڑے گا +

دور مجنون گذشت و نوبت ما ست

ہر کسے پنج روز نوبتِ اوست

آپ کو تعجب ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ یہاں اس عالم کے سوا جسے آپ غیر قار اور نشانہ حوادث پا رہے ہیں، ایک عالم ایسا بھی ہے، جو قار ہے، جہاں گذرا ہوا زمانہ اور گذشتہ صدمات بدستور اپنی جگہ برقرار ہیں، اور جہاں تک فلک کے

ستِ تظلم، اور انقلابات کے طوفان کے رسائی نہیں

حالات نے جسکے دو حصّہ کر دیئے ہیں اور جنمیں سے وہ حصّہ زیادہ روشن اور نمودار ہے جسمیں تاریخ کے چراغ جلتے ہیں، مطالعہ کی عینک لگا کر تم جب چاہو دیکھ لو، دنیائے تاریخ وہ زندہ دُنیا ہے، جسمیں سارے گذشتہ حالات حروف کا لباس پہنے ہوئے نظروں سے گذرتے معلوم ہوتے ہیں،

درس و تدریس کی مسندیں بچھی ہیں، ملکی انتظامات کی کلیں چل رہی ہیں عرصہ مصاف میں فوجیں سرگرم پیکار ہیں، غرضکہ بظاہر ساکن مگر متحرک اور چلتی پھرتی دُنیا ہے، جس کے بسنے والے بقاء دوام، اور حیات جاوداں کی منزل اور امن و امان کی دُنیا میں ہیں،

اِس عالمِ آثار کا دوسرا حصّہ دنیائے تاریخ سے پرے ہے، جہاں دنیائے تاریخ کے ایسے پرشان ایوان حکومت آراستہ محلات علم کا صدقہ جاریہ تقسیم کرنے والی درسگاہیں، اور یہ دھوم دھام اور چہل پہل تو نہیں، لیکن پُرانی عظمت و وقار کی یادگار رہے سہے نشان عمارات کے ٹوٹے پھوٹے آثار، کھنڈر، محراب و در، کچھ معتقدات مذہبی[1] تجسس و تلاش کی کچھ نشانیاں اور عمل کے انکشافات، جیسے آگ کی اختراع نمک کی تلاش، روٹی پکانے کی ترکیب، سینے پرونے، اور کاتنے کے طریقوں کی ایجاد، پتھر اور دوسری دھاتوں کے کارآمد اسلحہ و آلات وغیرہ البتہ موقعہ موقعہ سے مہیا ہیں جو اس گذشتہ تمدن کے باقیات، اور اس پُرانے وقت کے آثار ہیں جو تاریخ کی روشنی پھیلنے سے پہلے گذر چکا ہے،

یہاں اگر اس بات کا سخت افسوس ہوتا ہے، کہ آج دُنیا کے ان بڑے

---

[1] جو اگرچہ تاریخ سے پہلے سینہ بسینہ چلے آتے تھے، مگر اب بیشتر تاریخ میں منضبط ہو گئے ہیں۔ ۱۲

محسنون کے نام و نشان بھی پردہ غیب میں ہیں، جن کے تجسس و تحقیق سے آج ہم بڑے بڑے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، جس سے اس سنسان دُنیا کا منظر بعینہ اوس بزم کے منظر سے مشابہ ہے، جسمیں رات بھر یاروں کا جمگھٹا رہا ہو، اور صبح ہونے پر آئی تو سارے پنچھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ہوں دن کو لوگوں نے رنگ محفل کا سامان تو اِدھر اُدھر پھیلا ہوا سب کچھ پایا، مگر کسی انسان کی صورت نظر نہ آئی +

یہ تاریکی کا پردہ کچھ ہماری اسی پُرانی ہی دنیا پر چھایا ہوا نہیں ہے بلکہ نئی دنیا کے اُفق تاریخ کے پیچھے بھی اس وقت سے یہ سیاہی نظر آرہی ہے جبکہ ہمارے اسلاف نئی دنیا ہی سے ناواقف محض تھے، اور اوس بہادر اور شیر دل انسان کی کشتئ تلاش ساحل امریکہ تک نہ پہونچی تھی، جو امریکہ کا محسن ہی نہیں ہے، بلکہ فاتح اعظم کے لقب کا سچا مستحق ہے،

اوسوقت خود وہاں کے لوگ قدیم فن تعمیر اور سنگتراشی کے نمونے اُدھر اُدھر پھیلے دیکھکر، اور اُن کے بنانے والوں، اور تراشنے والوں کا سراغ نہ پاکر حیران تھے +

الغرض یہاں اور وہاں ہر جگہہ تاریخ سے قبل کا زمانہ ایک طلسم ہے، جس کا راز دانایان فرنگ بھی نہ پاسکے، جو ہر بات کا پتہ پتال سے نکال لایا کرتے ہیں آیئے! اس کالی کوٹھری سے نکلیں، اور تاریخ و تمدن کی دنیا میں ذرا الجھ آئیں، اور سبق لے آئیں، کیونکہ گذشتہ تمدن کا علمی اور اختراعی مواد جس تدریجی رفتار سے اس پایہ تحقیق کو پہونچا ہے، کہ آج اوس کے سطح پر نئی روشنی کے ایوان ترقی قائم ہیں، دماغ کے لیے یہ خود ایک قابل غور مسئلہ، گہری فلاسفی، اور ذہنی نتائج سے عملی توقعات کا برگ و بار لانیوالی ایک ترو تازہ شاخ ہے،

جو قومیں عہد تاریخ میں اُبھریں، اور کشور اقبال میں فرمانروا رہیں، اون کی فتوحات، اور اُن کی عہد کی عام برکات کا معائنہ آپ تاریخ کے آئینہ خانہ میں جا کر کر سکتے ہیں ہم یہاں تمہیداً اون کے تمدن وتہذیب کی محض اون نشانیوں کو دکھائیں گے جو آج بھی پائی جاتی ہیں۔ اور آثار کا صحیح اطلاق جنپر ہو سکتا ہے مثلاً

۱۔ فینقی تمدن کے آثارات میں سے اونکی قابل فخر اور واحد ایجاد حروف ہجا ہیں، جنہوں نے اپنے تجارتی سفروں کے ذریعہ سے اقصارعالم میں پھر کر شرق سے غرب تک کو اپنا منت کش تحریر بنایا،

یورپ میں اگر یونانیوں نے اُن سے اصلاح لی، تو ایشیا میں کلدانیوں نے اور یمن میں اہل عرب نے، اور انہیں خطوں میں ردوبدل کرنے سے دنیا کے تمام مروجہ اور متروک الاستعمال خطوط وجود میں آئے۔ جن کے قینقی نام ہمیشہ اپنے اصل موجد کی سند پیش کرتے رہیں گے۔

۲۔ مصری تمدن کی یادگار علم زراعت، علم تشریح، اور تصویروں پر رنگ آمیزی کرنے کا فن لطیف، انتظام سلطنت کے بہترین اصول وضوابط، نظم فوج کے قواعد،

مذہبی عقائد وعام خیالات کے ذیل میں۔ نماز کے وقت بخور اور خوشبوؤں کا سلگانا، عقیدۂ تثلیث، وکہانت، عبادتخانوں کی ہیکلوں کا ایک خاص طرز تعمیر، بعض اہل ادیان اپنے معبدوں میں اس طرز تعمیر کی ابتک تقلید کرتے ہیں

۳۔ کلدانیوں کے باقیات صالحات میں سے علم طب رجکی اصولی تدوین کی سند اولیت انہیں کے پاس ہے)، فلکیات۔ نجوم۔ سحر۔ وغیرہ فن تعمیر میں عراق والے ابتک ان کی اُستادی کا سکہ مانتے ہیں،

۴- بنی اسرائیل کے بقایا رہیں سے مقدس الہامی دستور العمل توراۃ عقیدہ توحید، وغیرہ۔

۵- یونانی عہد کی نشانیاں علمی سلسلہ میں۔ فن روایات تاریخ علم الہیات علم خطابت منطق۔ فلسفہ۔ فن محاماۃ۔ تمثیل۔ ریاضی اصول کے کھیل علمی اشاعت کے سلسلہ میں۔ مدارس علمی بحث و مکالمہ کی انجمنیں سلسلہ تعمیر کے متعلق یہ کہدینا کافی ہے، کہ یونان اور دوسرے مقامات میں جو پرانی عمارتیں آج بھی قائم ہیں، اون کے علاوہ یورپ کا کوئی میوزیم جس میں تعمیرات کے نمونہ رکھے گئے ہیں، یونانی ساخت کی قدیم عمارات کے نمونوں سے خالی نہیں،

۶- رُوما کی گذشتہ عظمت و وقار یورپ کا ایک واحد، مسلم الثبوت مسئلہ ہے، جسکی بنا پر وہ آج بھی یورپ میں مقنن اعظم یا استاد اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن باوجود مدارج ترقی میں سب سے اعلیٰ درجہ پر پہونچنے، اور ایک عرصہ دراز تک تمدن و تہذیب کی دنیا میں فرمانروائی کرنے کے، تاریخ میں اوسکی خالص علمی کوششوں کا بہت کم سراغ لگتا ہے، لیکن حقیقت حال یہہ ہے کہ اہل رُوما کو شروع شروع یونانی علوم اور فلسفہ سے بہت شغف رہا، مگر پھر رفتہ رفتہ اون کی عنانِ توجہہ حکمت علمی کی تیسری شاخ یعنے علم سیاست مدن کی طرف مڑتی گئی اور وہی پھر اونکی توجہہ کا مرکز قرار پاگئی، جس سے اس سیاست کے چمن بحیثیاں کو انکی توجہہ کے آب لطیف نے ایسا سیراب کیا، کہ ملکداری کے آئین او قانون کی بیلیں ہر طرف پھیلنے لگیں، پھر کلیاں پھوٹیں، اور حسن قبول کے پہول کھلے، جو بوئے قبولیت سے

بس گئے۔ اور ایسے بسے، کہ اس کے اثر سے یورپ کے اجتماعی اور سیاسی خیالات اسوقت تک مہکتے رہیں گے۔ جبتک رومن لا کی مستحکم بنیاد پر یورپ کے آہنی ایوان قائم ہیں،

لاطینی (لیٹن) زبان کو اسی تمدن کے آغوش تربیت میں نشو ونما پا نصیب ہوا، یہیں سے وہ علوم، اور مصطلحات قانون کی دولت سے مالامال ہو کر ٹکسالی اور باقاعدہ زبان کی سند لیکر نکلی جسے غنی پاکر یورپ کی تمام مروجہ زبانوں نے اوس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، اور اوس نے حسب ضرورت سب کی حاجت روائی کی،

گذشتہ قوموں نے تہذیب و تمدن کے جو باغ سنوارے تھے ان کے چند شگفتہ پھول خاطر عاطر کے سامنے پیش کئے گئے،

اب ہمارا دعوے ہے، کہ اسلامی عہد کے آثار، اور تمدن کی برکتیں مقابلۃً عہود سابقہ سے اعلیٰ تہذیب پھیلانے میں کامیاب تہیں، اور ان کے آثار سے ہی تمدن جدید نے بیش از بیش استفادہ کیا،

جسکی مختلف حیثیتوں پر روشنی ڈالنے کے لیے اسکی تحلیل دو جزووں میں کی گئی ہے، پہلے جزو میں ان علمی اور ادبی واقعات پر ریویو کیا گیا ہے، جو تمدن اسلام سے دیگر اقوام کے علمی استفادات کے سلسلہ میں وقوع پذیر ہوئے لیکن اس خاص اور اہم ریویو کی بابت ناظرین باتمکین سے ہماری التماس ہے، کہ وہ مخزن کی گذشتہ فائل جلد ۱۸ نمبر ۱ و ۲ و ۳ بابت ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۰۹ء میں ہمارا وہ مضمون جو "مشرق و مغرب" کے عنوان سے ہے ملاحظہ فرمائیں،

اس کا جزو ثانی جو تمدن اسلام کے سوشل حالات و آثارات، اور رفاہ و سعادت ابنار جنس کے خیالات کو تشریٰ قوت حاصل ہونے کے واقعات کا

ایک بسیط ریویو ہے، ذیل کی سطروں میں اون کا ہدیہ پیشکش ہوتا ہے،

اسلام کے قبل دنیا کی اجتماعی حالت کیا تھی؟

جبتک اسلام کا چشمۂ رحمت ریگستان عرب سے نہ اُبلا تھا، دنیا میں ہر طرف مفاسد و مظالم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، لہذا اُس پُر آشوب زمانہ کی حالت کے لحاظ سے اُسوقت جو مہذب ترین اقوام اور ممالک تھے اونکا نمونہ پیش کرنے سے بخوبی اسکا اندازہ ہوسکے گا، کہ اُسوقت کی اعلیٰ تہذیب کیا تھی، اور اسلام نے اوسپر کیا اضافہ کیا،

مشرق و مغرب میں اُسوقت دو سلطنتیں تھیں جو اپنی وجاہت سے ان دونوں مقامات کے لیئے مرکزی حیثیت رکھتی تھیں،

فارس کو اگر مشرق میں درجہ مرکزی حاصل تھا، اور وہاں کی تہذیب کا وہ سرمایۂ انتخاب تسلیم کیا جاتا تھا، تو روم کو مغرب میں،

روم کی سلطنت برائے نام مذہب عیسوی کی نام لیوا تھی، تو فارس کی سلطنت مجوسیت کی، ان سلطنتوں کے ڈانڈے ملے ہوتے تھے، جن کے حدود فاصل خون کی وہ ندیاں تھیں، جو قیصر و کسرے کی صف آرا فوجیں ہمیشہ باہمی کشت و خون سے بہایا کرتی تھیں، ان کے درمیان آتشِ جنگ مشتعل رکھنے کا اصل باعث وہ بیچین طبیعتیں تھیں، جو دوسری قوم کو برسر حکومت دیکھکر اپنے ناجائز جوش سے نچلی نہ بیٹھ سکتی تھیں، جن کی شر انگیز ریشہ دوانیوں نے خلقِ خدا کے جدال و قتال، اور جبری جنگ آزمائیوں سے فارس و روم کی سرسبزیوں کو بالکل پامال کر ڈالا تھا، ملک داری کا سلیقہ

نہونے پر بھی ملک گیری کے بڑہے ہوئے حوصلہ رکھتے تھے۔ غرضکہ دُنیا کی مہذب ترین اقوام، خوش انتظام اور لائق گورنمنٹوں کا یہ نقشہ تھا، کہ آفتاب اسلام نے افقِ خاور سے طلوع اجلال فرمایا، جس نے اگر صلح و آشتی کی زمین میں عدل و انصاف کا قانون جاری کیا۔ تو ظلم و تعدی کرنے والوں کو اون کے استیصال کا فرمان بلند آہنگی سے سُنایا، مغلوب اقوام کو اونکی حمایت اور پشت پناہی، اور اُن کے تسلیم حقوق، جابروں کو زیر رہنے، اور قاعدوں و قانون سے ایک قدم متجاوز نہونے کا اعلان کیا۔ اور اہل فارس و روم کو اوس کشمکش سے نجات دلائی جو انمیں سے کسی ایک کے غلبہ کی صورتمیں یوں ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اہل فارس کا قدم مقبوضات روم میں پہونچا تو شام، مصر، اور دیگر مشرقی حصص میں دیانت مجوس نے اعتقادی درجہ پایا، اور جب رُومیوں کو فتح نصیب ہوئی، تو کرمان و خراسان میں مسیحیت کے دائرہ اعتقاد کو وسعت ہوئی۔

سلطنت روم اسوقت شام، مصر، اور شمالی سواحل افریقہ تک پھیلی ہوئی ہے، جو رومیوں کے جغرافیائی معلومات کے حدود آراضی یہی ہیں اور ان حدود سے باہر اُن کے معلومات ویسی ہی غیر یقینی اور ہوائی تھے جسطرح آج ہمارے معلومات مریخ اور زہرہ اور وہاں کے باشندوں کی بابت اسیطرح فارسیوں کے معلومات بھی اوسی دنیا تک محدود تھے جو اُن کی کاروباری نقل و حرکت کی دُنیا تھی، علوم و فنون کی صلاحیت بجز چند نفوس ذاکیہ و اشراف کے کسی میں نہ تھی،

الغرض ابھی قدیم روم خراماں خراماں وہ منازل زندگی طے کرتے جاتے تھے کہ دفعتہً اسلامی فتوحات کا سیلاب اُمنڈتا ہوا آیا،

اور قیصر و کسرے کی سلطنت کو تاخت و تاراج کرتا ہوا نکل گیا،

اب وہی ملک جو قیصر و کسرے کے دور حکومت میں ایک کفدست اور خاک بسر میدان تھا، عربوں نے اُسے سرسبزی میں چمن زار بہشت کا نمونہ بنا دیا، وہاں اصلاحات کے وہ وہ گل کھلائے کہ بلبل سدرہ کو وجد آیا، انتظام و سیاست کی وہ نہریں نکالیں کہ انہیں کوثر سے ملا دیا، غرضکہ نظم و نسق، ترقی و تہذیب کی ان آرائشوں سے اوسے سنوارا کہ تاریخ اوّلین میں اوس سے ایک ایسے روشن باب کا اضافہ ہوگیا، جس کے مقابلہ میں عہد ماضی کی تمام ترقیاں اور کارنامے بجز اہل بابل فینیقین۔ اور مصریوں کے تاریک پڑ گئے،

ان کے سوا جن قوموں کو خاص طور سے اسلام کے سایہ عاطفت اور دامن تربیت میں پرورش پانا، قابل رشک اور محسود خلایق زندگی بسر کرنا، اور جگ جگ جینا نصیب ہوا، اون کا ذکر ہم علی التفصیل کریں گے،

(باقی آیندہ)

"خانخانی" ندوی

محض ان واقعات اور نتائج سے جو ابتک ظہور میں آئے عورت کی طبیعت کا فیصلہ کر لینا بڑی غلطی ہے۔ یہ فیصلہ صرف اسوقت جائز ہوسکتا ہے جب عورت مرد کی طرح اپنی حریت کی مالک ہو۔ یہ خیال کہ فزیالوجی کی تحقیقات سے دونوں میں کچھ فرق معلوم ہوتا ہے استدلال کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کون ادنے ہے کون اعلیٰ۔ یہ فیصلہ اس حالت میں درست ہوسکتا ہے کہ عورت کو بھی اتنا ہی وقت ملے جتنا مرد کو اپنی دماغی تربیت کیواسطے ملا ہے اور وہ تعلیم حاصل کرے۔ پروفیسر جیک لوربیٹ

کلامِ نادر

دل بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھکر　　　رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھکر
ساحلِ جولانگۂ امواج پر شکلِ حباب　　　دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھکر
دشتِ غربت میں چلا ناحق میں بستی کیطرف　　　کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھکر
لاکھ میں آنکو بہلاتا ضبط کرتا ہوں مگر　　　دل بھر آتا ہی پہلو اپنا خالی دیکھکر
کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستی موہوم کا　　　بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھکر
اب کہاں وہ نوجوانی اور کہاں جذباتِ عشق　　　پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھکر

عشق کا نادر کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھکر

نہ دی دم لینے کی فرصت مجھے صدمات پیہم نے　　　ہوا اک غم سے چھٹکارا کہ گھیرا دوسرے غم نے
نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں باغ میں کم تھیں　　　مجھے تکلیف دی ناحق چمن پیرا عالم نے

فغاں شب بھر جو میں تکلیف مہجوری سی کرتا ہوں
برا کرتا ہوں لیکن سخت مجبوری سی کرتا ہوں

نادر علیخاں نادر کاکوری

رباعی

کی شیخ حرم نے سبحہ خوانی شب بھر　　　پنڈت نے کہیں کتھا بکھانی شب بھر
ہو حق کے سوا کوئی حقیقت نہ کھلی　　　رٹتے رہے سب رام کہانی شب بھر

ثاقب

انسان فرشتہ کی عینک سے

ایک نوعمر فرشتہ جو ہنوز ملاءِ اعلیٰ کی انتہائی تعلیم سے فارغ ہوا تھا اور جسے بنابراں نہ ابھی کوئی ڈگری ملی تھی اور نہ کوئی خدمت تقدیس۔ تحمید وغیرہ کی عطا کی گئی تھی۔ سنٹرل عرشیہ کالج کی موسمِ برشگال کی تعطیل میں اپنے چیف پراکٹر مہتر فصطاعیل کی اجازت سے چند ہفتے دنیا کی سیر کرنے کی غرض سے رفعت کورٹ سے جو ذوالجلال بورڈنگ ہوس کا ایک نہایت پر فضا حصہ ہے روانہ ہوا۔ یہ متین متعلم فرشتہ دوستوں کا بہت وسیع دائرہ نہ رکھتا تھا۔ پھر بھی اس کے ہم مذاق چند دوست فرشتے ایسے تھے جنھوں نے روانگی سے پہلے اسے ایک مختصر الوداعی ڈنر دیا۔ فرشتوں کو زیادہ بولنے چالنے کا شوق نہیں ہے تاہم ایک آدھ ڈنر اسپیچ ہونی ضرور تھی۔ فورتھ ایر کلاس کا طالبعلم فرشتہ طرفیل نامی روحانی چیئرز کی گونج میں اپنی نورانی کرسی پر سے اوٹھا اور شام کے مہمان کا جامِ صحت تجویز کرتے وقت اسطرح گہر افشاں ہوا

فضائے عرش کے نوعمر مکینوں کی زندگی میں آجکا دن تاریخ جاوید کا ایک نیا ورق اوٹے گا کیونکہ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے حضرتِ انسان کے مطالعہ کے قصد سے دنیا کے دور دراز سفر کی اولوالعزمی اختیار کی ہو۔ ہمارے مقدس بزرگ مہتر جبرائیل کو عالم خلق میں تشریف لے گئے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا اور اب ادن سے دنیا کی کوئی تازہ خبر نہیں ملتی۔ ہمارے دوسرے مقدس بزرگ حضرات عزرائیل ہر روز ہر گھڑی۔ ہر لمحہ۔ وہاں آتے جاتے

رہتے ہیں مگر اونکا کارِ منصبی گو بہت اہم ہے تاہم محدود ہے اور چونکہ اون کے محکمہ کی کل کارروائی کانفیڈنشل ہے اس لیے ہم لوگوں کو اوسکا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ہم نوعمر فرشتوں میں سے کوئی اولوالعزم کمر ہمت باندھے اور دنیا میں جاکر وہاں کے حالات قلمبند کرے۔ میں اپنے معزز دوست شرقیل کو اون کے نیک ارادہ پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں اور بے انتہا مسرت اور شوق قلبی سے اونکا جام صحت تجویز کرتا ہوں"

بڑے جوش اور سرگرمی سے یہ جامِ طہورا نوش کیا گیا۔ اب سب کی آنکھیں ظریف زشطیل کیطرف اوٹھیں جنھوں نے لوگوں کے استعجاب اور حیرت کی حالت میں انسان کا ٹوسٹ پروپوز کیا اور اوسکی جلو میں حسب ذیل تقریر کی":-

"مجھے انسان کا جام صحت پیش کرنے کا خاطر خواہ حق حاصل نہیں ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جہانتک مجھکو صحیفہ اعظم کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے انسان کا تعلق فرشتوں سے کم ہے مگر حوروں سے زیادہ ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان کو ہم سے تعلق پیدا کرنے میں سراسر تکلیف ہے بیچارے کو فاقے دیے جاتے ہیں یہ لالچ دے کر کہ تجھ میں ملکوتی صفات پیدا ہو جائیں گے سونا کم کر۔ کیونکہ فرشتے سوتے نہیں۔ ہنسنا بولنا چھوڑ دے اسلئے کہ فرشتے متین ہوتے ہیں۔ دن رات تسبیح لیے بیٹھا رہ۔ اس لیئے کہ فرشتے بھی دن رات تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اب آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ انسان کو کیا پڑی کہ اپنی جان پر یہ سب مصیبتیں لے۔ صرف اس لیے کہ ہم سے تھوڑی بہت مشابہت پیدا کرے۔ ہم میں سے بعض تو اوس کے جانی دشمن ہیں جو اوس کے کندھوں پر بیٹھ کر اوسکا کچا چٹھا لکھتے

رہتے ہیں۔ بڑے اباجان حضرات عزرائیل سے تو ہر انسان کی روح کانپتی ہے (سنو سنو) بھلا پھر انسان ہمیں کسطرح اچھا سمجھ سکتا ہے۔ اور جب یہ حالت ہے تو ہمارا اوسکا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ (افسوس افسوس) البتہ پرے پار کے لطیف طبقہ سے جنھیں حوریں (چیرز) کہتے ہیں انسان کے دل کو بہت لگاؤ ہے۔ اصل وجہ تو سمجھ میں نہیں آتی (اور اگر پیارے شرقیل دنیا کے سفر میں صرف ایک اسی راز کا پتہ لگا لایا تو ہم سمجھیں گے کہ اوسے کافی کامیابی ہوگئی) مگر ہاں قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان میں لالچ کا مادہ بہت ہے اور حوریں شاید کچھ بڑی نعمت کی چیز ہونگی۔ نماز پڑھو تو جنت میں حوریں ملیں گی نیچی نگاہ کرکے چلا کرو۔ حوریں ملیں گی۔ یہہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی۔ وہ نہ کرو تو حوریں ملیں گی وغیرہ وغیرہ (قہقہہ) اب نہیں معلوم حوروں کے کسقدر پہلو ہیں کہ ہر کام کے کرنے یا نہ کرنے پر اونکا ایک نہ ایک پہلو بطور انعام کے انسان سے پیش ہوسکتا ہے (قہقہہ) افسوس میرا بیان غیر مکمل بلکہ گونہ مہمل ہے اس لیے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے انسان بھی دو طبقوں میں منقسم ہے۔ ایک غالباً کثیف اور دوسرا حوروں کیطرح لطیف۔ پھر یہہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہماری حوریں انسان کثیف کو ملیں گی تو حوروں نے کیا قصور کیا ہے۔ اور اگر انسان لطیف کو ملیں گی تو بات ہی کیا ہوئی۔ (سنو سنو)

پیارے شرقیل ضرور اسکا پتہ لگائیو۔ (چیرز)۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھکر پھر بھی جو میں انسان کا جام صحت تجویز کرتا ہوں اوسکی یہہ وجہہ ہے کہ سنتے آئے ہیں کہ جب حضرت انسان پیدا کیا گیا تو ہمارے سب بزرگوں سے اوسے سجدہ کرایا گیا اور سوا اون بزرگ کے۔ (توبہ توبہ اب ہم میں سے

کوئی بھی اونہیں بزرگ کہنے کا مجاز نہیں ہے۔) سب نے سجدہ کیا۔ سجدہ نہ کرنے پر وہ بارہ پتھر باہر کیے گئے اونکا (ایفی جی) بت جلایا گیا اور دفتر قدم میں درج ہے کہ تعزیرات قدس کی شدید ترین دفعہ کی انتہائی سزا اونہیں دی گئی (نعرہائے لاحول لاحول) پھر کوئی بات تو ہے جو ان کو یہ شرف بخشا گیا (ضرور ہوگی ضرور ہوگی) عقلمند شرقیل کیا تم اپنے سفر میں اس معمہ کو بھی حل کر لوگے؟ اس تقریر کا جسمیں ہرچند ظرافت شامل تھی۔ حاضرین جلسہ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ مجوزہ جام نوشی جاں کرتے وقت بعض معمر اور رمز شناس فرشتوں نے تو گردنیں تک جھکا لیں۔ یہ جلسہ بڑی خیر و خوبی کے ساتھ برخاست ہوا۔ اور اس کی روداد موتیوں کے حرفوں میں چھاپی گئی راوی لکھتا ہے کہ باوجودیکہ ہر طرح اہتمام کر لیا گیا تھا کہ یہ باتیں سوائے فرشتوں کے اور کسیکو معلوم نہوں مگر کسی نہ کسی طرح اس روئداد کی دو چار کاپیاں ایجال ایکڈیمی کے پردہ راز کے اندر پہونچ گئیں جس سے حوروںمیں سرگوشیاں ہونے لگیں ÷

اتفاق وقت جب یہ پرچے حوروںمیں پہونچے تو میوزک (موسیقی) کا گھنٹہ ختم ہو کر کالج بند ہوگیا تھا اور حوریں بناؤ سنگھار کرنے اپنے اپنے کمروں پر جا رہی تھیں۔ وہاں سے بعض ٹنیس[ا] کھیلنے آتیں بعضی سیدھی رنک میں جاتیں۔ یہ پڑھکر کہ انسان حوروں کا بہت مشتاق ہے بعض خوش ہوئیں۔ بعض چیں بہ جبیں ہوئیں۔ بعضوں نے آج بناؤ سنگار اور اچھی طرح کیا۔ نئی ٹائیاں نئے ربن (فیتے) نئے پھول لگائے اور لیونڈروں کی شیشیاں کی شیشیاں لنڈھا دیں (مخفی نرہے کہ کچھ عرصہ سے حوروں میں بناؤ سنگھار کا کوڈ ترمیم

ا ایکقسم کی لوہے کی کھڑاویں سی ہوتی ہیں اونکو پاؤں میں باندھکر ناچتے ہیں۔ ۱۲۰

ہو گیا ہے۔ پُرانی حوروں کو تو ابتک کنگھی چوٹی سُرمہ مسی وغیرہ کی اجازت ہے۔ لباس میں بھی قدامت پسندی کا عیب ہے بے جوڑ گنواری گہرے رنگ۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے۔ جَل جَل کرتے ہوئے پیجامے گھستے جوتے اب تک کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ مگر ماشاء اللہ نئی حوریں فیشن کی موجد ہیں۔ اور خدا دے اور بندہ لے آئے دن نت نئی تراش خراش نکالتی رہتی ہیں۔ جن حوروں کو انسان سے وابستہ ہونیکا خیال ناگوار گذرا۔ انہوں نے بالکل بناؤ سنگھار نہ کیا۔ اور نہ کھیلنے گئیں رو رو کر آنکھیں سجھا لیں اور کسی ایک سے تو نماز مغرب بھی وقت پر ادا نہ ہوئی۔ روٹر کا خاص نامہ نگار لکھتا ہے کہ اونہوں نے کوئی کانفدنیشل میموریل تیار کیا تھا۔ اور سپر کمیشن بیٹھا تھا جسکی رپورٹ بھی تیار ہوئی تھی مگر سوائے ان چند احکامات کے اور کوئی بات پبلک نہ کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(الف) منظور کیا گیا کہ جو حوریں الجمال اکیڈمی کی ڈگری ہولڈر ہیں اور جنھوں نے کوئی سے دو مضمونوں میں آنرز کے ساتھ امتحان پاس کیا ہے وہ ایسے انسان کو رد کر سکتی ہیں جو بدتمیزی سے کھنکارتا ہو۔ زور سے ڈکار لیتا ہو۔ اکڑوں بیٹھتا ہو۔ کھُجاتا ہو۔ سوتے میں خراٹے لیتا ہو۔ تھوکتا ہو۔ جمائیاں بہت لیتا ہوں۔ اونگلیاں چٹخاتا ہو۔ انگڑائیوں کے ذریعے جمناسٹک کرتا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

(ب) جائز ہوگا کہ حوریں قبول کرنے پر خود انسان کا لباس تجویز کریں مگر کسی حال میں وہ کنٹوپ نہ اوڑھ سکیگا۔ اور نہ ادھوڑی استر کی جوتی پہن سکے گا +

(ج) ڈاڑھی کے متعلق مقراض الحکمت حضرت بسنریل (انگریزی لفظ بیرنر)

یعنی قینچی سے شتق ہے علحدہ رپورٹ دینگے اور تونے اور خاکے پیش کریں گے۔ واضح ہو کہ لبوں کا مسئلہ بھی ڈاڑھی کے مسئلہ اعظم کا ایک جسزو ہے +

(د) ہر انسان ہر حور کو ٹوپی اُتار کر سلام کرے گا۔ بازار میں اوس کے سیئے راستہ دیدیگا اور آپ پیچھے ہٹ جائیگا۔ ضرورت ہوگی تو اوسکی رکشا کے ساتھ پیدل چلے گا۔ گھوڑے پر سوار کرے گا۔ نیز اتاریگا۔ غرض پبلک اور پرائیوٹ ہر موقعہ پر اوسکا ادب اور لحاظ کرے گا۔

(ہ) کوئی حور کسی ایسے انسان کے ساتھ بال میں رقص نہ کرے گی جو چندلا ہو۔ یا کانڑا ہو۔ یا بھینگا ہو۔ یا گنجا ہو۔ یا گندہ دہن ہو۔ یا جسمیں پسینہ کی بُو آتی ہو + یا جسے بغل گند ہو یا جسکے پھنسی پھوڑے ہوں یا جس کے داد ہوں۔ یا جسکے دانت میں کیڑا لگ گیا ہو۔ یا بلا وجہ بھی کوئی سی نو حوروں میں سے پانچ حوریں یعنے آدھی سے زیادہ اوس انسان کو اپنی معیت اور ہمرکابی کا اہل نہ گردانیں۔

(و) کوئی انسان کسی حور کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر نہ دیکھیگا۔ نہ اوس کے لباس کی خوشبو پر دیوانہ بنے گا۔ اور نہ پیچھے مڑ کر۔ یا کن انکھیوں سے دیکھے گا +

خیر یہ سب باتیں تو قرین قیاس نہیں ہیں۔ مبالغہ سے بہت کچھ لبریز معلوم ہوتی ہیں اور غالبًا ایسے شخص کے فکر کا نتیجہ ہیں جو انگریزی تہذیب کا دلدادہ شیدا ہے اور جس کے دلمیں میمیں کھُب گئی ہیں۔ خدا کرے پڑھنے والے بھی انکا یقین نہ کریں اور گناہ میں شریک نہوں۔ البتہ آگے چل کر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ ہر کہ ومہ کے واسطے قابلِ غور ہے +

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ یوں سمجھ لو کہ مسٹر شرتیل دنیا کے سفر سے ملاء اعلیٰ پر واپس پہونچ گئے۔ فرض کرو کہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر آئے تھے اور اوسی پر واپس گئے۔ اونکا استقبال اور اون کی آؤ بھگت اون کے دوستوں نے دل کھول کر کی ہوگی۔ مگر ہمیں اس کے متعلق کچھ لکھنا منظور نہیں ہے۔ ہمارا تعلق زیادہ تر اوس اسپیچ سے ہے جو اونہوں نے فرشتوں اور حوروں کے پبلک جلسہ میں جو خاص اسی غرض سے منعقد کیا گیا تھا ادا کی۔ وادی قدس کا وسیع اور خوش منظر پارک اس اوپن ایر میٹنگ کے واسطے چمن زار جناں کا ہم پلہ بنا دیا گیا تھا۔ سوائے مقام انس کی اُن چند روشوں کے جو نازنینان الجمال اکیڈمی کے گلگشت کے لیے مخصوص کردی گئی ہیں۔ یہ سارا وسیع میدان وقت سے پہلے فرشتوں سے پٹ گیا تھا۔ اس جلسۂ عام میں حوروں کو خاص پردہ کے اہتمام کے ساتھ بھی شریک ہونے کی اجازت بڑی کوشش سے وقت کے وقت ملی تھی۔ تاہم کارپردازان میٹنگ نے پلیٹ فارم کے دائیں طرف قطار در قطار نورانی نازک کرسیاں طبقہ لطیفہ کے واسطے اس سلیقہ سے بچھائی تھیں کہ نگاہ اونپر کیطرف پڑتی تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے کوئی پانچ منٹ پہلے صوت سرمدی کی ہم آہنگی کے ساتھ حجابِ عصمت میں مستور تمام نازنینانِ الجمال اکیڈمی اپنی اپنی کرسیوں پر جلوہ افروز ہوگئیں۔ اللہ جمیلٌ ویحب الجمال۔

فرض کرلو کہ جلسہ کا پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ چیرز کے ساتھ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوا۔ اسپیکر کا حاضرین سے مزید تعارف کرایا اور اوسے تقریر کرنے کی اجازت بلکہ دعوت دی۔

بنابر آن مسٹر شرقیل میفرماید

"جناب صدر انجمن صاحب۔ و دیگر حاضرین جلسہ" میری واپسی پر جو محبت اور شفقت کا برتاو آپنے میرا خیر مقدم کرنے کی صورت میں میرے ساتھ کیا ہے اول اوسکا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمجھے جو کچھ حالات اپنے سفر کے بیان کرنے ہیں اونمیں ایک بڑی دقت یہ ہے کہ ہمارے پاس حضرت انسان کی کل باتیں بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں ہیں سینکڑوں باتیں ایسی ہیں جو نہ میں بیان کرسکتا ہوں اور آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میرا قصد تھا کہ کچھ تصویریں اور خاکے اپنے ہمراہ لاؤں مگر دنیا کی چیزیں یہاں تک پونہچ نہیں سکتیں۔ اس لیے میں ہار کر اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر سامنے کی پردہ والیوں میں سے ایک نوعمر جان اس اسٹیج پر تھوڑی دیر کے واسطے میرے پاس آکھڑی ہو تو میں شاید کچھ باتیں بیان کرنے میں کامیاب ہوں۔

جلسہ میں اس بات پر اتفاق اور اختلاف دونوں ہوے مگر کثرت رائے سے پردہ والیوں سے درخواست کی گئی اور جو حور وہاں لیڈی سکریٹری کی خدمت پر ممتاز تھی اوس کی اجازت سے ایک ہوشیار، ذہین اور چلبلی حور۔ کچھ شرماتی ہوئی کچھ مسکراتی ہوئی اپنا لباس اور زیور درست کرتی ہوئی شرقیل کے پاس نیچی نگاہ کرکے آن کھڑی ہوئی +

شرقیل نے آتے ہی اوسے مودبانہ سلام کیا جس میں اشتیاق آمیز مسکراہٹ شامل تھی۔ اور اسطرح کہنا شروع کیا۔

معزز حاضرین۔ حضرت انسان کا کل راز اوس کے اون تعلقات میں پوشیدہ ہے جو اوس کے دونوں طبقوں میں ایک ساده دستور کے ساتھ ہیں

مجھے پہلے یہ کہنا چاہیئے تھا کہ انسان دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک کرخت محنتی۔ بہت چلتا پھرتا بہت بولتا چالتا یوں ہی اناپ شناپ۔ لڑتا بھڑتا اور اسی قسم کی کیفیات کا مرکز ہے۔ اوسے مرد کہتے ہیں۔ دوسرا فرقہ نازک۔ حسین۔ کم گو۔ کم حرکت۔ صلح کل محبت والا بنایا گیا ہے جسے عورت کہتے ہیں مردوں کو فرشتوں سے اور عورتوں کو حوروں سے تشبیہ اس لیے نہیں دیجاتی کہ وہاں مرد اور عورت ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ملتے جلتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ پیار اخلاص سے رہتے ہیں اور انہیں ایک پاک جذبہ جسے وہ عشق کہتے ہیں ایسا زبردست ہوتا ہے جو اون دونوں کو یکجان دو قالب کر دیتا ہے مگر یہاں ہماری حالت دوسری ہے۔ اس لیے ہم اون کے معاملات اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ اب آپ صاحب ملاحظہ فرمائیے کہ یہ میرے پاس کھڑی ہیں مگر انہیں میری طرف جھکنے کا میلان نہیں ہے۔ نہ انکا جی یہ چاہتا ہوگا کہ اپنے بالوں اور کپڑوں کی خوشبو شرقیل کو سنگھاؤں نہ انکا دل اسکا کو ڈھونڈھتا ہوگا کہ میں ان کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر نرمی سے دباؤں۔ اور آنکھوں کو لگاؤں یہ کب گوارا کریں گی کہ میں اپنے ہاتھ پھیلاؤں اور یہ بھی پھیلائیں اور ہم دونوں . . . . اور یہ بات دیکھنی تو آپ کے مقدس جلسہ کو نصیب ہو ہی نہیں سکتی کہ یہ اپنے . . . کو ان کے . . . کیطرف عاجزانہ سعی کے ساتھ رجوع کردیں اور اول تو یہ رکیں جھجکیں ہٹیں۔ مگر پھر ایک لمبا سانس بھر کر آنکھیں بند کرلیں اور پہلے میرے . . . کے عمل کو پورا ہونے دیں اور پھر گو اوسی رفتار سے نہیں مگر پھر بھی قریب قریب اوسی رفتار سے میرے . . . . کو بھی اپنے . . . . کے احساس سے عزت بخشیں۔

حضرات! اس طرز عمل کو انسانوں کی زبان میں پیار کہتے ہیں۔

(چیرز چیرز۔ کرکے دکھاؤ۔ ادا کرکے دکھاؤ)

حد بالکل ستم ہوگئی۔ شرقیل نے ...... کے کچھ کٹکھنے کیئے مگر بھونڈے بھدے۔ حور کو پسینہ آگیا اور وہ کچھ کھسیانی سی ہوکر اسٹیج پر سے اُتر گئی اور پردہ میں چلی گئی۔ مگر یہ عجب بات سب فرشتوں نے نوٹ کی کہ پردہ میں داخل ہونے سے پہلے اس گھبرائی ہوئی حور نے کوئی آدھا چوتھائی مڑکر شرقیل کو ایک دفعہ دیکھا اور پھر نیچی نگاہ کرلی ✣

حضرات۔ آپ مجھ سے ناراض ہونگے کہ شرقیل بڑے بڑے وعدوں کے ساتھ دنیا میں گیا تھا مگر وہاں سے معلومات کا بڑا ذخیرہ نہ لایا۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے سوائے اس ایک بات کے جسکا مینے ذکر کیا کچھ نہ ملا۔ اگلے وقتوں میں تو جو کچھ ہوتا ہو وہ ہوتا ہو مگر اب کی تو میں کہتا ہوں کہ انسان نہ خدا کو پوجتا ہی نہ حور و قصور کے خیال میں ہے۔ ایک اور محض ایک مشغلہ ہے اور وہ مشغلہ مرد۔ عورت۔ یا عورت مرد کے لقب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

غزل

"بقلم نسائی"

وہی احسانِ وحشت ہے مرے حالِ پریشاں پر
وہی دستِ جنوں کی مہربانی ہے گریباں پر

تری حسرت چلی جاتی ہے کلفتہائے ہجراں پر
ترے ارمان باقی ہیں ہجوم یاس و حرماں پر

اب اُمید شفا ہی مٹ گئی۔ اب کیا بھلا ہوگا
اس طرز تغافل کو اُٹھا رکھ طاقِ نسیاں پر

کبھی طول مرض بیمار کا دل توڑ دیتا ہے
کبھی خبطِ شفا مجبور کر دیتا ہے درماں پر

ابھی تھوڑی بہت اُمید باقی ہے ترحم کر
ابھی ارمان کا اطلاق ہوسکتا ہے ارماں پر

جو ممکن ہو تو اب کلفت نصیبوں کی خبر لیجئے
اضافہ یاس کا ہونیکو ہے غمہائے ہجراں پر

وہی ناکامئ پیہم مآل کار کوشش ہے
وہی مایوسیاں چھائی ہوئی ہیں دل کے ارماں پر

تم آزادِ حزیں نوبت میں کیوں گھبرائے جاتے ہو
جہاں تک ہو نظر رکھو خدا کے فضل و احساں پر

ازاد سہارنپوری

جوانی اور غم

جوانی :- ہو دور کہیں اے غم — دکھلا نہ مجھے صورت

ہے صاف جبیں میری — پُرنور میری آنکھیں
کس طرح دمکتی ہے — سُرخی مرے گالوں میں

اعضا میں بھری میرے — طاقت بھی ہے صحت بھی
دل بھی ہے مرا ہلکا — ہے شاد طبیعت بھی۔

میرا نہ تعاقب کر — چل دور پرے ہٹ جا
لے چھوڑ میرا پیچھا — ساتھی ہو بڑھاپے کا"

غم :- اِک دوست کی صورت سے — نفرت ہے تجھے اتنی
نافہم ہے تو کیسی — نادان ہے تو کتنی

سُرخی ترے گالوں کی — یہ تجھ کو مبارک ہو
دھندلا نہ کروں گا میں — پیاری تری آنکھوں کو

نقصان کا تیرے ہاں — درپے نہیں اصلا میں

سکھلاؤں گا اے پیاری ——— سچا تجھے ہونا میں

جوانی: ہو دور کہیں اے غم ——— بھاتا نہیں تو مجھ کو

میرے دل روشن کو ——— دکھلاتا ہے تاریکی
بتلا تو ہی مجھ سے ——— کیوں ضد ہے تجھے اتنی

سیاہی مری زلفوں کی ——— جادو رنگ اے غم۔
اس مشک کو میرے تو ——— کافور نہ کر اے غم!

غم: اس وقت تجھے مجھ سے ——— ناصح کی ضرورت ہے۔

مغرور ترے دل کو ——— ہونے نہیں دوں گا میں
یہ سخت ہے پتھر سے ——— موم اس کو کروں گا میں

ہمدردی انساں سے ——— واقف تجھے کر دوں گا
اور مہر و محبت سے ——— دل کو ترے بھر دوں گا

[illegible] انساں بھی ——— پیاری تجھے خوش رہنا
کیا چاہتی ہے دل سے ——— نیکی کو بھلا دینا

جوانی — ہو دور کہیں اے غم — دکھلا نہ مجھے صورت

کیوں اشک فشاں ہوں میں — جبتک کہ جواں ہوں میں
میرے لیے دنیا میں — دل چسپیاں لاکھوں ہیں

کچھ دن تو مجھے اے غم — تو لطف اٹھانے دے
چاہے ہر چند اسیری — ہے استدعا تجھ سے"

غم — نافہم جوانی تو — واقف نہیں کیا مجھ سے
مالک ہوں میں دنیا کا — قبضہ میں ہے یہ پیری

میرے ہی سبب سے ہے — سوزش یہ محبت میں
باعث ہوں ترقی کا — میں عیش کی لذت میں

کام آئیں گے پیری میں — غم تیری جوانی کے
یہ تجھ کو بڑھاپے میں — دیں عقل بتائیں گے"

سید علی حیدر زیدی

رباعی

دنیا کا عروج کیا ہے پستی کیا ہے — صحرا کیا چیز اور بستی کیا ہے
کہتا ہے جسے زمانہ ہستی ہستی — ابتک نہ کھلا اسکی ہستی کیا ہے ([illegible])

میل ملاپ

(جولارڈ ایوبری کی ایک تصنیف سے ماخوذ ہے)

ہم کو اس بات پر ناز ہے کہ آجکل ہر شخص کا مکان اس کا قلعہ ہے۔ اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ ناز ایک حد تک بہت بجا ہے۔ مگر حقیقت میں یہی کافی نہیں ہے۔ مکان کے لیے قلعہ ہونے سے بدرجہا زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ گھر بھی ہو۔ ہر ایک مکان کو قلعہ تو قانون اور پُرامن سلطنت نے بنا دیا ہے مگر اسکو گھر بنانا اس کے رہنے والوں کا ذاتی کام ہے۔ لیکن آخر مکان اور گھر میں فرق کیا ہے؟ کیا یہ دونوں لفظ ہم معنی نہیں ہیں؟ کیا ان دونوں کا مفہوم جدا جدا ہے۔ ہاں مکان تو صرف انسانی رہائش گاہ کا نام ہے اور اسکے لئے اور کبھی معنوی صفت اور اندرونی خوبی کی ضرورت نہیں۔ مگر اسکے گھر ہونے کے لیے یہ بات بھی لازمی ہے کہ اسکے مکینوں میں محبت ہمدردی اور اتحاد ہو۔

ایک چار دیواری میں محصور زمین کا نام گھر نہیں ہے۔ بلکہ گھر وہی ہے جسکو بچپن کی پیاری پیاری باتوں کی یاد۔ لڑکپن میں ہمجولیوں کے ساتھ کھیل کود کے خیال اور جوانی کی دلخوش کن امنگوں اور تمناؤں کے تصور نے دلکش اور دلربا بنایا ہو۔ ماں باپ کی شفقت۔ بہنوں کی ناز برداری اور پیار بھائیوں کی محبت اور ہمدردی اور سب گھر والوں کی باہم یگانگت۔ اور یکجہتی۔ غمخواری اور دلداری نے اسکو پاک کیا ہو اور اسمیں برکت دی ہو۔ گھر کے لیے سب سے پہلی چیز محبت ہے اور جب تک محبت نہو وہ خواہ قلعہ ہو

محل۔ مگر گھر تو نہیں ہو سکتا جس گھر میں محبت نہیں ہے وہ اس جسم کی طرح ہے جسمیں جان نہیں ہے اور ایسا گھر گھر کہلانے کا اتنا ہی مستحق ہے جسقدر بے جان لاش انسان کہلانے کی۔

آجکل گھر امن اور حفاظت کا قلعہ ہونے کی وجہ سے قابل قدر نہیں ہے ہم اس لیے اپنے گھر سے محبت نہیں کرتے کہ اس کے حصار میں ظالموں کے ظلم اور ستم شعاروں کی دار و گیر سے پناہ ملجاتی ہے۔ بلکہ اسواسطے کہ اسکی چار دیواری میں دنیا کی بے مہریوں اور زندگی کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے ایک گونہ نجات حاصل ہوتی ہے۔ اور اسکی حرم محترم میں بحر ہستی کے جانکاہ طوفانوں اور روح فرسا موجوں سے کسقدر امن مل سکتا ہے۔ دنیا میں خوشی دولت اور کامیابی پر موقوف نہیں ہے۔ دولتمند سے دولتمند اور کامیاب سے کامیاب شخص کو بھی اکثر موقعوں پر حصول مسرت کے لیے ایک ایسی شے کی حاجت ہوتی ہے جسے دولت نہیں خرید سکتی اور جس کا بدل کامیابی نہیں ہو سکتی۔

انسان میل ملاپ کا اتنا محتاج ہے کہ وہ دنیا تو دنیا جنت میں بھی اکیلا نہیں رہ سکتا اور نہیں تو تلاش معاش اور ضروریات زندگی اسے دنیا کے دور دراز حصول میں لیجاتی ہیں۔ اسے شہر شہر اور ملک ملک میں پھراتی ہیں۔ مگر اس کا دل ہمیشہ اس کے گھر میں ہی پڑا رہتا ہے۔ اور اسکی آنکھیں ہمیشہ وطن ہی کیطرف لگی رہتی ہیں حقیقت میں ہم نہ بالکل تنہا زندگی گزارنے کیلئے بنے ہیں نہ ہر وقت گھر میں پڑے رہنے کے لیے۔ ہمارے لیے دونوں باتیں مفید ہیں۔ نہیں خالی مفید ہی نہیں بلکہ ضروری اور لازمی ہیں۔ اور دنیا میں کامیاب اور پر مسرت زندگی بسر کرنے کے واسطے دونوں باتوں کے مناسب اور معتدل استعمال کی ضرورت ہے

قدرت کی دلچسپیاں اور کائنات کی دلربائیاں تو کبھی کم نہیں ہوتیں اور سب کے لیے یکساں پیش کی گئی ہیں۔ مگر جب تک دل میں خوشی کا اجالا نہو تب تک سورج کی روشنی کے باوجود بھی دنیا اندھیر ہے اور جب تک طبیعت مسرت اور اطمینان سے شگفتہ نہو۔ تب تک باد بہار کے جھونکے اور پھولوں کی شگفتگی بیکار ہے ہمارے دل میں عزت۔ الفت اور یگانگت کے خیالات گھر اور گھر والوں کیوجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر تمدن کی بنیاد اور تہذیب کی جڑ ہے انسانی طبیعت کے تمام اوصاف پسندیدہ اور صفات حمیدہ کا سب سے پہلا اور سب سے آخری سبق ہے۔ اس سے ہمارے عمدہ جذبات میں ترقی اور ہماری اعلیٰ خواہشات میں ترقی پیدا ہوتی ہے۔ غرض اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انسان کو انہی تعلقات خانگی نے انسان بنا دیا ہے۔

گھر کیسا ہی ٹوٹا پھوٹا اور کتنا ہی شکستہ اور خراب حال کیوں نہو۔ گھر پھر بھی گھر ہے اور فرض اور محبت کی زنجیریں ہم کو اس سے جکڑے ہوئے ہیں اور اس دلچسپ فرض کی ادائےگی میں جتنی مشکلیں زیادہ ہونگی اسیقدر اسکا اجر بھی بیش بہا ملیگا حقیقت میں سخت سے سخت محنت اور مشکل سے مشکل کام بھی اتنا جانکاہ نہیں ہے جسقدر کسی بیجا ناانصافی یا دلی بیچینی کو صبر اور تحمل کے ساتھ چپ چاپ برداشت کرنا غالب کا قول بالکل درست ہے

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانیکی

یہ جیتے جی کی قربانی ہے۔ دل و جگر کی بھینٹ ہے جس کے سامنے دولت۔ عزت۔ اور محنت سب ہیچ ہیں اسمیں شبہ نہیں کہ ایسے سنگدل بہت کم ہونگے جو جان بوجھ کر دوسروں کو ملول کرنا چاہتے ہوں۔ اور جو کوئی

ایسے ہیں ہی غالبًا ان تک اس مضمون کی رسائی مشکل ہے۔مگر بات یہ ہے کہ دنیا میں رنج وغم کا بہت بڑا حصہ سنگدلی سے نہیں بلکہ لاپروائی اور بے خیالی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملیں۔اور ہر ایک سے محبت آمیز گفتگو کریں اور سب سے خوشخلقی کا برتاو رکیں۔اپنے دوستوں اور عزیزوں سے دل ہی دل میں محبت کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ہمکو مناسب طور پر اسکا اظہار کرنا چاہیئے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری ذراسی لاپروائی بے توجہی اور کج ادائی ان دلوں کو صدمہ پہنچا دیتی ہے۔جن کا پاس خاطر ہمکو سب سے زیادہ منظور ہے۔اور جن کی اعانت او ہمدردی ہمیشہ ہمارے مد نظر رہتی ہے۔ہم خود اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ سکتے ہیں کہ زندگی میں کتنی مرتبہ دلجوئی اور تشفی کے صرف چند لفظوں سے ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر بندھ گئیں ہیں اور پست شدہ حوصلے پھر بڑھ گئے ہیں۔اس لیے اکثر رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

ترا بہ لطف زبانی بہ من مضائقہ چیست

چو میتوان بہ دلاسا شگفتہ کرد مرا۔

لارڈ چیسٹر فیلڈ لکھتا ہے "میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ شاید عام باتوں میں یا لوگ سب سے زیادہ اِس بات سے ناواقف ہیں کہ ان کو محبت کیونکر کرنی چاہیئے؟ اور نفرت کس طرح ؟ اکثر لوگ بیجا رعایت اور حد سے زیادہ چشم پوشی اور اعراض سے اپنی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔جن سے اونکو سب سے زیادہ محبت ہے۔اور بسا اوقات فرط نفرت میں اونکا بیجا غصہ اور بے موقع جوش خود انہی کے حق میں مضر ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں۔بلکہ اکثر ہم دوستوں اور عزیزوں میں رہکر بھی حقیقت میں بالکل تنہا ہوتے ہیں۔اور ان کی ملاقات اور محبت ہمارے لیے ذرا بھی مفید نہیں

ہوتی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے خیالات کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے جسمیں کوئی غیر کبھی داخل نہیں ہوتا۔ کتنے کو دوست ہیں مگر ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر۔ نام کو عزیز ہیں مگر ایک دوسرے کی خیالات سے ناآشنا ہر ایک اپنے اپنے دلمیں اپنے اپنے افکار کا بار اور اپنے اپنے رازوں کا طومار لیئے ہوئے ہے جس کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا جاتا۔ اور جنکو ان کی سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ اندرونی بیگانگی کا پردہ ایسا ہے کہ جب تک یہ نہ اُٹھے۔ تب تک باہم کسی قسم کی ہمدردی غمخواری اور دلداری ممکن ہی نہیں۔ غرض ہر شخص زبانِ حال سے یہی کہتا ہے کہ ؎

سراغِ یک نگاہِ آشنا از کس نے یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور ے ماند

لوگ بظاہر بڑے تپاک سے ملتے ہیں ہر قسم کی باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے موسم کی کیفیت فصلوں کی حالت۔ تمدنی مسائل سیاسی مباحث۔ غرض دنیا جہان کے جھگڑے سوائے ان چند باتوں کے جو ہر ایک دل میں سب سے زیادہ کھٹک رہی ہیں۔ مگر جنکا عزیز سے عزیز دوست اور قریبی سے قریبی رشتہ دار کے سامنے بھی لبتک آنا حرام ہے

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اپنی ہر ایک بات ہر ملنے والے سے کہتے پھریں۔ یا کوئی راز خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہو اپنے کسی ملاقاتی سے چھپائیں ہی نہیں۔ اگرچہ سچی دوستی اور دلی محبت تو اس کی متقاضی ہے۔ لیکن خیر ہمارا یہ مطلب نہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر کم سے کم اتنا تو ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے جو گفتگو احباب میں ہو وہ ایسے سرسری اور فضول امور کے متعلق نہو۔ جن سے نہ سننے والے کو کوئی فائدہ

کہنے والیکو کچھ حاصل۔ ضرور ہے کہ ہم اپنے روز کے ملنے جلنے والوں کے حالات و عادات سے واقف ہوں۔ پس کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ذرا سی کوشش سے اپنی گفتگو کو انکے مذاق کے موافق اور اون کے حالات کے مطابق بنالیں جس سے اونکی افکار میں کمی اور اون کی خوشیوں میں کچھ ترقی ہو۔ جس سے اون کی بھی طبیعت بہلے اور ہمارا بھی دل خوش ہو۔ کیا یہ بات اتنی دشوار ہے کہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر نطق کے دائرے میں سے اس فضول اور لایعنی گفتگو اور ان لچر اور بیکار مضمونوں کو نکالدیا جاوے جو آجکل اکثر ملنے جلنے والوں میں زیر بحث رہتے ہیں تو حیوانِ مطلق کی تعداد میں نہایت نمایاں کمی ہو جائے یہ امر مسلم ہے کہ بہت سے لوگ اپنی گفتگو کو دلچسپ اور دل آویز بنانا نہیں جانتے اور اسی سبب سے ان کی باتیں پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہیں مگر یہ نقص ذرا سی کوشش سے دور ہو سکتا ہے۔ ہمدردی فصیح و بلیغ الفاظ کی محتاج نہیں ہے محبت کے لیے چکنے چپڑے فقروں اور میٹھی میٹھی باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ایرانی نازک خیال کا قول بالکل درست ہے ؎

چون محبت درمیاں باشد تکلف گو مباش
شیرِ مادر در حلاوت بے نیازِ شکر است

لیکن سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اگر اور لوگ ایسا نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے تو سب سے پہلے ہمکو اسپر عمل کرنا چاہیئے۔ اگر ہمارے ملاقاتی ہم کو خوش کرنا نہیں چاہتے تو ہم کو اون نہیں خوش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارے احباب ہمارا دل نہیں بہلا سکتے تو ہم کو اون کا دل بہلانا چاہیے۔ اس میں کچھ زیادہ ایثار اور نفس کشی کی حاجت نہیں ہے

لیکن ہاں محض خیال ہی خیال اور آرزو ہی آرزو سے بھی کچھ کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے بھی تھوڑی سی تمیز۔ توجہ اور مشق چاہیئے۔ اور اسپر ہی کیا موقوف ہے دنیا میں کوئی کام ہو اچھا یا برا عمدگی اور خوبصورتی سے کرنے کے لیے ہر ایک میں انہی باتوں کی ضرورت ہے۔ خوش خلقی کے لیے تو لب ہلانے کی بھی حاجت نہیں ہوتی۔ ایک لطف آمیز نگاہ۔ ایک ہمدردی کی آہ ستم دیدہ دل کے لیے وہ کام کرتی ہے جو ہزار تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ جو کچھ منہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں اور دوسرے کے خیالات کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اور پھر اپنی صافگوئی اور راستبازی پر ناز کرتے ہیں۔ سچائی کی اچھائی میں کلام نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے سخت الفاظ اور کرخت لہجہ کی بھی ضرورت ہے؟ بعض لوگ درشتی کو طاقت کی علامت سمجھتے ہیں حقیقت میں یہ کمزوری کا نشان ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ جنکو طاقت اور بزرگی عطا فرماتا ہے اون کو حلم اور بردباری بھی مرحمت فرماتا ہے یاد رہے کہ ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اپنے گھر والوں کو حتے المقدور خوش رکھیں اور اپنے گھر کو گھر بنانے کی کوشش کریں۔ کج خلقی اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے۔ بدمزاج آدمی دوسروں کے لئے تو عذاب ہوتا ہی ہے۔ مگر وہ خود بھی اپنے اوپر وبال ہی ہو جاتا ہے جو شخص اوروں کو خوش نہیں رکھ سکتا وہ خود بھی کبھی خوش نہیں رہ سکتا اور جو دوسروں کو دکھ دیتا ہے وہ آپ بھی کبھی سکھ نہیں پاتا۔

اگر کوئی ہماری کسی بات پر اعتراض کرے تو خفا نہ ہونا چاہیئے اور جس وقت ہم خفا ہوں اسوقت کسی پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ اگر

کسی غلطی پر تنبیہ کی ضرورت ہی ہو تو اسے نہایت نرمی اور مہربانی سے سمجھا دینا چاہیئے۔ خاص کر بچوں کے ساتھ نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آنا چاہیئے۔ کیونکہ بقول جین پال رچر" بچے کے ننھے سے گہوارے میں بڑے آدمی کے تاروں بھرے آسمان کی نسبت بہت جلدی اندھیرا چھا جاتا ہے" اور ان کے بھولے بھالے دلوں کی ناشگفتہ کلیاں گرمی کی ذرا سی لپٹ سے کملا جاتی ہیں۔ یہ بھی بڑا اچھا قاعدہ ہے کہ سرزنش خفیہ اور تعریف علانیہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ تنہائی میں سمجھانے سے ہمدردی بھی پائی جاتی ہے۔ دلشکنی بھی نہیں ہوتی۔ اور بات کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے اور علی الاعلان تعریف کی قدر بھی زیادہ کی جاتی ہے۔ اور آئندہ کے لیے ہمت بھی زیادہ بڑھتی ہے۔ تنبیہ حقیقت میں نصیحت کی ذرا سخت صورت ہے۔ انتقام کا نام نہیں ہے۔ اس لیے اگر کیسکو کسی غلطی پر چشم نمائی کرنی ہو تو جہانتک ہو سکے متانت اور افسوس کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ غصہ اور ناراضی سے نہیں۔ اور ہم سبکو ہمیشہ اس یونانی حکیم کی تقلید کرنی چاہیئے جسنے کسی بات پر اپنے غلام سے کہا تھا کہ "اگر مجھے غصہ نہ آگیا ہوتا تو میں تجھے ضرور سزا دیتا"۔ اگر غصہ آجائے تو کچھ کہنے سے پہلے ذرا سوچ لینا چاہیئے۔ میتھو آرنلڈ اعلیٰ ترین تہذیب اور شریف ترین طبیعت کی خصلتیں یہ بتاتا ہے کہ "اس میں بے انتہا مہربانی۔ حالات و واقعات کا لحاظ۔ افعال کا نہایت دقیق امتحان مگر اس کے ساتھ ہی اشخاص پر بیحد رحم ہو" ہر شخص کی کمزوریوں کی رعایت کرنی چاہیئے۔

بسا اوقات اگر سارے حالات معلوم ہو جاویں تو دیکھیں غصہ کی بجائے

رحم اور سرزنش کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ جہانتک ہو سکے رشک اور حسد کی جگہ تعریف اور استحسان لے لے تاکہ ہم دوسروں کی کامیابیوں پر جلنے کی بجائے خوش ہوں۔ عنقریب موت سب کو برابر کر دے گی۔ اور زمین سب کو اپنے آغوش میں سلائے گی۔

عزت شاہ وگدا زیر زمیں یکسان است
میکند خاک برائے ہمہ کس جا خالی

اس لیے ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہیئے اور سب سے محبت اور خوش خلقی سے پیش آنا چاہیئے۔

حتے المقدور کبھی کسی دوست سے غصے کی حالت میں جدا نہ ہو۔ جدائی کے وقت سرد مہری بھی بری بات ہے۔ کیا معلوم کہ کون سی مفارقت آخری مفارقت ہو جائے۔ اور کس وقت کی جدائی آخری جدائی بن جائے +

بعض لفظ سورج کی کرنوں کی طرح اندھیرے میں اُجالا کر دیتے ہیں۔ مگر بعض لفظ سانپ کے کاٹے اور زہر آلود تیروں کے زخم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل ہے کہ "زبان کا زخم تلوار کے زخم سے بہت زیادہ ہوتا ہے" سوچنا چاہیئے کہ جب لفظ اتنے گہرے گھاؤ ڈالدیتے ہیں تو نرم اور شیریں الفاظ کیسی کچھ خوشی بخشتے ہونگے۔ جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ "شیریں زبانی میں خرچ کم ہوتا ہے اور نفع بہت"

اس لیے ہمکو بہت زیادہ محتاط اور حد سے زیادہ متین نہیں ہونا چاہیئے جنکو ہم چاہتے ہیں اون سے اپنی محبت کا مناسب اظہار نازیبا نہیں ہے

اس سے کیا فائدہ کہ دل میں تو محبت ہو مگر تیوری پر بل ابرو پر چین - اور چہرے پر شگفتگی نہیں ہمکو ہمیشہ اپنے عزیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے اون سے گرم جوشی کے ساتھ محبت کرنا چاہیئے - آدمیوں کو عملی اعانت کی نسبت ہمدردی سے زیادہ مدد ملتی ہے - محبت دولت سے زیادہ قیمتی ہے - ایک پر لطف لفظ صد ہا روپیوں سے زیادہ خوش آیند اور فرحت افزا ہوگا - جب لوگوں نے بنجمن ویسٹ سے پوچھا کہ اسے کس چیز نے مصور بنادیا تو اس نے کہا "میری ماں کے پیار نے" چین کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کانفیوشیس کا قول ہے کہ "اگر خانگی فرائض اچھی طرح بجالائے جائیں تو قربانی اور جاترا کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں"

دوستوں کے انتخاب میں نہایت احتیاط کرنی چاہیئے - کیونکہ بقول سسرون "اسباب زندگی میں سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ خوبصورت چیز دوست ہیں" فارسی نازک خیال انشا پرداز کہتا ہے ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

عربی کی ایک مثل ہے کہ "اگر کسی کا حال پوچھنا ہو تو اس کے دوست کو دیکھ لو" جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ "اچھی صحبت میں رہو تم بھی اچھے ہو جاؤ گے" ٹرلی لکھتا ہے کہ "دوستی انسانی زندگی کا بے بہا ہیرا ہے" اور جسکا کوئی دوست نہیں وہ بہت قابل رحم ہے - خاص کر اس سبب سے کہ یہ غالباً خود اس کا ہی قصور ہے -

یہ تو نہایت ہی مشکل ہے کہ ہمکو کبھی اپنے دوستوں سے کوئی شکایت ہی پیدا نہو - لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ رشتہ الفت کو توڑ ہی دے - جب کبھی ہم اپنے کسی دوست سے کسی بات پر ناخوش ہوں تو ہمکو صبر اور تحمل سے کام لینا چاہیئے - اس معاملہ پر اپنے دوست کے نقطۂ خیال سے نظر ڈالنی چاہیئے -

اگر اسوقت بات اچھی طرح سمجھ میں نہ آسے۔ تو کچھ ہرج نہیں۔ جلدی کیا ہے۔ قدرت کبھی جلدی پسند نہیں کرتی تعجیل شیطان کا کام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسوقت اس خیال کو چھوڑ کر سو رہیں۔ جلدی میں کسی بات کا فیصلہ کرنے سے یہ بہتر ہے کہ بے فیصلہ کیے سو جائیں۔ نیند ہمارے اضطراب کو تسکین دیدیتی ہے۔ ہماری بےچینی کو کم کر دیتی ہے۔ اور ہمارے دلمیں اطمینان پیدا کر دیتی ہے۔ اکثر باتیں جو رات کو بہت مکروہ اور ناپسند معلوم ہوتی ہیں صبحکو اوس کی نسبت بہتر نظر آتی ہیں۔ غرض تھوڑا سا تحمل بہت سی مشکلیں آسان کرے گا سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کبھی جلدی سے لڑائی شروع نہ کرو پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیئے۔ پھر جو کچھ کرنا ہو کرو۔ اگر ہم اپنی وجہ شکایت اپنے دوست سے بیان کرسکیں تو اکثر شکاتیں رفع ہو جاتی ہیں۔ مگر اکثر لوگ ایسا نہیں کرسکتے۔ اور سب باتیں دل ہی دل میں رکھتے جاتے ہیں۔ جس سے روز بروز انقباض اور تکدر بڑھتا جاتا ہے۔ اور آخر کار دوستی دشمنی سے بدل جاتی ہے۔ مگر یہ ان لوگوں کی اخلاقی کمزوری کی وجہ ہے۔ یہ اخفا صافگوئی اور راستبازی دونوں کے منافی ہے۔

شریروں اور بیوقوفوں سے دوستی کرنا غلطی ہے۔ مگر انکو دشمن بنا لینا اس سے بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ان کی تعداد غیر محدود ہے۔ دوستوں کو ہم پر ہر طرح کا حق ہے۔ اور جو کچھ ہم ان کو دے سکتے ہیں اس سے ہم کو دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ مگر کسی دوست کو بھی دوست سے قرض مانگنے کا حق نہیں ہے کیونکہ بقول شکسپیر "قرض خود بھی جاتا ہے اور دوست کو بھی لیجاتا ہے" عربی کی مثل ہے کہ "قرض محبت کی مقراض ہے"۔ خود قرض کا لفظ ہی قطع تعلق پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اسکی اصل معنی کاٹنا ہیں +

غرض خوشی کی زندگی بسر کرنے کے لیے ضرور ہے کہ ہم اچھے دوست تلاش کریں۔ اور جب وہ ملجائیں تو اون کو ہمیشہ دوست بنائے رکھیں۔ اور اون کو کبھی بھول کر بھی خفیف سے خفیف شکایت کا موقعہ نہ دیں۔ اور اصل نکتہ یہ ہے کہ اگر ہم خود اچھے ہیں اور دوستی کے حقوق و فرائض کو جانتے ہیں تو ہم کو دوست مل بھی جائیں گے اور ہمارے دوست رہیں گے۔ ورنہ نہ یہ ہوگا نہ وہ ٭

محبت جسکا پہلا سبق ماں کی گود میں شروع ہوتا ہے۔ اسکا انتہائی امتحان کتخدائی ہے اور گھر جسکی سب سے بڑی برکت والدین کی شفقت۔ بھائی بہنوں کی الفت۔ اور بچپن کی یاد ہے۔ اوسکا آخری زیب وزینت کا سامان بیوی ہے جب یہہ محبت آتی ہے تو ساری دنیا کو اپنے قوس قزح کے سے رنگوں سے خوشرنگ بنا دیتی ہے۔ اس دیپک راگ سے ہر ایک دل میں پریم کا چراغ جل اٹھتا ہے۔ جگنو کے پروں کی چمک سے لیکر بلبل کے نغموں کی چہک تک سب کچھ اسیکا کرشمہ ہیں۔ پرندوں کے چہچہے اور شاعروں کے ترانے سب اسیکا نتیجہ ہیں۔ اور پھر اس کا اثر جانوروں اور انسانوں پر محدود نہیں ہے بیجان چیزیں بھی محبت کے اثر سے خالی نہیں ہیں (باد بہاری کے جھونکے جبتک اسکا احسان نہیں تب تک کلیوں کو نہیں کھلا سکتے) باد بہاری کا نام ہے مگر اصل میں کلیاں اسی کے دم مسیحائی سے کھلتی ہیں ابر نیساں کا بہانہ ہے لیکن حقیقت میں پھول اسی کے نفس جان بخش سے شگفتہ ہوتے ہیں ؎

در عدم ہم ز عشق شورے ہست
گل گریباں دریدہ مے آید

حقیقت میں وہ گھر جو کتخدائی کی برکت سے محروم اور بچوں کی میٹھی میٹھی باتوں کی آواز سے ناآشنا ہے وہ کبھی بھی سچے معنوں میں گھر نہیں کہا جا سکتا۔ کتخدائی ایک فرض ہے جسکو فطرت نے قایم کیا ہے۔ جپر انسانیت نے زور دیا ہے جسکی مذہب نے تاکید کی ہے۔ اور جسے قانون لازمی کرتا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جسطرح اور جگہ دنیا میں گل بخار کا وجود موہوم ہے اسی طرح کتخدائی بھی موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں کا احتمال ہے۔ اگر اچھی بیوی سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں تو بری بیوی سے بڑھکر کوئی عذاب بھی نہیں۔ سعدی نے سچ کہا ہے ؎

زن بد در سرائے مرد نکو
ہمدریں عالم است دوزخ او۔

مگر جسطرح اور بہت سی باتیں ایک حد تک ہمارے قبضۂ اختیار میں رکھی گئی ہیں۔ اسیطرح اکثر صورتوں میں شادی کو بھی مخزن راحت و مسرت یا منبع رنج مصیبت بنانا زیادہ تر ہمارے ہی ہاتھ میں ہے حقیقت میں بہت سی چیزیں جو ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں وہ ہمارے ہی خیالات اور ہماری ہی طبعیت کا پرتو ہوتی ہیں یہ مطلب نہیں کہ انکا خارج میں کوئی وجود ہی نہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم انکو انہی رنگوں میں رنگا ہوا دیکھتے ہیں جس رنگ کا چشمہ ہم لگاتے ہوتے ہیں۔ اگر ہم خود اچھے ہیں تو ہمارے ملنے جلنے والے۔ دوست۔ احباب۔ عزیز و اقارب۔ اہل و عیال سب ہی اچھے معلوم ہوں گے اور اگر فی الواقع اچھے نہ بھی ہونگے تو آہستہ آہستہ اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہے تو نتیجہ کے برعکس ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ سچ ہے کہ حالت کتخدائی یا تو نہایت ہی

خوشگوار ہوگی یا انتہا درجہ کی تلخ اور ناخوش آیند شادی ایک نہایت اہم ذمہ داری ہے اور اسمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ حقیقت میں شادی آنکھ اور ناک سے نہیں ہوتی بلکہ دل اور دماغ سے ہوتی ہے۔ اور جو شادی اس کے برخلاف ہو وہ کبھی شادی کے نام کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ حقیقت میں شادی نہیں ہے بلکہ دو روحوں کو متحد اور دو جانوں کو ایک کر دینا ہے۔ یہ عمر بھر کا تعلق اور زندگی بھر کا ساتھ ہے ایک جگہ اٹھنا بیٹھنا۔ اور ایک مکان میں رہنا سہنا ہی نہیں ہے بلکہ رنج و غم میں راحت و آرام تکلیف و مصیبت میں۔ خوشی و کامیابی میں غرض دنیا کی ہر ایک منزل اور زندگی کی ایک گھاٹی میں ایک جان ہے جو دو جسموں میں کام کرتی ہے۔ ایک روح ہے جو دو دلوں کو حرکت دیتی ہے

سٹیلی کہتا ہے حسب منشا شادی ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک نئی دنیا کا دروازہ ہے۔ نئی نئی خوشیاں اور نئے نئے مشغلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ شادی سے اس بات کا بڑا عمدہ موقعہ ملجاتا ہے کہ آدمی اپنی گذشتہ لغزشوں اور بچپن کی غلطیوں کو ہمیشہ کے لیئے یک قلم چھوڑ دے۔ اور نئی ہمت نئی طاقت اور نئی امیدوں کے ساتھ اس نئی زندگی کی ابتدا کرے۔ دنیا میں جنت کی سب سے عمدہ مثال گھر ہے۔ جہاں شوہر اور بیوی۔ ماں۔ اور باپ۔ بھائی اور بہن۔ بچے اور والدین سب اپنی اپنی مختلف روشوں پر ہر ایک کی اعانت و امداد کرتے ہیں جسقدر راحت گھر کی چار دیواری میں پائی جاسکتی ہے۔ اتنی باقی ساری دنیا میں ہی ملنی ناممکن ہے کیونکہ گھر سے باہر نہ کوئی ہمارے حالات سے اتنا واقف ہے۔ نہ کوئی ہم سے اتنی محبت کرتا ہے۔ نہ کسی کو ہماری اتنی پرواہ ہے۔ نہ کسیکو ہم سے اتنی ہمدردی ہے اور نہ کسیکو ہمارے ساتھ اتنا تعلق ہے لیکن گھر میں ایک کی خوشی سب کی خوشی اور ایک کا غم سب کا غم ہے۔ گھر کا تعلق وہ تعلق ہے۔ کہ ایک کی خود غرضی۔

"مجمعِ احباب"

احباب کا یہ مجمع یارب رہے سلامت — دل جس سے شادماں ہی حاصل ہی جس سی فرحت
آنکھوں کا نور ہی، یہ دل کا سرور ہی یہ — آرام جان کا ہی تن کے لیے ہی راحت
جب غم ہوا تو مینے جی اس سے خوش کیا ہی — یہ لطفِ زندگی ہی، یہ باعثِ مسرّت
مایوسیوں نیں امید اسنے دلائی مجھکو — مجبوریوں نیں اسنے دلکی بڑھائی ہمت
مجھکو اداس پاکر ہوتے ہیں دوست غمگیں — ہمدرد دل کے بنکر کرتے ہیں غم میں شرکت
یہ دوست بے ریا ہیں، یہ خوگرِ وفا ہیں — میری طرف سے ان کے دل میں نہیں کدورت
غربت میں مجھکو ان کے اخلاق یاد آئے — مجھپر وطن میں بیحد ان کی رہی عنایت
یکساں نباہتے تھے یہ رسمِ دوستداری — ہو فقر یا امیری، غم ہو کہ عیش و عشرت
گو دوستوں کا مجمع اب ہو گیا پریشاں — رہتی ہے یاد لیکن آٹھوں پہر وہ حالت
برتاؤ وہ وفا کا، وہ لطف انتہا کا — وہ دوستانہ باتیں۔ یارانہ وہ حمیت
وہ ساتھ ساتھ رہنا ہر وقت اور ہر جا — دن ہو کہ رات کچھ ہو خلوت ہو یا ہو جلوت
آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ شکل اجتماعی — ایک ایک کی وہ صورت، ایک ایک کی وہ سیرت
وہ پیاری پیاری باتیں اب تک خیال میں ہیں — وہ ہمسنی کی شوخی وہ باہمی ظرافت
دل سے نہیں مٹے ہیں یاروں کے نقشِ احساں — پیشِ نظر ہے گویا اک نقشہ رفاقت
اوصاف دوستوں میں گو مختلف تھے لیکن — اپنی کبھی کسی نے ظاہر نہ کی فضیلت
اللہ! دوستوں کی فرقت نہیں گوارا — دل کو قلق ہے ہر دم رہتی ہی جاں کو کلفت
ہنسنے کو بولنے کو جی چاہتا نہیں اب — چہرہ پہ ہی اداسی، افسردہ ہے طبیعت

همراز تھے وہ میرے باہم بزم تھے وہ میرے وہ میرے ہم سخن تھے وہ میرے ہم عقیدت
باہم نباہنے کے پیمان ہو چکے تھے جائز نہ تھا تعصب ممنوع تھی رقابت
شیرازہ ٹوٹنے سے اوراق منتشر ہیں اب وہ کہاں ہیں جلسے۔ اب وہ کہاں ہے صحبت
میں بستر الم پر روتا ہوں چپکے چپکے منہ فق ہے، رنگ اوڑا ہی، جاتی رہی بشاشت
کمرہ نشست کا بھی سونا پڑا ہوا ہے عالم ہے ایک ہو کا چھائی ہوئی ہے وحشت
شب ہے تو شمع گل ہے۔ دن ہے تو فرش میلا برباد ہو گیا سب سامان زیب و زینت
تفریح کے لیے اب میں کس کے ساتھ جاؤں بچھڑے ہوئے ہیں سارے یاران با مروت
آنسو بہا کے دل کی حسرت نکالتا ہوں یاد آتی ہے کبھی جب گزری ہوئی وہ صحبت
ہر قول فعل اونکا میرے لیے سبق تھا میرے موافق آئی یاروں کی ہر نصیحت
اپنے لیے انہوں نے میرا برا نہ چاہا گویا لہو بدن میں تھا جو ہر شرافت

اوصاف دوستوں کے کیا کیا سناؤں **محوی**
پورا کبھی نہ ہوگا یہ نغمۂ ارادت

غزل

نظارہ سوز کیوں نہ رخ بے نقاب ہو کچھ تو نگاہِ شوق کا آخر جواب ہو
ناکامی امید کے قربان جائیے کیوں وقفِ آرزو دلِ حسرت مآب ہو
پایانِ درد و رنج کی مانند اے فلک خمیازۂ نشاط میں بھی انقلاب ہو
ارمان مٹتے دیکھئے نہ جائیں گے اے خدا مانوس اختلاط نہ رنگِ شباب ہو

شیرازۂ خیال کا محشر ہے ایک ورق
ارشد غضب ہو جمع اگر یہ کتاب ہو

غزنین[۵]

یورپ والے اس شہر کو غزنہ۔ غزنا۔ غزنی اور ایشیائی مورخ بالعموم غزنین کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں زابلستان یا زابل کہتے تھے۔ افغانستان کا ایک مشہور تاریخی شہر سطح آب سے ۲۲۶،۷ فیٹ بلندی پر ۶۸ درجہ ۲۰ دقیقہ طول البلد شرقی اور ۳۳ درجہ ۳۴ دقیقہ عرض البلد شمالی کے درمیان واقع ہے۔ ازمنہ متوسط میں دو مختلف خاندانوں کے وسیع سلطنت کا پایہ تخت رہچکا ہے اور برٹش انڈیا کی جدید تاریخ میں بڑا دلچسپ مقام ہوگیا ہے۔ جو سیدھی سڑک قندھار اور کابل کے درمیان گذرتی ہے اوس پر قندھار سے ۲۳۳ میل کے فاصلہ پر شمال و مشرق اور کابل سے ۸۵ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب

---

۵ دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دہم صفحہ ۵۵۹۔ اور آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۹۳۔ جس میں علامی ابوالفضل لکھتے ہیں "غزنین از سوم اقلیم و زابل عبارت ازیں پائی تخت سلطان محمود و سلطان شہاب الدین و برخے دیگر این ولایت را بیشتر **زابلستان** گفتندے برخے قندھار داخل ایں بلاد شمرند حکیم سنائی و بسیارے اولیا را خوابگاہ۔ زمستان او برابر سمرقند و تبریز نشان دہند۔ رودی از شمال بجنوب میرود و کشت و کاربدان سرسبز و شاداب۔ و کشاورزان رنج بسیار برند۔ ہرسال خاک نو آورند تا کشت پذیر شود۔ و بیشتر از اراضی کابل برد ہد۔ رویں فراوان شود ازینجا ہندوستان برند۔ و در زباں فردوس مکانی تبرے بود کہ چون در رود برد۔ خوانندے در جنبش آمدی۔ از پژوہش دیدہ وران آگاہ دل روشن شد کہ دستان سرائی دکانداران استخوان فروش است و سرچشمہ ایست کہ اگر قاذورات درو افتد شورش ابر و برف و بارندگی پدید آید۔ دیکھو واقعہ نگاری کی منزل کیسی کٹھن ہوتی ہے!!!

کیجانب واقع ہے خاص شہر کی موجودہ آبادی چار ہزار سے متجاوز نہوگی۔ شہر کے شمالی حصہ میں جو قلعہ ہے وہ سطح زمین سے ۵۰ افیٹ بلندی پر ہے۔ شہر پناہ بھی بلندی پر واقع ہے جسکا کچھ حصہ اینٹ و پتھر کا اور کچھ حصہ خام بنا ہے۔ اس کا دور بشکل مربع ایک میل کا ہوگا۔ اسپر بہت سے مینار بنے ہوئے ہیں۔ چوگردہ جو خندق بنی ہے اوس میں دریائے غزنی سے جو شہر کے قریب جانب مغرب بہتا ہے پانی آتا ہے۔ اسپر تین پھاٹک بنے ہیں۔ شہر کے مکانات اونچے اور کئی درجوں کے ہیں عموماً گلیاں میلی اور بے ترتیب ہیں البتہ دو زیادہ سیدہی اور کشادہ سڑکیں وسط شہر سے گذرتی ہیں۔ دکن کا منظر بہت وسیع ہے قندھار کے سمت کا میدان بھی انتہائے نظر تک چلا گیا ہے۔ دریا کے قریب جہاں مواضعات اور باغات مجموعی لحاظ سے زیادہ ہیں گیہوں اور جو کی پیداوار بکثرت ہوتی ہے۔ آب و ہوا بہت سرد ہے تین مہینہ تک برف پڑا کرتی ہے مشہور ہے کہ کئی مرتبہ شہر برفباری سے برباد ہوچکا ہے۔ ایندھن کی قلت ہے۔ زیادہ تر خاردار جھاڑیاں جلانے کے کام آتی ہیں۔ کابل اور قندھار کی طرح گرمی تو نہیں پڑتی لیکن کشادہ اور مرتفع مقام ہونے کی وجہ سے رات اس سے اور بھی تکلیف دہ ہوجاتی ہے کہ اوسوقت اکثر آندھی آتی رہتی ہے۔ بظاہر محمود کا عالیشان شہر موجودہ شہر پناہ کے اندر محدود نہ رہا ہوگا یہ ہوسکتا ہے کہ اسجگہ صرف قلعہ رہا ہو۔ ابن بطوطہ کی تحریر (۱۳۳۲ء) سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ آثار قدیمہ میں سے صرف دو مشہور مینار باقی ہیں۔ جنکا فاصلہ ۴۰۰ گز کا ہے۔ لیکن بلندی میں ہر ایک ۱۴۰ فیٹ ہے۔ یہ مینار دہلی کے قطب مینار سے نہ صرف چھوٹے ہیں بلکہ طرز تعمیر میں بھی اسکا اور انکا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ خط کوفی میں جو کتبے ہے اسمیں

ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مینار سلطان محمود کا دوسرا اوس کے بیٹے سلطان مسعود کا تعمیر کرایا ہے۔ مینار محمود پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ "السلطان الاکرم ملک الاسلام یمین الدولہ و امین الملۃ ابو المظفر ظہیر المسلمین و معین المساکین ابوالقاسم محمود انار اللہ برہانہ بن سبکتگین غازی المغازی امیر المومنین الرینار ہذا العامۃ العالیۃ العلیۃ قدمت بالیمین والبرکۃ"

مینار مسعود کی عبارت کی نقل یہ ہے وہو ہذا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امر السلطان الاعظم ملک الاسلام اعلام المملکۃ والدولۃ ابو سعید مسعود بن ظہیر الدولہ محمود ابو ابراہیم نصیر الدین امیر المومنین یمین المملکۃ امین الملۃ مالک رقاب الامم سلطان المکرم الخاقان مولی ملوک العرب والعجم خلد اللہ تعالی ملکہ و سلطانہ وافاض علی العلمین برہ و احسانہ غفر اللہ لہ ولوالدیہ والجمیع المسلمین"

ایک اور عبارت کی نقل ملی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ پھاٹک کے آخری حصہ پر کندہ تھی۔ اغلب یہ ہے کہ قبر پر کندہ ہوگی وہو ہذا

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ غفران من اللہ للامیر الاجل السید الملک المولی امیر الدولۃ و امیر الملۃ ابوالقاسم محمود بن سبکتگین رحمۃ اللہ علیہ و نور حمرلہٗ

کابل روڈ پر مینار محمود سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک موضع ہے جسکو روضہ کہتے ہیں یہیں ایک مختصر باغ میں اس مشہور فاتح کا مزار ہے۔ قبر سنگ مرمر کی ہے جو ایک معمولی بیڈول کمرہ میں واقع ہے جس پر مٹی کا ایک گنبد بنا ہوا ہے

؎۵ ممبر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا روزنامچہ مطبوعہ ۱۸۴۳ء صفحہ ۷۶۔

جاہل افغان صاحب ہمت سلطان کے مزار کی یہاں تک تعظیم کرتے ہیں کہ دور ہی سے پا برہنہ ہو کر نہایت عاجزانہ شکل سے اوس میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ موضع سرسبز اور شاداب باغوں کے درمیان واقع ہے جو ایک وسیع نہر سے سیراب ہوتے ہیں سلطان بابر نے روضہ کے انگوروں کی لطافت کی تعریف کی ہے۔ سومنات[۵۱] کا مشہور پھاٹک سنہ ۱۸۴۲ء تک اوس عمارت میں لگا ہوا تھا جسمیں محمود کی قبر تھی اوس کے بعد بحکم لارڈ النبرہ ہندوستان میں لایا گیا غالباً گورنر جنرل موصوف کا یہ ارادہ رہا ہوگا کہ پھاٹک کو گجرات کے مندر میں پہونچا دیا جائے لیکن اوسے آگرہ ہی میں رکھا گیا۔ پھاٹک کا طول ۱۱ فیٹ عرض ۹ ½ فیٹ وزن ۵۰۰ پونڈ کے قریب ہے نیچے کا حصہ خراب ہو گیا ہے۔ یہ دروازہ دیودار لکڑی کا ہے جو ہمالیہ میں ہوتی ہے۔ اسپر اسلامی طرز کی ساخت کی شکلیں بنی ہیں اس لیے بظاہر اس کا سومنات سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ شاید اس روایت کی بنا اس واقعہ پر ہو

۵۱ دروازہ روضۂ سلطان محمود سراسر از چوب صندل ساختہ بودند با نواع نقش خوب و مرغوب و منشی موہن لال کہ در سنہ ۱۲۴۸ یکہزار و دوصد و چہل و ہشت ہجری بغزنی رفتہ بود و زیارت روضہ مذکور نمودہ می نویسد کہ مردم آنجا میگفتند کہ ہرگاہ کہ سلطان محمود سومنات را فتح ساختہ این دروازہ عالی را از ان بتخانہ آوردہ بود واللہ اعلم۔ و بعد از ان چون در سنہ ۱۲۵۵ یکہزار و دوصد و پنجاہ و پنج ہجری افواج سرکار کمپنی انگریزی برائے امداد شجاع الملک دران دیار رفتہ کابل و قندھار و غزنین را فتح ساخت شاہ شجاع الملک را بر تخت نشانید و دوست محمد خاں والی آن ولایت را اسیر نمود و بعد از چند سال اکبر خاں پسر دوست محمد خاں مکناٹن صاحب بہادر را بدغا کشت و اکثری را گرفتار ساختہ قید نمود سرداران انگریز ہنگام معاودت از ان دیار قلعہ غزنین را مسمار ساختہ و آن دروازہ صندلی را از مغتنمات تصور نمودہ باز ہندوستان آوردند و آن را حالا در قلعہ اکبرآباد با حتیاط تمام نگاہداشتہ اند" منتخب التواریخ مصنفہ مسٹر ٹامس ولیم بل صفحہ ۳۵

کہ شاہ شجاع نے جب رنجیت سنگھ سے ملنے کے بعد کابل کا تخت حاصل کرنے کی غرض سے مدد چاہی تو راجہ نے یہ بھی ایک شرط پیش کی تھی کہ سومنات کا پھاٹک اوسے واپس کردیا جائے۔ ایک اور روایت کپتان کلاوڈ ویڈ کی رپورٹ مورخہ ۲۱ نومبر سنہ ۱۸۳۱ء میں درج ہے کہ شاہ شجاع نے مہاراجہ کو ایک پیشین گوئی یاد دلائی تھی کہ غزنین سے پھاٹک لیجانا سکھوں کی زوال کا مقدمہ ہوگا۔ سلطان محمود کی دوسری یادگار بند سلطانی دریائے غزنی پر شہر سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے شہنشاہ بابر نے اس بند کی اونچائی غالباً معہ ڈہال کے ۔ ۲۰۰ یا ۱۰۰ فیٹ اور لمبائی ۲۰۰ فیٹ لکھی ہے بسنہ ۱۱۵۰ء میں علاء الدین نے جب شہر کو غارت کیا تو یہ بند بھی خراب و خستہ ہوگیا تھا لیکن بابر نے اوس کے مرمت کا صرفہ خود دیا۔ دینی صاحب اسکی بلندی صرف ۲۵ فیٹ بتاتے ہیں اور قابل مرمت لکھتے ہیں۔ اس بند سے غزنین کے مغربی میدان کی آبپاشی میں مدد ملتی ہے۔ غزنین کے گرد و نواح میں بہت سی متبرک زیارت گاہیں ہیں جن کے چوردیہ انگور کے باغات ہیں کہا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ میں اون لوگوں کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے جو سلطان محمود کے قبر کی زیارت کر کے واپس جاتے ہیں۔ زایرین سے سوالات کر کے اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ غزنین کے مشہور مقامات دیکھ آئے ہیں یا نہیں۔ ورنہ وہ بالتفصیل اون کے ذکر سے معذور ہونگے جن کی صفت فارسی کے چند اشعار میں کی گئی ہے۔ غالباً واقعہ نگاران انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مطلب ذیل کے اشعار سے ہوگا ؎

نشانے شہر غزنی چار چیز است | کسے داند کہ او اہل تمیز است
اول دروازہ سلطان محمود | سہ کنگر ہر سہ کنگر سرنگوں سار
دوم طاقی است در سقف منارہ | کہ افتد آفتاب از ہر کنارہ

چنانچہ ۱۸۴۲ء میں پھاٹک ہندوستان میں لایا گیا اور شیر سنگھ کی موت کے بعد ۱۸۴۳ء میں واقع ہوئی سکھوں کی سلطنت کو زوال آگیا ع

سوم سقاد و سنگ رقام است — میان مسجد جامع مدام است
چهارم مسجد بابا شش گویند — که کج محراب قبلہ راست گویند

سکندر اعظم کے زمانہ کے واقعہ نویسوں یا کسی قدیم مصنف نے اس شہر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے اس کے قدیمی حالات معلوم نہیں ہوئے ممکن ہے کہ یہ وہی گز یکا ہو جسکو بطلیموس پیرو میپیڈیا میں بتلاتا ہے اور سراتیج لینس کے خیال کے موافق وہی گازس ہندوستانی شہر ہو جسکا ذکر دو قدیم یونانی شعرا نے کیا ہے کہ وہ مشہور جنگی اور ناممکن التسخیر شہر ہے اس نام کا مخرج غالباً فارسی و سنسکرت کے الفاظ گنج و گنجا ہون گے جنکے معنی خزانہ کے ہیں جیسے یونانی و لاطینی زبان میں گزہ کہتے ہیں مسلمانوں کے زمانہ ۶۴۴ء سے قبل بھی اس شہر کے وجود کی شہادت میں ہمارے پاس چینی سیاح ہیون تسانگ کا سفرنامہ موجود ہے جو ہوسینا (غالباً غزنا) کا ذکر کرتا ہے کہ وہ مقام تاسوکوٹا یا آرکوسیا کے دار الحکومت میں سے ایک مشہور مستحکم اور جنگی مقام تھا۔ مسلمانوں کے ابتدائی زمانہ میں غزنین سے ملا ہوا ملک زابل کہلاتا تھا جس وقت مسلمانوں کا پہلا حملہ اس ملک پر ہوا ہے اوس وقت غزنین ہندوستانی تجارت کا زرخیز مرکزی مقام تھا۔ تجارت کا اندازہ ابن حوقل کے بیان سے کرو جو کہتا ہے کہ کابل میں قریب دس لاکھ پونڈ کی نیل سالانہ فروخت ہوتا تھی۔ اس شہر پر مختلف سلطنتوں اور خاندانوں کا اسلامی پرچم لہرایا گیا۔ جو صوبے کہ ملتان پر واقع تھے یا غزنین کے قریب آباد تھے اونپر اوایل زمانہ یعنی خلافت معاویہ (۶۶۲-۶۸۰ء) ہی میں حملہ ہو چکا تھا۔ یعقوب بن لیث نے کابل و آرا کوسیہ کو ۸۷۰ء میں فتح کیا۔ اگرچہ کابل کا ہندو خاندان وادی دریائے کابل کے ایک حصہ پر محمود کے زمانہ تک قابض رہا۔ یہ وہی زمانہ تھا

جس کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ غزنین میں اسلامی حکومت نے استقرار پکڑا۔ ایک مسلمان مورخ نے قلعہ اور شہر کا بانی تعمیر یعقوب کے بھائی عمر بن لیث (وفات سنہ ۹۰۱ء) کو ٹھرایا ہے لیکن واقعات سے اسکی تائید نہیں ہوتی۔

نویں صدی کے آخری حصہ میں سامانی خاندان نے سمرقند میں زور پکڑ کر بخارہ میں بڑے شان وشوکت سے سلطنت کی۔ یہ خاندان ایکسو تیس برس تک قایم رہا۔ اسمٰعیل نے سنہ ۲۹۵ ہجری میں وفات پائی اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل اور ان کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ ملک الشعرا رودکی اسی تاجدار کے دربار کا گل سرسبد تھا۔ ۳۰ برس کے حکمرانی کے بعد سنہ ۳۳۱ ہجری میں وفات پائی اس کے بعد نوح فرمانروا ہوا جو علوم وفنون کا بڑا حامی وسرپرست تھا حکیم ابونصر فارابی سے فلسفہ یونانی کے بیشمار تصنیفات کا از سر نو ترجمہ کرایا جس کے بدولت فارابی دنیار اسلام میں معلم ثانی مشہور ہوا۔ سامانی خاندان کا سنہ ۳۹۰ھ میں اسمٰعیل بن عبدالملک کے بعد خاتمہ ہوگیا خاندان غزنویہ اس حکومت کی ایک شاخ ہے سنہ ۳۵۰ ہجری میں الپتگین جو ترکی غلام اور اسی خاندان کا پروردہ تھا ترقی کرکے امارت کے درجہ تک پہونچگیا عبدالملک نے اس کو خراسان کا حاکم مقرر کردیا جب منصور بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو الپتگین خراسان سے غزنین چلاگیا اور یہاں اپنی حکومت قایم کی ۱۶ برس کے بعد جب اسکا انتقال ہوگیا تو اسکا جانشین ابواسحاق اسی کا بیٹا ہوا۔ لیکن چند روز بعد وہ بھی فوت ہوگیا۔ الپتگین کا ایک ترکی اور غلام سبکتگین نامی تہا اس نے اپنے آقا کے عہد میں قابلیت کے ایسے ایسے جوہر دکھاتے تھے کہ ابواسحٰق کے بعد سنہ ۳۶۵ ہجری میں لوگوں نے اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کردیا یمین الدولہ امین الملتہ سلطان محمود غزنوی انار اللہ برہانہ اسی نامور سردار سبکتگین

بانی سلطنت غزنویہ کا فرزند ہے جسنے سرزمین غزنین کو شہرت کا آسمان بنا دیا
یہ سلطان سیف و قلم دونوں کا مالک تھا۔ یہ مضمون اوسکی علیحدہ مستقل صالحات
زندگی کا ایک جزو ہی۔ فقہائے حنیفہ کے حالات میں جواہر مفید ایک معتبر
کتاب ہے اسمیں محمود کو فقہا کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔ فقہ میں خود سلطان
محمود کی ایک مبسوط تصنیف کا پتہ لگا ہے۔ غزنین میں اوس نے ایک
عظیم الشان مدرسہ قایم کیا تہا جس کے ساتہہ ایک عجائب خانہ بھی تھا۔ ملک کے
مشاہیر کو بلا کر دربار میں جگہ دی۔ اس کے دربار کے سیارہ عنصری
و فردوسی وغیرہ کے حالات تم المحمود میں پڑہو گے اور دیکھو گے کہ کس طرح
سلطان کے نام کے ساتہہ غزنین اور خاندان غزنویہ نے بقائے دوام حاصل
کیا۔ اوسکی حکومت کردستان سے سمرقند تک اور کیسپین سے سواحل گنگا
تک پہیل گئی تھی محمود ۱۰۳۰ء میں فوت ہوا اوس کے بعد ۱۴ بادشاہ اوس
نسل سے فرمانروائی کرتے رہے۔

ابراہیم کا زمانہ (۱۰۹۹-۱۰۵۹) بعض ترقیوں کے لحاظ سے سرسبز زمانہ
کہا جاسکتا ہے لیکن سلطنت پہر پچھلی شان و شوکت کو نہ پہونچی۔ غزنویہ کے
بعد سلجوقیوں اور غوریوں نے زور باندہا۔ بہرام شاہ (۱۱۵۲-۱۱۱۸) نے غور کے
ایک شاہزادہ قطب الدین کو قتل کرا دیا تہا سیف الدین نے بہائی کا بدلہ لیا
اور بہرام کو بہگا دیا لیکن بہرام نے ۱۱۴۹ء میں پہر شہر پر قبضہ کر لیا سیف الدین
اور اس کے وزیر کو گرفتار کر کے ذلت کے ساتہہ تشہیر کرایا اور بعد میں دونوں
کو پہانسی دلوادی۔ بہرام شاہ کے تخت نشینی پر سید حسن نے ایک قصیدہ
کہا تہا جسکا مطلع یہہ ہے۔

ندای بر آمد ز ہفت آسمان   کہ بہرام شاہ است شاہ جہان

حکیم شیخ سنائی نے اپنی مشہور کتاب حدیقۃ الحقیقۃ اسی بادشاہ کے نام سے مزین کی ہے جسکا ایک شعر یہ ہے ؎

عرش گر بارگاہ را زیبد ۔ شاہ بہرام شاہ را زیبد

اصل کتاب عربی سے کلیلہ و منہ بھی اس کے نام پر لکھی گئی ہے۔ علاء الدین غوری نے دونوں مقتول شاہزادوں کے خون کا بدلہ لینا چاہا اور فوج کثیر جمع کر کے ہینڈ کے قریب بہرام کا مقابل ہوا اور متواتر کامیابی کے بعد غزنین پر قبضہ کر لیا جسے قتل و غارتگری کے بعد جلا کر خاکستر کر دیا۔ سلطان محمود کی قبر سے تو تعرض نہیں کیا اور اکثر کی لاشیں قبر سے نکالکر جلوا دیں اسی واقعہ کے بعد سے ملقب بہ جہانسوز ہوا۔ علاء الدین کی واپسی پر بہرام پھر غزنین پر قابض ہو گیا اور ۱۱۵۲ء میں وفات پائی اوس کے بیٹے خسرو شاہ کیوقت میں غزنین پر ترکان غزان قابض ہوئے جنکو اب عام طور پر ٹرکومن کہتے ہیں بادشاہ لاہور کو بھاگ گیا ۱۱۷۳ء میں ترکان غزان کو غیاث الدین سلطان غور نے نکالدیا جو علاء الدین جہانسوز کا بھتیجہ تھا۔ اور اپنے بھائی معز الدین کو غزنین حوالہ کیا۔ اس مشہور شہزادے نے جو بعد میں شہاب الدین غوری کے نام سے پکارا گیا تھوڑے ہی دنوں بعد (۷۶-۱۱۷۵ء) میں ہندوستان پر حملہ کیا اور ملتان اور اوچ کو فتح کیا۔ خاندان غزنویہ کا آخری شاہزادہ خسرو ملک لاہور کا حاکم تھا وہ گرفتار کیا گیا اور بحالت قید غور کے پہاڑی ... ست ہوا ۱۱۹۲ء میں پرتھوی رائے یا پتھورا کو جو اجمیر کا راجہ تھا۔ شکست ... ہوئی اور وہ تھانیشر کے قریب مارا گیا۔ اور غزنین کا مفتوحہ ملک مالیہ ... اجمیر تک غوری بادشاہ کے زیر حکومت آیا۔ غیاث الدین کے مرنے کے بعد معز الدین غور و غزنین کا پورا مالک بن گیا اور غزنین پر کچھ مزید

عرصہ کے لیے ایسی حکومت کا صدر مقام ہوگیا جو وسعت میں محمود بن سبکتگین کی سلطنت سے کم نہ تھی۔ معز الدین پنجاب کے گھکروں کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے ایکبار اور دریائے سندھ کے پار آیا و اسی کے وقت کسی کھکر یا ملاحدہ نے اوسے قتل کرڈالا اور غزنین کچھ دنوں تک خوارزم کی سلطنت کا جز ہوگیا۔ جلال الدین بن محمد شاہ خوارزم نے غزنین کو صدر مقام بنایا کابل کے اوتر بمقام پروان منگولوں کی فوج کو جلال الدین نے شکست دی لیکن چنگیز خاں نے جلال الدین کو بھگا کر چھوڑا اور تغتائی خاں کو غزنین کے محاصرہ کو بھیجا۔ اس کے بعد سے غزنین کا نام تاریخوں میں بہت کم آیا ہے ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس شہر کا زیادہ حصہ ویران تھا صرف ایک حصہ میں آبادی تھی۔ غزنین میں تیمور کی آمد کا حال تو نہیں پایا گیا البتہ یہ معلوم ہوسکا ہے کہ سنہ ۱۴۰۱ء میں اوسنے کابل۔ قندھار اور غزنین کی حکومت پیر محمد اپنے پوتے کو دی تھی۔ ابو الفضل نے صرف اسقدر لکھا ہے۔

"دو سال صد وہفت ہجری در حکومت ہشام بن عبد الملک امین بن عبد اللہ قشری حاکم خراسان اغور غرجستان و ملک نیمروز کابل را بدست آورد و حاکم نشین خود ساخت وازاں پس ہموارہ در زمان بنی امیہ و بنی عباس حاکم خراسان داشت تا آنکہ در زمان سامانیان الپتگین نام غلام آں خاندان جدا شدہ غزنین و کابل را متصرف شد و دم استقلال برزد۔ و چوں درگذشت سبکتگین پدر محمود بکلاتی ایں دیار قرار گرفت۔ و ہمچنیں در تحت تصرف غزنویان بود و پس بغوریان و پس ازاں بغلامان آنہا کہ یکے ازاں تاج الدین یلدوز بود۔ و پس ازاں بخوارزمیان و لشکر قاآن بزرگ چنگیز خاں استیلا یافت و ازانجا بصاحبقرانی باز گردید و فرزندان دولت افزائی او معدلت آرا شدند" الغ بیگ میرزا بھی جو

مشہور ہیئت داں تھا غزنین اور کابل کا حاکم رہچکا تھا سنہ ۱۵۰۴ء میں دونوں جگہ پر بابر کا قبضہ ہوگیا وہ اپنے تزک میں اسکا کچھ حوالہ دیتا ہے اوس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر اوس وقت برباد ہوچکا تھا وہ تعجب کرتا ہے کہ کیوں اون تاجداروں نے جو ہندوستان اور خراسان پر فرمانروائی کرتے تھے اس جگہ کو صدر مقام تجویز کیا تھا۔ البتہ وہاں کے باغوں اور پھلوں کی تعریف کرتا ہے۔ نادرشاہ کے حملہ سنہ ۱۷۳۸ء سے قبل غزنین خاندان تیموریہ کے قبضہ میں رہا کیا۔ نادر کے بعد احمد شاہ درانی قابض ہوا۔ مسٹر جارج فارسٹر جو سنہ ۱۷۸۳ء میں ایک قافلہ کے ساتھ ہیئت بناکر بطور سیاح گئے تھے لکھتے ہیں کہ شہر کی نازک حالت کو کسیقدر ہندؤنکا خاندان سنبھالے ہوئے ہے جو اپنی تجارت کے ذریعہ سے مسلمان باشندوں کی ضرورت رفع کرتے رہتے ہیں۔ ۲۳۔ جولائی سنہ ۱۸۳۹ء کو سر جان کین کے ماتحتی میں برٹش فوج نے غزنین پر قبضہ کیا تھا اب یہہ مقام بادشاہ کابل کے زیر حکومت ہے۔

خاکسار سید عبدالسبحان

محمڈن یونیورسٹی۔ منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی نے جنکی قابلیت سے ملک اچھی طرح واقف ہے حال میں یہ نظم لکھی ہے خیالات کی پاکیزگی تشبیہات و استعارات اور سب سے زیادہ حسرت نصیب قوم کی حالت زار اسمیں کچھ اس درد سے کھینچی ہے کہ اکثر مصرعے نشتر کا کام کرتے ہیں اس نظم کے ہر بند سے مولانا کی قادر الکلامی کے علاوہ وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جب سر آغا خاں چارٹر لے چکے اور قوم خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتی۔ نظم واقعی اسکی مستحق تھی کہ کرنل حاجی محمد عبیداللہ خانصاحب نے اسکو اپنے حکم سے شائع کروایا۔ ہم اس بے نظیر نظم کی داد کن الفاظ میں دیں البتہ یہہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ایسے بزرگ کی عمر میں برکت دے۔ ناظرین "تمدن" آیندہ پرچہ میں یہ بیش بہا نظم ملاحظہ فرمائیں گے +

عالمِ خیال

کا

تیسرا رُخ

مئی کا رسالہ یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ ہمارے محترم مولوی احمد علی صاحب شوق قدوائی، لکھنوی، کی یہ نظم ہماری درخواست کے جواب میں وصول ہوئی۔ مولانائے موصوف کا دم قوم کے واسطے غنیمت، اردو لٹریچر کے واسطے نعمت، اور ہمارے واسطے برکت ہے، باوجود عدیم الفرصت اور دائم المریض ہونے کے مولویصاحب کا یہ احسان، اور خدمت، ایسی چیز نہیں کہ انکا شکریہ ادا ہو سکے۔ مولانائے محترم کا کلام ہمارے نوٹ کا محتاج نہیں، یہ وہ سدا بہار پھول ہیں، جو ہمیشہ مہکتے رہیں گے البتہ ہمیں اتنا کہنا ہے کہ مولانا شوق، نے ابتک عالمِ خیال کے تین رخ لکھے ہیں

پہلا رُخ وہ ہے جس میں فرقت زدہ عورت شوہر کی یاد میں محو خود اپنے خیال سے باتیں کر رہی ہے،

دوسرا رُخ وہ ہے کہ پردیس سے شوہر کی آمد آمد تھی، مگر عذر کا خط آیا کہ ابھی نہیں آسکتا، فرقت نصیب عورت نے پریشان ہو کے اُسے خط لکھا ہے،

یہ دونوں رُخ لکھنؤ کے نامی رسالہ الناظر میں شائع ہو چکے ہیں،

تیسرا رُخ یہ ہی، جو "تمدّن" میں شائع کیا جاتا ہے، شوہر نے عورت کے خط کا جواب لکھا ہے،

تمھارے خط کو دیکھکر نظر اسی میں گھر گئی تمھاری شکل خط کے ساتھ پتلیوں میں پھر گئی

ہے لفظ لفظ خط کا درد و غم کی داستاں سے
قلم تمھارا دل بنا وہ بول اُٹھا زباں سے
تمھارے سب گلے بجا، تڑپ بجا، الم بجا،
تمھاری سب شکایتیں، تمھاری ہی قسم بجا
وہاں جو دل میں درد ہے، یہاں بھی آہ سرد ہے،
وہاں جو رنگ زرد ہے، یہاں بھی رُخ پہ گرد ہے
اُدھر بھی چوٹ، اِدھر بھی ہے، نہ تاب اُدھر، نہ تاب اِدھر
نہ چین اُدھر، نہ چین اِدھر، نہ خواب اُدھر، نہ خواب اِدھر
اُدھر ٹہل[1] کے شب کٹے، اِدھر تڑپ کے شب کٹے
یہ سوچ شام ہی سے ہو کہ دیکھیں رات کب کٹے
تمھارا چین میں ہی تھا، جو دُور میں تو دُور وہ
سرور میرے دم سے تھا، نہ میں نہ اب سرور وہ
میری خوشی تمھیں سے تھی، نہ تم نہ اب خوشی مری
فراق چھین لے گیا رولا کے سب خوشی مری
وہ دن خیال ہو گئے، وہ راتیں خواب ہو گئیں
وہ دو دلوں کی راحتیں سب اضطراب ہو گئیں
نہ ان لبوں پہ وہ ہنسی نہ رُخ پہ اب وہ رنگ ہے
نہ روح میں وہ تازگی نہ دل میں وہ اُمنگ ہے
شباب، رنگ، حُسن، اِن کی صورتیں بگڑ گئیں
گھروں میں لوٹ پڑ گئی تو بستیاں اُجڑ گئیں
جہان کوئی دوسرا جو غم سے پاک ہو کہیں
تو ہم تم اِس جہان سے نکل چلیں، رہیں وہیں
یہاں ہزار آفتیں، اِنھیں میں دل گھرا کریں
یہاں ہزار گردشیں، اِنھیں میں سر پھرا کریں
وہ مُلک چل کے ڈھونڈھ لیں، جہاں نہ آسمان ہو
جہاں نہ اِس کے ظلم سے مصیبتوں میں جان ہو
جہاں نہ ہو اجل کہ "اِس" کو "اُس" کا داغ دے سکے
جہاں زمین ہی نہ ہو کہ گور مُنہ میں لے سکے
جہاں نہ کوئی فکر ہو، نہ بھوک ہو، نہ پیاس ہو
جہاں نہ میں اُداس ہوں، جہاں نہ تم اُداس ہو

[1] عورت نے خط میں لکھا تھا کہ ٹہل ٹہل کے رات کاٹتی ہوں، شوہر نے یہ اُسی کا جواب دیا ہے۔

[۵۱] تمھارے آنسوؤں کے داغ خط میں جس جگہ پڑے
وہ خط سے میرے دل میں آ گئے، داغ بن کے رہ پڑے
[۵۲] تمھاری عمر ہو دراز، اجل کا نام چھوڑ دو
لحد کے مُنہ میں خاک، مُنہ سے یہ کلام چھوڑ دو
[۵۳] ہوا لحد کے سبزے کی بھرے نہ پھر دماغ میں
ہے سبزہ نرم اور ہرا تمھارے خانہ باغ میں
نہ تم ہو بھولنے کی شے، نہ تم ہو چھوٹنے کی شے
قسم خدا کی، تم ہو دل میں اور دل بغل میں ہے
نظر میں کھُب کے، نور بن کے، تم مری نظر میں ہو
جمال بن کے دل میں ہو، خیال بن کے سر میں ہو
تمھاری مُسکراہٹوں کو یاد کر رہا ہوں میں
کھُلیں نہ دانت، اِس ادا پہ صاد کر رہا ہوں میں
وہ لب، وہ اُن کی جنبشیں مری نظر کو یاد ہیں
وہ ہلکی ہلکی چٹکیاں مرے جگر کو یاد ہیں
وہ ترچھی ترچھی چتونیں ستم کریں پھریں جدھر
وہ کالی کالی پتلیاں، کبھی اُدھر، کبھی اِدھر
وہ بال کھول کر کبھی جھٹک کے سر کو تھامنا
لچک پڑے بدن تو پھر لپک کے در کو تھامنا
لبوں کو اپنے پونچھنا وہ آرسی کو دیکھ کر
نہ پھیل جائے تاکہ رنگ پان کا اِدھر اُدھر
وہ نازکی کہ تم نے کہہ کے یہ اُتاری آرسی
گراں ہے میرے ہاتھ پر، جڑاؤ بھاری آرسی
وہ ناپسند لونگ کا بھنوں چڑھا کے پھیرنا
وہ میری سمت پھر نظر کو مُسکرا کے پھیرنا
گلوریوں کی صورتیں وہ خوشنما نئی نئی
سپید پان اوپر اور اندر اُس کے پستئی

---

۵۱ عورت نے خط میں لکھا تھا کہ میرے آنسو اور خط کے کچھ حرف بگڑ گئے، یہ اس کا جواب ہے۔
۵۲ عورت نے لکھا تھا کہ زندگی سے در گذری، اب میں موت کی تمنا کروں گی، شوہر نے یہ اسکا جواب دیا ہے۔
۵۳ عورت نے شوہر کو لکھا تھا کہ اگر تم آ کے مجھے نہ پاؤ گے تو کیا میری لحد پہ آؤ گے، لحد کے سبزے کو ضرور دیکھنا کہ وہ نرم اور ہرا ہے، سوکھ کے خار نہ ہو جائے، یہ اوس کا جواب ہے،

وہ سادگی تمھاری، بانکپن کو شہ دیے ہوئے
وہ شوخیاں، حیا کو اپنی گود میں لیئے ہوئے
سحر کے وقت پھینکنا گلے سے ہار اُتار کے
بچھونے سے وہ جھاڑنا، گریں جو پھول ہار کے
وہ ہار مجھ کو یاد ہے، کہا تھا دیکھکر جسے
ہیں موگرے کے پھول کم، نہیں ہنتی میں اِسے
کرخت بو ہے، سر میں درد ہوگا، دور ڈال دو
نہیں تو کامنی کے پھول چُن کے تم نکال دو
پلنگ اپنا کھینچکر وہ چاندنی میں لیٹنا
ہوا سحر کی سرد ہو تو جسم کو سمیٹنا
زری کریب سے وہ چڑھ کہ چبھتی ہے یہ خارسی
پسند صرف ململ اور گلبدن بنارسی
وہ چوڑیوں کا پھیرنا، کہا تھا دیکھکر جنھیں
جچھیں گے اِن کے گوکھرو، نہ پہنوں گی کبھی انھیں
کہو، بدل کے لائیں ایسی چوڑیاں، بڑے میاں
کہ تین تین بانکیں، چار چار ہوں کرلیاں
گرا زمرد ایک شب جو ٹوٹ کر بُلاق سے
تم اُس کو ڈھونڈھنے لگیں، چراغ لیکے طاق سے
تمھیں تو وہ نہیں ملا، مگر میں اُس کو پا گیا
دیا تو پھر تمھیں مگر میں اُس گھڑی چھپا گیا
مری ہنسی پہ وہ تمھارا پیچ و تاب یاد ہے
وہ تیوریاں چڑھی ہوئی، وہ اضطراب یاد ہے
غرض، خدا سے ہے دعا کہ تم ہو اور جہان ہو
تمھیں تو میری روح ہو، تمھیں تو میری جان ہو
لہ تمھارا زیور اور آئے میرے پاس لوٹ کر
لگایا تیر طنز کا یہ تم نے دل کو تاک کر

لہ عورت نے لکھا تھا کہ یہ زیور تمھارے ہی لیئے تھا اور تم آکے اسے دیکھتے ہی نہیں، تو اب میں بکس میں بند کر کے تمھارے ہی پاس بھیج دوں، یہ اوس کا جواب ہے،

[1] تمھاری بدظنی بجا، مگر غلط، مگر غلط
یہ آنکھیں بے وفا نہیں تو پڑتی کیوں نظر غلط

نظر میں تم، جگر میں تم، تو کون دخل پا سکے
مکان سب گھرے ہوئے ہیں، کون ان میں آسکے

قسم تمھارے گیسوؤں کی، جن کے پیچ میں ہے دل
قسم تمھارے صاف رُخ کی، جس پہ ہے سیاہ تل

قسم تمھاری پتلیوں کی، جن کی ہر نظر بلا
قسم تمھارے ابروؤں کی، جن کے بس میں کربلا

قسم تمھارے ان لبوں کی، جن کا رنگ لال ہے
قسم تمھارے گھونگھروؤں کی، جن کے پاس جال ہے

قسم تمھارے سر کی، جس کے بال میں بڑے بڑے
قسم نظر کی، سحر جس سے پائے زک اگر لڑے

قسم تمھارے دل کی، جس میں بارہا پھرا ہوں میں
قسم تمھارے وسوسوں کی، جن میں اب گھرا ہوں میں

قسم تمھارے اس سخن کی، طنز جس کا کام ہے
قسم تمھاری اس چھُری کی، ناز جس کا نام ہے

قسم تمھاری اس ہنسی کی، جس سے گُل کھلا کرے
قسم تمھاری اس زبان کی، مجھ سے جو گلا کرے

قسم تمھارے اس غضب کی، سُرخ جس سے گال ہوں
قسم تمھاری اس حنا کی، ہاتھ جس سے لال ہوں

قسم شکن کی، جب جبیں پہ ناز اس کو ڈال دے
قسم صدا کی، بات کو جب اُٹھ کے ساتھ ٹال دے

قسم گلے کی، جس سے زیب موتیوں کے ہار کو
قسم دہن کی، جس کے دانت دیں شکست انار کو

قسم ہے اُنگلیوں کی، دل کو چھین لیں وہ جب میں
قسم ہے رُخ کے ستارے کی، زمیں پہ جس سے گُل کھلیں

قسم ہے بے رُخی کی، جس کو پھر کے رُخ عیاں کرے
قسم ہے خامشی کی، جب نگاہ کچھ بیاں کرے

---

[1] عورت نے اگرچہ اظہار بدگمانی کے ساتھ ہی اپنی زبان پلٹ دی تھی، لیکن اخلاقاً شوہر نے یہ جواب دیا ہے،

قسم ہے تن کی، قدِ آدم آئینہ جسے کہوں
قسم ہے قد کی، جس کا سایہ بن کے کاش میں رہوں
قسم تمھاری چال کی ہے، جس کے ساتھ حشر ہے
قسم قدم کی جنبشوں کی، جن کے ساتھ نشر ہے
غرض تمھارے حُسن کی قسم، یقین مان لو
مرے جگر میں اور دل میں ہو تمھیں، یہ جان لو
یہاں میں آکے پڑ گیا تجارتوں کے پھیر میں
جب اُن میں گتھیاں پڑیں، تو سلجھیں جاکے دیر میں
نہ چھوڑو اپنا آسرا، نہ توڑو دل کو یاس سے
نہ تم اُمید کو ہٹاؤ اپنے دل کے پاس سے
گِلے نہ پھر گِلے رہیں گے مجھ کو پاکے ایک دن
ہنسی بنیں گے سب گِلے لبوں پہ آکے ایک دن
میں خط میں چین بھیج دوں، جو تم کو چین آسکے
نظر تو پا ہی جائے گی، مگر جو دل بھی پا سکے
یہ خط ہے میرے ہاتھ کا، اِسی کو چین جان لو
میں بیسوِیں دن آؤں گا، یقین اس کا مان لو
میں[۱] اِس خبر سے خوش ہوا کہ زندہ ہے چکور ابھی
تمھارے پاس ہے تمھارا وہ حسین مور ابھی
پپیہے[۲] خوش رہیں کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں
جو اب کہیں وہ "پی کہاں" تو تم کہو کہ آتے ہیں
یہ خط تو ختم ہو چکا، پیام اب ہے شوق کا
دعائیں اب ہیں شوق کی، سلام اب ہے، شوق کا

احمد علیؒ، شوق، قِدوائی

---

۱ عورت نے خط میں لکھا تھا کہ چکور جسے تم پال گئے ہو، اسے گود میں لے کے میں تمھیں یاد کرتی ہوں، یہ اوس کا جواب ہے،
۲ عورت نے خط میں لکھا تھا کہ گھر میں انار کا پیڑ ہے، اوس پر پپیہے روز آتے ہیں اور مجھے شرم سے چپ پاتے ہیں تو مجھ پر ترس کھاکے تمھیں پکارتے ہیں، یہ اوس کا جواب ہے،

ضمیرہ

(۲)

ان الفاظ کے ادا ہونے سے قبل نا اُمیدی کی خوفناک تصویر ذہن کے سامنے تھی جس نے بجلی کی طرح دلپر گر کر حواس باختہ کر دیا تخیل نے باصرہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور سائیکولوجی کا ایک مشہور مسئلہ اسطرح حل ہوا کہ ضمیرہ جو بے تابانہ قبر سے لپٹ رہی تھی بالکل خاموش ہو گئی اور اسکو ایسا معلوم ہوا کہ ماں کے محبّت بھرے ہاتھ قبر سے باہر نکلکر اس کے گلے میں آئے اور سینہ سے چمٹا لیا وہ اب چکنی مٹی کے ڈھیر سے چپکی لپٹی پڑی ہوئی تھی آنکھیں بند تھیں اور روحانی تعلق محض تخیلات کی مدد سے یہ یقین دلا رہا تھا کہ اسکا سر ماں کی گود میں ہے۔

ایسے سنسان وقت میں جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوسوں آدمی یا جانور کا پتہ نہ تھا درخت اور اس کے پتے پودے اور ان کے پھول قبریں۔ اور ان کے کہڑے۔ غرض ہر چیز تانبے کی طرح تپ رہی تھی ایک فاختہ نے املی کے درخت پر سے بے ثباتی دنیا کے گیت گانے شروع کئے احسن جو شفیق چچی کی موت اور چچازاد بہن کی حالت زار پر آنسو بہا رہا تھا اسطرف متوجہ ہوا۔ فاختہ دو چار صدائیں لگا کر اُڑ گئی اور احسن نے ضمیرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا بس ضمیرہ چلو بہت دیر ہوگئی۔ اب چچا جان اُٹھ بیٹھے ہوں گے کیسے سخت الفاظ تھے جنہوں نے ضمیرہ کو ماں کی آغوش سے جُدا کر دیا۔ گھبرا کر اُٹھی احسن کو دیکھا اور کہا ہاں چلو۔ احسن مجھے تو ایسا معلوم ہوا جیسے سچ مچ اماں جان نے مجھکو

کلیجہ سے لگا کر اپنے پاس لٹا لیا۔ سچ کہتی ہوں اب تو بے مجھے صبر آگیا اماجان میں سے کیسی دلہنوں کی سی خوشبو آرہی تھی۔

ان دونوں میں صرف ایک سال کا چھوٹا یا بڑا پا تھا اور گو ضمیرہ ابھی آٹھویں ہی برس میں تھی مگر اسکا بلا اجازت اتنی دیر تک غائب رہنا ایسا فعل نہ تھا کہ کسی کو تشویش نہوتی محلہ بھر میں کھلبلی مچ گئی تو ہیں یہ۔ دہ۔ کنبہ بھر امنڈ پڑا۔ کونہ کونہ اور چپہ چپہ دیکھ مارا اگر دو بچے تھے سوئی نہ تھی چاروں طرف آدمی دوڑ پڑے۔ اسبات کا تو کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ یہہ دونوں قبرستان پونہچے ہوں گے +

باپ اگر قلب کی اس کیفیت کو محسوس کر سکتا جو ضمیرہ کو بیتاب کر کے ما کی قبر پرلے گیا تو سوقت دونو ننھے ننھے دل دھکڑ دھکڑ کرتے سامنے آئے ہیں کلیجہ سے لگا لیتا۔ مگر جہاں مادۂ احساس ہی مفقود ہو وہاں شفقت کی توقع ہی نامعقول +

(۳)

دن بیت رہے ہیں اور زمانہ اُڑا چلا جا رہا ہے ضمیرہ کی ما کو مرے تین ساڑھے تین برس ہوگئے ہڈیاں تک گلکر خاک ہوگئیں قبر کا نشان تک نہ رہا مگر اس واقعہ کا نتیجہ یہہ نکلا کہ ضمیرہ اسی روز اور اُسی رات اپنے چچا کے پاس ایک گانوں میں بھیجدی گئی جہاں خدا کے سوا کوئی اسکا رفیق نہ تھا۔ ما کا صدمہ فطرتاً اس کے دل سے زائل ہوتے ہوتے قریب بعدم ہوگیا تھا لیکن زندونکا فراق ایک ایسی مصیبت تھی جسنے مردوں کی یاد قطعی دل سے بھلادی گھر والے لونڈیاں مامائیں مکتب سہیلیاں بھائی بہنیں۔ سب کو یاد کر کر کے روتی اور بلبل تو گرفتار کیطرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتی قدرت نے

جہاں اسکی سرشت میں تحمل دور اندیشی اطاعت و انکسار کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا وہاں یہہ کہنا بھی بیجا نہو گا کہ وہ خلوص اور صداقت کی دیوی جسوقت اپنے تمام عزیزوں کے تعلقات پر ایک محققانہ نظر ڈالتی تو حسن ہمدردی کا تاج سر پر رکھے سچی محبت کے گلدستے ہاتھ میں بیے تمام عزیزوں سے دو قدم آگے ہی دکھائی دیتا۔

ساون شروع ہو چکا تھا غروب آفتاب کے وقت اودی گھٹا آسمان پر چھا گئی ضمیرہ اسوقت صحن میں بیٹھی تھی اور برابر کے گھر والے لڑکی بالیوں کے ملہار گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

برسات کے دن جھٹ پٹا وقت ملہار کی آواز اور ضمیرہ کا مغموم دل وہ خیالات کے ایسے دریا میں غوطے کھا رہی تھی جسکی کہیں تھا نہ تھی اسوقت اسکو اپنے چھوٹے حقیقی بھائی کا خیال آیا جسکو ماں چار برس کا چھوڑ کر مری تھی اور جسکی صورت دیکھے ضمیرہ کو تین سال سے زیادہ ہو گئے تھے اسکی پیاری پیاری صورت بھولی بھولی باتیں اسوقت بہن کا کلیجہ مسوس رہی تھیں وہ سوچتی تھی کہ جوان اور بڑھیا مائیں تو دنیا میں مرتی آئی ہیں مگر یہ ستم کسی پر نہیں ٹوٹتا کہ ماں کے ساتھ باپ بھائی کی صورت کو آنکھیں ترس گئیں۔ میں تو خیر جو پڑی وہ بھی جو گذرے گی وہ بھگتونگی مگر ضمیر کی مٹی کیسی پلید ہوئی وہ نگوڑا تو پہلے ہی ابا جان کے نام سے سہمتا تھا۔ گھر میں گھسے اور وہ دبکا یوں ہی وہ اس کے نام سے جلتے تھے اتنا حکم نہیں تھا کہ اِن کے سامنے ہول لم کرے۔ امّاں کی شرما شرمی چپکے ہو جاتے تھے تو کیا اس کے رونے سے تیوری پر بل آہی جاتا تھا اب کون بیٹھا ہے جو بہلائے گا چوڑا میدان ہے جو چاہیں گے وہ

کریں گے۔ میں بھی اچھی تقدیر لیکر آئی کہ کوئی لمحہ خوشی کا گذرا ہی نہیں۔ میں نے کس منت سے کہلا بھیجا تھا کہ دن بھر کے لیے ضمیر کو میرے پاس بھیجدیجئے میرا دل اس کے دیکھنے کو تڑپ رہا ہے مگر کان دھر کر سنا بھی تو نہیں چھوٹے چچا جان نے وعدہ کیا تھا کہ جمعہ کو آئے گا لو آج جمعہ چھوڑ پیر ہوگئی مگر ان کا جمعہ ہی پورا نہ ہوا ایسی میرے نام کی کیا جلتوائی پڑ گئی کہ گھر بار۔ کنبہ محلہ سب ہی تو چھٹا یا ہی تھا۔ بھائی بہنوں سے بھی الفظ کروایا۔ موئے قیدیوں کی طرح اس کھنڈلے میں پڑی سڑا کرو

(۴)

صبح کا سہانا وقت تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ضمیرہ نماز سے فارغ ہو کر قرآن شریف لے کر بیٹھی تھی کہ یہ آواز اس کے کان میں آئی

"آپا جان کہاں ہیں"

مری ہوئی ماں کی یادگار سر بدلے کا سربرسوں کا چھوٹا ہوا بھائی ضمیر کی اس آواز کا کان میں آنا تھا کہ ضمیرہ بیتاب ہو کر دوڑی اور بیقرار ہو کر لپٹی دیکھتی ہے تو بھائی چوڑا آپ کپڑے شور بہ شور سردی کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے اندر لائی مگر بھائی کی صورت اور حالت دیکھکر اسکا دل کٹ گیا اسوقت ماں کی تصویر اس کے سامنے تھی اس کی شفقت اور بھائی کی حالت دونو ملکر اس کا کلیجہ مسوس رہی تھیں آج ضمیرہ کو یہ یقین ہوگیا کہ "ماں پسنہاری اور باپ لکھہ پتی"

جس ڈیوڑھی پر تین تین چار نوکر حاضر جس دروازہ پر رتھہ۔ نالکی پالکی۔ گھوڑے۔ تانگے موجود۔ جس باپ کی ایک ہوں پر بڑے بڑے آدمی آنکھیں بچھانے کو تیار اسکا بچہ اس کیچڑ پانی مینہ اور طوفان میں

کہ چاروں طرف سے دہواں دہوں دیواریں گر رہی ہوں اس چمک اور کڑک میں کہ بجلی آنکھوں نہیں گھس رہی ہو۔ اکیلے پانچ کوس کی منزل پیدل کاٹ کر اور رستہ میں بیٹھ بیٹھ کر طے کرے۔ ضمیرہ کو اسوقت وہ دن یاد آئے جب ماں اسی گرج میں دونوں تینوں بچوں کو لے مرغی کی طرح دُھر اندر کمرے میں لیجا اپنے برابر بٹھاتی بھائی کو پیار کیا اس کے کپڑے اتارے مگر بدلتی کہاں سے ان ہی کو نچوڑ نچار الگنی پر ڈال دیا۔

ضمیر کچھ تو بچپن کچھ اتنے روز کی جُدائی اور سب سے زیادہ بہن کی محبت بھری گود کلیجہ سے لگتے ہی بلک گیا۔ بھائی بہنوں کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں جسوقت ضمیر نے یہ لفظ کہے ہیں کہ آپا ابا جان تو طوطے کی طرح ویدے بدل گئے ان کی نگاہ میں ایک کتا بھی مجھ سے بہتر ہے تو ضمیرہ کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مدتوں کے بچھڑے اور بے ماں کے بہن بھائی مل مل کر روئے اور لپٹ لپٹ کر ملے۔

رو دہو چکے تو ضمیر تھکا ہارا تو تھا ہی بہن کے پاس لیٹتے ہی سو گیا۔ ضمیرہ بھائی کو پنکھا جھلتی رہی اس کی صورت دیکھ دیکھ کر کلیجے پر گھونسے لگ رہے تھے فرط محبت میں بیتاب ہو کر پیار کرنے کو جُھکی تو دیکھتی کیا ہے تمام پیٹھ پر مار کی بدھیاں پڑی ہوئی ہیں۔

(باقی)

(راشد الخیری)

آہِ رسا

ذرا پہلو میں بیٹھو اور یہ منظر دیکھتے جاؤ (بند اول) کہ دل کے ساتھ اک عالم ہی مضطر دیکھتے جاؤ

کہاں تک صبر ہو آخر یہ دل ہے کوئی پتھر ہے — تم اپنی بے رخی اللہ اکبر دیکھتے جاؤ
یہی دورِ دوام اور پھرتے ہو آج تم ساقی — ذرا ساغر بکف ہمکو مکرر دیکھتے جاؤ
کہاں جاتے ہو قومِ جاں بلب کو چھوڑ کر تنہا — بھرے آتے ہیں آنسو اور دم بھر دیکھتے جاؤ
ہماری شکوہ سنجی پر یہ کہنا کیا قیامت ہے — دکھاتا ہے ابھی کیا کیا مقدر دیکھتے جاؤ
ابھی دیکھا ہے کیا تمنے جو ہمت ہار دیتے ہو — ترقی کرتی ہے یہ قوم کیونکر دیکھتے جاؤ
نتیجہ میں ہمیں ملجائیں گے دنیا و دیں دونو — کتاب علم اخلاق پیمبر دیکھتے جاؤ
جو آئے ہو تو اب ان مرنے والوں کا حال بھی پوچھو — ذرا گورِ غریباں کا بھی منظر دیکھتے جاؤ
نظر نیچی کرو سوچو تو کیا تھے یہ ہوا اب کیا — پڑے ہیں کچھ شکستہ کاسۂ سر دیکھتے جاؤ
صدا ٹوٹی ہوئی قبروں سے آتی ہے ذرا ٹھیرو — ہماری بیکسی کو اور دم بھر دیکھتے جاؤ
بہت نازک دماغ اس خاک کی بستی میں سوتے ہیں — نہ لگ جائے کسی تربت پہ ٹھوکر دیکھتے جاؤ
خزانے علم و حکمت کے پڑے ہیں گوشہ گوشہ میں — ابھی دیکھا ہے کیا تم نے ٹھہر کر دیکھتے جاؤ
انہیں قبروں میں پاؤ گے مہ و خورشید کے جلوے — یہاں سے اور وہاں تک تم برابر دیکھتے جاؤ
حروفِ لوحِ تربت دیکھکر بھر لائے کیوں آنسو — ہر اک فقرہ میں ہے عزت کا دفتر دیکھتے جاؤ
وہی رہتی ہے یا بڑھتی ہے رونق انکی قبروں کی — ذرا اک سورۂ الحمد پڑھکر دیکھتے جاؤ
زمانہ کی روش پر کیوں نہ پرکار قدم اٹھیں — اگر تم گردشِ چرخِ ستمگر دیکھتے جاؤ
چلو اب آئینہ خانہ میں لیکر ساغرِ منت — نشانِ عہدِ جمشید و سکندر دیکھتے جاؤ
ہم آمادہ ہیں دیکھو تم بھی تو کچھ اپنی زینت کو — سنواریں ہم جو تم آئینہ لیکر دیکھتے جاؤ
لگی دلکی بجھائی تم نے کیونکر کیا زباں کہیے — تمہارے تو بجھے جلتے ہیں تیور دیکھتے جاؤ

(زبانِ حالی سے ختم اب ضبط کی میعادیں ہو گئی ہیں ✦ سنو گر تم سن رہا ہے تو مجھکو فریاد کرتے ہیں
جناب مرزا محمد ہادی عزیز)

کرمان کا محرّم

مسٹر ہیوم گریفتھ نے ایران، وعراق، عرب، کی زمانہ قیام کی سرگذشت اور وہاں کے حالات جو قلمبند کیئے ہیں حقیقت میں دلچسپی سے خالی نہیں اگر اونکی تحریر سے اسلام پر حملہ ہوتا ہے تو ہم اونکو معذور سمجھتے ہیں اسوجہ سے کہ ایک غیر مذہب والے کو دوسرے کے مذہبی حالات وعادات سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنی آسان نہیں کسی قوم کے افراد کے بعض برائیوں کو مذہب سے متعلق کرنا کوتاہ بینی ہے ایسی غلطیاں اکثر وبیشتر سربرآوردہ یوروپین مصنفوں سے سرزد ہوتی ہیں مسٹر ہیوم گریفتھ کا غلطی نہ کرنا ہی تعجب تہا قطع نظر ایسے سطحی خیالات کے جو واقعات مسٹر ہیوم گریفتھ نے قلمبند کیئے ہیں وہ ضرور دلچسپ ہیں۔ چنانچہ ماہ محرم کی عزاداری کا واقعہ جو اس کتاب میں اپنا چشم دید لکھا گیا ہے اوسکا ترجمہ درج ذیل ہے +

ماہِ محرّم غم کا مہینا ہے جس میں تمام شہر شہداۓ کربلا حضرت امام حسن وامام حسین فرزندان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ماتم کرتا ہے۔ حضرت علی کی نسبت اہل شیعہ کا خیال ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جائز اور مستحق جانشین تھے۔ ایام عشرہ شریف میں اکثر وبیشتر لوگ ماتم کرتے ہیں اور بعض وقت بازاروں میں بھی سیاہ کپڑے لٹکائے جاتے ہیں۔ ایران میں بہت بڑا ماتم اس مہینے میں ہوتا ہے۔ جب ہم کرمان میں تھے تو خوش قسمتی سے یہاں کے عزاداری دیکھنے کا ہمکو بھی موقع ملا۔ درحقیقت یہہ ایک ایسا منظر ہے جو کم از کم زندگی میں ایکبار قابل دید ہے۔ محرم کی دسویں تاریخ امام

تقریب کے لیے مخصوص ہے جسمیں عام تعطیل ہوتی ہے تاکہ بانئے اسلام کے نواسوں کی رحلت کی یادگار میں جو میلہ ہوتا ہے اوسکو تمام لوگ دیکھہ سکیں کرمان کے گورنر نے براہِ مہربانی اپنے مکان سے اس تماشہ کو دیکھنے کی ہمیں دعوت دی اور اوس روز تخمیناً آٹھہ بجے صبحکو ہمارے لیے اپنی سواری کی گاڑی بھیجدی۔ گاڑی میں سوار ہوکر بازار کی بھیڑ بھاڑ سے گزرتے ہوئے ہم گورنر صاحب کے (ارک) مکان کو پہنچے۔ گورنر صاحب کے قیام گاہ کو کرمان ارک کہتے ہیں۔ ایک پرائیوٹ راستہ سے داخل ہونے کے بعد ہم ایک بڑے ورانڈے میں بٹھائے گئے جو فرنگیوں کے استعمال کے واسطے مخصوص کیا گیا تھا۔ چونکہ اوسوقت صرف ہم دو شخص (زن وشوہر) ہی اس شہر میں یوروپین تھے لہذا ہم دہی اس مکان میں رہے +

تماشہ کے قبل چار۔ کافی۔ مربّہ۔ روٹی۔ پنیر اور کیک سے ہماری مدارات کی گئی۔ باہر کا منظر حیرت انگیز تھا۔ روبرو ایک وسیع باغ تھا جہاں میرا قیاس ہے کہ تقریباً دس ہزار نفوس جمع ہوں گے۔ باغ کے ایک حصہ میں بڑے حوض پر شامیانہ استادہ کیا گیا تھا اوس کے قریب ایک بڑے ممبر پر مجتہدین وعظ کہہ رہے تھے اور کوشش کیجا رہی تھی کہ لوگوں کے غم والم میں زیادہ رقت پیدا کیجائے خاص کرکے ایک شخص اپنی کوشش میں کامیاب نظر آیا یعنے اوس کے وعظ سے عورتیں وحشیانہ طور پر رونے اور دیوانہ وار سینہ کوبی کرنے لگیں اور مردوں نے اپنا سر پیٹنا شروع کیا۔ ایک گھنٹہ کے وقفہ سے بڑے جلوس کے ساتھہ تماشہ کی ابتدا ہوئی۔ اس جلوس نے باغ کے آخری حصہ سے داخل ہوکر

ادھر اُدھر سے پھر پھرا کر تمام باغ میں گشت لگایا - امام حسینؑ اور اون کے بھائی کی رحلت کے بعد اون کے خاندان نے ایک مقیدانہ حیثیت سے جو سفر کیا یہ جلوس گویا اوسکی نقل تھی سب سے پہلے چھہ اونٹ آراستہ و پیراستہ نمودار ہوئے جن کے سوار دف بجاتے اور خوفناک آوازیں کرتے جاتے تھے اس کے پیچھے اور اونٹ گھوڑے خچر بار برداری کے سامان ڈیرے وغیرہ سے لدے ہوئے تہے بعد ازیں چار نعشوں کو آدمی اُٹھا کر لائے جسپر چار مردے تہے (گھانس پہوس سے دبے ہوئے) یہ امام حسینؑ اور اون کے تین بھائیوں کی نقل تھی جنہوں نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس سے وفات پائی چونکہ دشمنوں نے انپر پانی بند کر دیا تھا - ہر ایک لاش پر ایک کبوتر بٹھایا گیا تھا جسکی نسبت یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ماتم میں ہے پہر ایک اور خوفناک منظر نظر آیا جو دوبارہ دیکھنے کے لائق نہیں ہے - تخمیناً ایک سو آدمی دیوانہ وار براگیختہ لمبے لمبے سفید کرتے پہنے ہاتوں میں برہنہ شمشیریں لیے اپنے سروں پر آپ زخم لگاتے جاتے تہے یہانتک کہ خون اون کے چہرو نپر بہتا ہوا سفید کرتوں کو سرخ کر رہا تھا - یہہ جماعت حوض کے پاس پہنچتے ہی اوسکے اطراف صف آرا ہو کر تہوڑے عرصہ تک اس خوفناک جنگی ناچ میں مصروف رہی - یہہ بڑا مہیب منظر تھا - ایک بیچارہ خون سے بیہوش ہو گیا جسکو وہاں سے اٹھا کر لیجانا پڑا - ایک آٹھہ برس کے عمر کا لڑکا بھی ضعف سے گر پڑا - نوجوانوں ہی کو اپنے آپ زخمی کرتے دیکھنا مہیب تھا بجاے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اسطرح زخمی ہوتے دیکھنا - یہہ کام بڑی فضیلت کا سمجھا جاتا ہے جس قدر گہرے اور زیادہ زخم ہوں گے اوسیقدر زیادہ اون کی فضیلت ہے - یہہ کام اوس وقت تک جاری رہا جبتک کہ گورنر صاحب نے ان لوگوں کو اشارہ سے کہا کہ ہم نے خوب کچھ دیکھا بعد ازیں یہہ لوگ ورانڈے کے روبرو جہاں گورنر صاحب تشریف فرما تہے قطار بند

کھڑے ہو گئے اور استدعا کی کہ پانچ نفر مشہور قیدی جیل سے جو قریب ہی تھا رہا کیے جائیں۔ گورنر صاحب نے اوسیوقت اون کی خواہش پوری کی۔ چونکہ اس موقع پر یہ رواج ہے کہ یہ لوگ جس قیدی کے رہائی کی خواہش کریں اوسکو جیل سے گورنر رہا کرے۔

اس مہیب منظر کے بعد مختلف اشخاص کی ایک جماعت جسمیں بچے بوڑھے گھوڑوں پر سوار تھے سینہ اور سر پیٹتے ہوئے آئے بعض انمیں سے ایسے پست قامت اور چھوٹے تھے کہ خدمتگاروں کو انہیں گھوڑوں پر سنبھالنا پڑا اس کے بعد ایک اور مردہ نعش پر لایا گیا جسکے ہمراہ شیر کا چمڑا پہنے ایک شخص تھا جو مردہ کو پیار کرتا اور سینہ سے لگاتا جاتا تھا۔ اس مصنوعی شیر کا اپنے دوست یا مالک کی لاش کو بوسہ دینا اور سینہ سے لگانا اور اوسکی موت پر مختلف پیرایہ سے غم و درد کا اظہار کرنا جادو کا اثر رکھنے والا منظر تھا۔ پھر لڑکوں کے چند گروہ سینہ کوبی کرتے آئے جنکا جسم کمر تک برہنہ تھا حقیقت میں یہ خوش نما نظارہ تھا کیونکہ لڑکے بہت موزونیت سے کام کرتے تھے گویا بچوں کی جماعت جمناسٹک کی مشق کر رہی ہے ایک لڑکا مثل افسر کے تھا اون کے ہات ایک ساتھ سینہ کوبی کرتے تھے جس سے تیز آواز نکلتی تھی اور ساتھ ہی وہ حسین حسین کہکر پکارتے تھے تمام تماشہ دلچسپ مگر مغموم منظر تھا جو کبھی دل سے نہ بھولے گا۔

تلواروں کی جھنجھناہٹ دن کی آواز عورتوں کی واویلا اور چیخ پکار لوگوں کا شور و غل یہ تمام بحیثیت مجموعی مشرقی زندگی کا ایک قابل یادگار منظر ہے۔

محمد حفیظ الدین خاں

نوٹ۔ مضمون کی صحت اور روایت کی ضعیفوں کی ذمہ داری مصنف پر ہو۔ مترجم۔

عالمِ ارواح سے

عورتونکی

صدا

عالمِ فانی کے بسنے والو، تمہاری ناپائدار دنیا تمکو مبارک، ہمارا تمہارا ساتھ یہیں تک تھا، ہم چلے اور وہاں چلے جہاں سے آنا نہیں، چھوٹے، اور ایسے چھوٹے، کہ اب یہ صورتیں تمکو نظر نہ آئینگی، تمہاری عمریں چمنستانِ حیات میں سدا بہار پھول نبکر کھلیں، اور آسمانِ زندگی پر قمرِ چہاردہم ہوکر چمکیں،

بزمِ دنیا کے روشن فانوسوں، ہم نہیں ہیں، مگر ہماری دعائیں تمہاری ساتھ ہیں، تم ہم کو بھول گئے مگر تمہاری یاد ہمارے دلسے نہیں جاتی، قدرت نے ہمکو وہ دل نہ دیے تھے، جو عارضی جذبات کا گھر ہوتے، ہماری طبیعتیں ایسی طبیعتیں نہ تھیں، جو ایک دفعہ ہاتھ پکڑکر ساتھ چھوڑ دیتیں، یہ ٹوٹی پھوٹی قبریں اور ویران کھنڈر، جنھیں تم اپنے ہاتھ سے ہمکو سلا گئے دیکھ رہے ہیں کہ یہ مجروح دل جو ہمارے مردہ جسم میں موجود ہیں آجتک تمہارے خیال سے غافل نہیں ہوئے دنیا ہم سے چھوٹ گئی، تمہاری صورتیں ہماری آنکھ سے اوجھل ہوچکیں، مگر ! ہماری روحیں لذتِ محبت سے آشنا ! مرکر بھی دردِ فراق کو نہیں بھولتیں !!

سرزمینِ ہندوستان، جو آج زندہ دل اور مردہ دل دونوں پر ناز کر رہی ہے، جسمیں وہ جواہرات مدفون ہیں جنکی روشنی تمام دنیا کو جگمگا گئی، ہمارے لیے نمونۂ دوزخ تھی ! ہم ازلی بدنصیب تھے، نامراد رہے اور ناشاد اٹھے، قدرت کے انعام

ہمارے واسطے مصیبتیں ہوئیں اور یہ دنیا جو تمہیں نصیب، اسکی دلچسپیاں، ہمارے لئے آفتیں چار دیواری کی حکومت پر راج کرنے والے بادشاہوں، بادِ بہاری کے ٹھنڈے جھونکے، جنھوں نے جنگلوںمیں پھول اور باغوںمیں کلیاں کھلائیں، ہمارے کلیجوں میں نشتر بنکر چبھے اور تیر ہو کر رہے، چاند مدتوں سر پر چمکا، تارے برسوں سامنے دمکے، مگر حسرت نصیب دل کی کلی قبر تک نہ کھلی، تمہیں سازگار مگر ہمارے لیئے وبال جان تھی، وہ دنیائے ناپائدار، جس کے ارمانوں نے، تادم واپسیں ساتھ نہ چھوڑا، عمر اس طرح بتیس سانس نکل گیا، مگر آرزوؤں کے کانٹے جیتے جی پہلوؤں سے نہ نکلے، ہم انسان تھے مگر کیسے انسان؟ کہ کبھی اطمینان کی مسکراہٹ ہمارے ہونٹوں پر نہ کھیلی، رنج والم کی گھٹائیں جھوم جھوم کر آئیں اور کھل کھل کر ہمارے دلوں پر برسیں مگر اسکی بوچھاڑ زبان تک نہ آئی، یہانتک، کہ دکھ بھری دنیا نے ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کو رخصت کر دیا!!

ہماری رام کہانی تمہارے دل ہلا دیگی یہ وہ بپتا ہے جو تمہارے ہاتھوں ہمیں پڑی، دنیا، اور دنیا کے دھندے، فرصت دیں، تو سنلو، انصاف، اور انصاف کی آنکھیں، اجازت دیں تو پڑھو، اور سوچو، کہ کیا کیا، اور کیسا کیا،

سرائے دنیا ابھی ہم سے کوسوں دور اور منزل مقصود میلوں پرے تھی، کہ قدرت کے انتظام نے، ہمارے آنیکا مژدہ، تم تک پہونچا دیا، دنیا دار مہمان نوازوں، تم نے ہمارے آنیکی تیاریاں مہینوں پہلے کیں، محبت کے ہاتھ ہمارے لینے کو بڑھے، اور قدردانی کی آنکھیں ہم پردیسیوں کی راہ دیکھنے لگیں، مگر! اے خود غرض انسانوں، وہ سب تمہارا دھوکا تھا، تم جس چیز کے منتظر تھے وہ کچھ اور تھی، تم ان بیٹوں کے امیدوار تھے! جو ظلم و ستم کے دسترخوان پر نفس پروری کے کھانے چنیں، اور ہمارے حقوق غصب کر کے ہمکو انسان سے جانور بنا دیں،

ہمارا دنیا میں قدم دھرنا تھا، کہ تمھاری آرزوؤں پر پانی پھر گیا، تمھارے ارمان دل کے دل میں رہے، اور جس گھر میں مہمان کی آمد کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا وہاں سناٹا سا چھا گیا، سوچو، اور بتاؤ! ہمارے ننھے اور معصوم دلوں پر کیا گذری ہوگی؟ جب میزبان طوطے کی طرح دیدے بدل گئے، جن سے امید شفقت تھی، وہ ہماری موت کا! انتظار کرنے لگے!!!

اب اگر کوئی ہمارا رفیق شفیق تھا تو، ماں کی گود، ! وہ گود! جس کے ہر پہلو سے بوئے محبت آتی تھی، وہ الفت بھری، نگاہیں، جنہیں ممتا کے سوا، کچھ نہ تھا قیامت تک یاد رہے گا وہ وقت، جب وہ گود ہم سے چھوٹی، اور زمین نے اپنی آنکھیں ہمارے قدموں کے نیچے بچھائیں!

اسوقت کی ہماری زندگی عجیب زندگی تھی، ہر دن ہمکو بتا رہا تھا کہ ہم ارذل المخلوقات ہیں، ماں باپوں کی آنکھیں ہمکو سبق دے رہی تھیں، کہ بیٹے چمکتے ہوئے لال، اور، بیٹیاں بھاری پتھر،

اسپر بھی ہمارے صاف دل، اور پاک روحیں، تمہاری اطاعت سے منہ نہ موڑتیں، ہم گھر کے کام دھندوں میں لگے لپٹے رہتے، اور جہانتک ہمارے ہاتھ پاؤں مدد دیتے ہم تمہاری خدمت سے جی نہ چراتے،

یاد ہیں وہ دن، جب گرمی کے جلتے بھلتے دنوں میں ہم چولہے میں گھسے مارا مار کر کھانا پکایا، اور اس خیال سے کہ ابا جان کو دیر نہ ہو جائے، وقت سے پہلے لا رکھا، بھر بھر مٹھی روپے لینے والی ماماؤں تک آنکھ چرا گئیں مگر ہماری آنکھ میں میل نہ آیا،

بزرگو، عزیزو، بھائیوں، اور بندو، اس محبت کا ثمر، اس خدمت کا اجر ملا کہ "ماں کے گھر بیٹی، گور در بیٹی"

بہتر سے بہتر کھانے، اچھی سے اچھی چیزیں، بھائیوں کو ملیں اور ہم نے اُف نہ کی، ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے رہے کہ بچا کھچا کھانا، ہم کو ملا، ہماری زبان پر شکایت نہ آئی، جو ہاتھ اوٹھا کر دے دیا وہ سر جھکا کر لے لیا،

بتاؤ! ہمارے دل کیا کہتے ہونگے، جب بے وجہ بے قصور، بھائیوں نے ہمیں گھرکیاں، جھڑکیاں دیں، اور ہم دل مار کر بیٹھ گئے، وہ مائیں جنھوں نے دکھ سہہ کر مصیبتیں بھر کر ہمیں پالا، پوسا، وہ بھی فرنٹ ہو گئیں، کونوں میں دبک دبک کر ہم روئے اور اوڑھنیوں سے آنسو پونچھ پونچھکر چپکے ہو گئے

معزز ماباپو، یہ وقت سدا رہنے والا نہ تہا، ہم تمہارے مہمان تھے اور ہمارا تمھارا ساتھ چند روز کا تہا، ہمیں ایک نئی دنیا بسانی، اور دوسرا گھر دیکھنا تھا، آخر وہ وقت آگیا، جب اس، ناپائدار دنیا نے، ہمکو تم سے جدا کیا مگر ہمارے دل دیکھو، اور اس فرمانبرداری کی داد دو، جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا اسکو سر کا سرتاج سمجھا اور روتے بلکتے تمہاری دہلیز سے رخصت ہوگئے

اب ایک دوسری دنیا ہمارے سامنے تھی، مگر تجربہ کی آنکھوں نے جو دیکھا اس کے خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، ہماری زندگی مصیبت ناک زندگی تھی، ساس نندوں کے برمے ہمارے کلیجو نپر تہے، اور سوکنوں کے تیر ہمارے سینوں پر ا

افسوس اے فانی! او ناپائدار دنیا! تجھ میں رہ کر کوئی گھڑی چین کی نہ گذری جو ہاتھ اس امید پر پکڑے تہے، کہ ساتھ دینگے وہ بے وفا نکلے تڑپ تڑپ کر عمریں کاٹیں، اور جل جل کر دن پورے کیے وہ چاردیواری جسمیں ٹھنڈی اور میٹھی ہوا کے جھوکے بھول کر بھی نہ پھٹکتے ہمارا مسکن ہوئی، اور وہ دو تین معصوم جو ابتدائی محبت کے یادگار رہتے ہمارے رفیق +

میکے کا زمانہ ایک خواب تھا، بھلا یا برا جیسا گزرا بساغنیمت، سسرال، اس خواب کی تعبیر تھی، اور نکاح بلا کا گھانی کی تصویر، قدرت کا منشا، جو کچھ ہو، مگر تمہاری غرض ہمپر حکومت، کرنی تھی، نت نئے ظلم توڑے، اور طرح طرح کی مصیبتیں ڈھائیں دنیا کی دلچسپیاں، قدرت کے انعام، ہمپر حرام ہوئے، اور ہمارے فرائض تمہاری خدمت ٹھیرے، اور حاصل زندگی تمہاری اطاعت،

ہمنے کیا نہ کیا؟ تمہارے اشارہ پر آنکھیں بچھائیں، تمہارے بچوںکو پالا، اور جوان سی جان گھلا گھلا کر تمپرسے قربان کردی دنیا عالم خواب میں ہوتی اور ہم عالم اضطراب میں، عمر کی بہت سی راتیں آنکھوں میں گئیں، اور زندگی کے بہت سے دن بھلس بھلس کر گذرے۔

آخر دل پھوڑا اور دنیا وبال ہوگئی، سنگدل شوہر دل! تمہارے ظلموں نے ہمارے ہاتھ اٹھوا دیئے، کہ الہ العالمین، اب ہمکو موت دے، اور ان مصیبتوں سے نجات، ہماری دعائیں قبول ہوئیں، اور وہ قدرت جو تم سے زیادہ ہماری مددگار تھی ہماری حمایت پر اٹھی اور ہمارا فیصلہ کردیا۔! جن بچوں کے ساتھہ جانیں لڑی ہوئی تھیں، جن کو آنکھہ سے اوجھل کرنے کا دم بھر بھی دل ہولدار نہ تھا، انکو خدا کے سپرد کیا،

خواب غفلت میں سونیوالو! خود غرضی کا پردہ اٹھا کر دیکھو! آسمان و زمین کا ایک ایک کونہ تمہارے ظلموںپر روتا ہے اور سرزمین ہندوستان کا ایک ایک چپہ ہمارے صبر کی داد دے رہا ہے اب بہت نزدیک ہے وہ وقت جب اس زبردست شہنشاہ کا دربار تمہارے سامنے ہوگا۔ جسکی بہترین مخلوق کو تم نے بدترین بنا دیا!

راشد الخیری۔

تازہ غزلیں

رات ہے رات تو اس سرخوش اوقات کی رات
گریۂ شوق کی یا ذوقِ مناجات کی رات

ہے شبِ قدر سے دعویٰ مساوات کی رات
ہمدلایان درِ پیرِ خرابات کی رات

گریۂ غم ہے کہ ساون کی جھڑی تا دمِ صبح
کوئی موسم ہو یہاں رہتی ہے برسات کی رات

کچھ ہمیں سمجھیں گے یا روزِ قیامت والے
جسطرح کٹتی ہے امید ملاقات کی رات

صبح ہوتی ہے کوئی دم میں وہ آئے بھی تو کیا
نہ کسی کام کی رات اور نہ کسی بات کی رات

اب تو پہولے نہ سمائیں گے کفن میں **آسی**
ہے شبِ گور بھی اوس گل کی ملاقات کی رات

بالیں پہ یاس بیٹھی - رک رک کے رو رہی ہے
اب آرزوئے جاناں - پہلو میں سو رہی ہے

رنگ شکستہ حالی - ہے میرے رخ سے ظاہر
اے آہ مفت تو کیوں - بدنام ہو رہی ہے

اے چشمِ تر نہ کیوں کر ممنون رہوں میں تیرا
عصیاں کے داغ میرے - دامن کے دھو رہی ہے

دیکھا جو تجھکو یادِ ابرو میں دل بھر آیا -
کشتی ہلال تیری - مجھکو ڈبو رہی ہے

کہتی ہے سب سے خاکِ آسودگانِ مرقد
یاں آرزوئے جاہ و مکنت بھی سو رہی ہے

کیا تو بھی ہے جوانی سے دخترِ رز بتانا
خلقِ خدا جو تیری - دیوانی ہو رہی ہے

اے عندلیب ناداں تو اور حسرتِ گل!
کیوں اپنے حق میں کانٹے - کمبخت بو رہی ہے

ہے حالِ زار تیرا - دل بے قرار تیرا -
اے شمع کس کے غم میں - تو شب سے رو رہی ہے

یہ آرزو تمہاری - یہ جستجو تمہاری
دنیا و دیں سے مجھکو - بیجان کھو رہی ہے

اے محبِ جاہِ قومی ڈر ہے کہ تیری ناؤ
وہ بھی ہے نہ ہمت لیکے جو رہی ہے

آمیزشِ عناصر سے ہے اے **شباب** لازم
کیا غم جو عمر اپنی - برباد ہو رہی ہے

[illegible]

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عِصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عِصمت سے بہتر سہیلی عِصمت سے بہتر شفیق رفیق عِصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عِصمت اُن کو بتلائے گا کہ کوارپتے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انہیں کیا تیاریاں کرنی ہے۔ جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کیساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں۔ غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پر لطف و اطمینان بسر کرلنے کے واسطے عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب۔ بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عِصمت ہی عِصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُنکی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عِصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے غرض عِصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائے گا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا عِصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ہر مہینہ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول مُفتی میں سالانہ قیمت (۳ روپے)

منیجر عِصمت و تمدن

(دہلی)

جلد (۲) جون سنہ ۱۹۱۱ء نمبر (۳)

تمدّن

معاشرتی ۔ تمدّنی ۔ ادبی ۔ فلسفی ۔ اخلاقی ۔ تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر: شیخ محمد اکرام ۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت سالانہ ۔ قسم اوّل ۱ روپے ۴ آنہ قسم دوم ۱ عہ

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹

قیمت فی پرچہ ۴ر

کتبہ احقر ۔ ابوظفر حامد میرزا دہلوی

تمدن

یہ ۷۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں

تمدن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہے۔

تمدن ایک اکسٹرا لبرل پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالٹکس سے علٰحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہو سکتا کہ تمدن اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہونگے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں +

تمدن دو قسم کے کاغذ پر اوّل اور دویم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اول ۲ روپے قسم دویم ۱؎ نمونہ کا پرچہ (۴۰/)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنہوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا

دختر صاحبہ صاحبزادہ عبدالمجید خاں صاحب۔

مولوی ابو حامد سید محمد صاحب مہدوی

مولوی سید تصدیق احمد صاحب۔

مولوی سیف الدین صاحب شباب

منشی محمد احسن صاحب سب انسپکٹر۔

منیجر تمدن و عصمت

(تمدن پریس دہلی)

تمدّن

تمدّنِ اسلام

نمبر ۲

نمیگویم درین گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یا راز من

عرب جس نے تاریخ اسلام کا باالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، یا تاریخ اسلام میں محض صدرِ اسلام اور قرونِ اُولیٰ کے روشن ابواب پڑھے ہیں، اوس کی نظر میں یہ مسئلہ مسلمات کی وقعت رکھتا ہوگا۔ کہ جن قوموں کی تاریخ عہدِ پیشین میں یا اون کے اسلام لانے سے پیشتر جیسی تاریک، جہالت، اور وحشیانہ رسوائیوں کے واقعات سے پُر تھی، قبول اسلام کے بعد اسلام نے ویسی ہی اون کی کایا پلٹ کرنے میں اپنی اوس زبردست روحانی طاقت کا کرشمہ دکھایا ہے، جسکی نظیر پیش کرنے سے ادیانِ سابقہ نہ صرف قاصر ہی ہیں بلکہ اون حیرت خیز

کامیابیوں کو جو اسلام نے وحشی، اور غیر مہذب اقوام کے اخلاق، اور اصول معاشرت کی اصلاح کرنے، اور انہیں شائستہ اور مہذب بنانے میں حاصل کی ہیں، صداقت اسلام کا ایک معجزہ مانتے ہیں،

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور و معروف قوم عرب ہے، جو قبل ظہور اسلام ایک بادیہ نشین، جنگجو، سرکش اور جاہل قوم تھی، جلادت، قساوت، لوٹ، مار غرض پردۂ دنیا پر انکا کوئی ہمسر نہ تھا، آن پر جان دینا جنکا مذہب، اور خدا کی جملہ نافرمانیاں جنکا خاصّہ تھا، نہ کسی شرع کا اپنے حکم تھا، نہ کوئی، قانون حاوی، اور نہ کسی دوسرے ملک سے ان کا تجارتی یا کسی قسم کا واسطہ و رابطہ تھا، بس مختصر یہ کہ نہایت یہ تھی اور ان کی بداعمالیوں کا بندھا ہوا جال اعوام الجلاد کے سوا یہ خود بھی اپنا قدم کبھی جزیرہ عرب سے باہر نہ نکالتے تھے، کیونکہ زمانہ میں قیصر و کسرے کا دبدبہ سطوت زبان زد عام خاص تھا۔ جو دور کے ڈھول کی طرح ہر ایک کا دل دہلانے کو کافی تھا، جن کا نام آتے ہی یہ لوگ جھکتے تھے،

اس گھٹاٹوپ تاریکی میں دفعتہً آثار صبح نمودار ہوئے، اسلام کا ستارہ افق پر چمکا، قدسیوں نے فضا بسیط میں بزم عیش رچائی مرغ سحر نے خوش آمدید کا ترانہ گایا، ادہر نسیم سحر نے سُریلا نغمہ چھیڑا۔ اور بہزار جاہ و جلال اوس خورشید برج رسالت نے طلوع اجلال فرمایا، عالم کا روپ دوبالا ہو گیا، اوسوقت نہایت بلند آہنگی سے توحید کا شور مچا، جس کی آواز کون و مکان میں گونجی، ختم رسالت کا غلغلہ ہوا جسمیں اوس ندائے غیب کی موالد ملائکہ نے ہم نوائی کی، سرکشوں کی گردنیں جھک گئیں، دیو پر رعب چھا گیا انقیاد نے قدم بوسی کی، اعتقاد نے دست بوسی، الفت، محبت، اشتیاق،

وصداقت کا جام سب نے پیا اور گلے ملے جس سے دلونمیں راستہ ہوا جہاں اختلاف اور عداوت باہمی کی گھٹا چھائی تھی، وہاں آیہ رحمت" اذ کنتم اعداً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" نے برق کی صورت دامن ابر چاک کیا، جسکی روشنی میں اعجاز تھا۔ اور اوس آواز میں ازل کے فراموش شدہ عہد الست کی یاد کا چٹخارا، جس کے اثر نے عرب کی سب متفرق قوتوں کو لاکر لواء اسلام کے نیچے مجتمع کر دیا،

جہاں سے یہ تیغ آزماؤں کا لشکر فتح ونصرت کا پھریرا اوڑاتا ہوا، اعلاء کلمۃ اللہ کرتا ہوا بڑھا راستہ میں جن قدموں سے دوچار ہوئے اگر ہنگامہ آرائی کی نوبت آئی اور بآسانی اونہوں نے ہتھیار نہ دھرے، اون کے مورچوں پر قبضہ کر لیا، جنھوں نے پناہ چاہی، اون کی جان و مال کی مثل اپنے جان ومال کی حفاظت کی اور جو اسلام لائے اونپر اپنا جان و مال تصدق کرنے کو طیار ہوئے، غرضکہ اسیطرح ملکوں ملکوں کی خاک چھانی دریا پیرے، پہاڑ پھاندے۔ سفر کی مشقت، راہ کی صعوبت کو خاطر میں نہ لائے اور اعلاء کلمۃ اللہ کیا جس سے مظفر ومنصور کھلائے۔ قیصران روم وکیاسرۂ عجم کی سلطنتوں میں جہاں طوائف الملوکی۔ اور بدامنی کا عمل و دخل تھا انصاف وعدل، امن وامان کی بنیادیں ڈالدیں، جنپر آگے چلکر عدالت کے عالیشان ایوان تعمیر کرائے جس سے خلافت ثانیہ تک کی قلیل مدت میں مشرق میں گنج مغرب میں سواحل بحر اٹلانٹک شمال میں نہرلوار اور جنوب میں وسط افریقہ تک خلافت اسلام کے اثر میں آگئے،

وہ عرب بداوت جنکی سنت آبار تھی، اور جسکا خون اون کی رگونمیں دوڑتا تھا حضارت مدنیت کے گرویدہ ہوئے تو ایسے کہ بڑے بڑے

عظیم الشان شہر مثل قرطبہ و بغداد کے انہوں نے آباد کیئے، جن کی عظمت اور رونق کا نقش بقار تاریخ تک زمانہ کی پیشانی پر چمکے گا، تمدن کے باب میں وہ ترقیاں کیں، کہ شاید و باید، تجارت گاہیں کہولیں، منڈیاں لگائیں، جہاں ہر ولایت کا قیمتی اور عمدہ مال آکر بکنا شروع ہوا، صنعت و حرفت کے طریقے جو اپنے سے ایجاد کیئے اون کی اشاعت کی دوسروں کے طریقے خود سیکھے، اور اسطرح ان ممالک کو اپنی اقتصادی ترقیوں، اور بیش بہا عملی کوششوں سے زرخیز، آباد اور سرسبز ملدوں کا گھر بنادیا، جہاں ہر فن کے ماہر، ہر کمال کے جاننے والے، ایک سے ایک بڑھکر موجود تہے۔

بہر حال جب یہ (عرب) وہاں ٹہیر گئے جہاں شاہان عجم کا جبروت انہیں موسم کی سختیوں سے تنگ آکر بہی طوعاً و کرہاً ٹہیرنے دیتا تھا۔ اور جو بہر ان کی آیندہ نسلوں کا مولد و مسکن بن گیا، تو ان کے دل و دماغ میں بوئے نفاست و تکلف پسندی بسنے لگی جو اہل عجم کے خصوصیات تہی، جس نے پرتکلف اسباب آرائش و آسائش دولت سراؤں میں موقعہ موقعہ سے جمایا، دیبا و حریر، قاقم و سنجاب، کی پوشاکیں کشتیوں میں لگاکر شوق کے تمیز دار ہاتہوں سے پیش کرائیں، خوان پرالوان پر لطیف و لذیذ اقسام کی نعمتیں چنیں جسے ذائقہ نے خواب میں بھی نہ چکھا تھا، مگر!

بیداری عقل، اور ہمت مردانہ نے انہیں اسیر بہی عیش و عشرت کا ایسا چسکا نہ لگنے دیا، جو تہذیب و ترقی کے لیئے کسی حد تک بدنما ٹہیرتا، اونہوں نے مہمات سلطنت کے انصرام، سپاہ و رعیت کی دلجوئی، اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح، الغرض امور سیاست اور نظم و نسق سلطنت میں ایسی خوبی سے دلچسپی لی، کہ تمام دنیا نے اُن کے انتظام اور بیداری کو مان لیا،

وہ دماغ جو قیامت برپا کرنے والے جوش و خروش کا سرچشمہ خیال کیے جاتے تھے، اونہیں تحمل و برداشت کا جز و دیکر ایسا معتدل خمیر تیار کیا، جو اہم معاملات کے سلجھانے، اور مشکل مواقع کو سر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ سینے جنہیں علم بالانساب یا اسلاف کے فخریہ کارناموں، اور گذشتہ معرکوں اور محاربات کا دفینہ تھا، اونمیں علوم و فنون، عقل و نقل کے لعل و جواہر کا خزانہ بھر دیا، جسمیں اگر عقل یونانی سے استفادہ کیا گیا تھا، تو یہاں کے فلسفۂ یمانی کا اوسپر اضافہ ہوا،

قصہ مختصر ایسی قوم سے جسکی استعداد و صلاحیت عرصہ سے مفقود ہو رہی تھی ایسے ایسے مشاہیر علمار، فضلار، خطیب، متقنن، مدبر، سپہ سالار، ارباب قلم، اور فلاسفر، پیدا کر دکھائے، کہ جنھوں نے اپنے کمالات سے ایک عالم کو نقش حیرت بنا دیا۔ اگرچہ اب زمانہ کے انقلاب، اور انتزاع سلطنت نے اون کے وہ سب خصوصیات سلب کر لیں۔

ترک وسط ایشیا میں ہندوستان، چین۔ اور سیبریا کے مابین ایک ملک ہے جو ترکستان کہلاتا ہے، اور وہاں کے باشندے ترک ہیں،

قوم ترک بھی عربوں کیطرح اہل بادیہ تھی، مگر ترک عربوں کی طرح غیر متمدن اور با حمیت نہ تھے۔ جسکا ثبوت اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ عجم میں عام طور سے ترک لونڈی غلاموں کے مصرف میں لائے جاتے تھے جنھیں بردہ فروش ترکستان سے لاکر عجم میں جاریہ اور غلام بنا کر دولتمندوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ اور اس تحقیر و تذلیل کی زندگی پر وہ راضی و خوش چلے آتے تھے، کہ عرب فاتحین کا پرچم اقبال ترکستان کی چوٹیوں پر لہرایا، جن کے قدموں کی ادنیٰ برکت یہ تھی کہ ان کے پہونچتے ہی مفتوحہ ممالک میں روشنی تہذیب پھیلنے لگتی تھی، کیونکہ ان کے فتوحات کا منشار دوسرے

غارتگر فاتحین کیطرح مال غنیمت سے پیٹ بھرنا، اور قوم مفتوح کی دولت لیکر اپنے گہر کی راہ لینا نہ تہا، یہ جہاں جاتے تہے، اسلیے جاتے تہے۔ کہ قوموں کو قعر جہالت، اور تاریکی و ادبار سے ابھاریں، روشنی عقل دکھا کر سیدہے راستہ پر انہیں چلنا بتائیں، چنانچہ جن جن ملکوں میں ان کا گذر ہوا، اون کے ویرانوں کو آباد، سنگلاخ وادیوں، اور بیہڑ جنگلوں کو چمن زار بہشت بناتے ہوئے آئے۔

قاعدہ ہے کہ جو ہونہار اور صلاحیت مند ہوتے ہیں، اہل ہنر اور ارباب فضل و کمال کو دیکھتے ہی، اور اونکا فیض صحبت اوٹھاتے ہی اون کے دلوں میں خود بخود اون کی ریس اور پیروی کا شوق دامنگیر ہوتا ہے، ترکوں کے طبائع میں بھی ترقی و شایستگی کی صلاحیت مخفی طور سے موجود تہی عربوں کے آنے نے اِس جوہر نہاں کے ساتہ تازیانہ کا کام کیا جن سے میل ملاپ ہوتے ہی راہ ترقی میں انکا قدم آیا۔ اور پہر تو یہ ایسے پھلے پھولے، کہ چودہویں کا چاند ہوکر چمکے، جس کی روشنی سے ایک عالم کو فیض پہونچا، فارس، عراق، مصر، شام، ایشیا رکوچک قسطنطنیہ افغانستان، اور ترکستان، کے ممالک میں ان کی زبردست سلطنتیں قائم ہوئیں، جنکی تعداد کا شمار جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے تیس سے زائد ہے اور جنمیں سے مشہور سلطنتیں طولونیہ، ایلکیہ، اخشیدیہ، غزلویہ، سلجوقیہ اور اتابکیہ، تہیں،

وسعت میں اونکا حکم ایشیا سے وسط یورپ تک جاری و نافذ تھا +

علم و کمال کے اعتبار سے بھی انمیں بڑے بڑے اکابرین فن اور ارباب فضل و کمال علما، کملار اور فقہا، ہوگئے ہیں، جنکی فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں،

اور نکتہ نوازیوں کی دھوم تھی، جنکی تحقیقات دماغ، اور مخلوقات فکر سے مشرقی دفتر علوم میں ایسے نمایاں اور قابل قدر اضافے ہوئے کہ جن سے مشرق کا لٹریچر کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا،

فن تعمیر کے اعتبار سے بھی ترکوں کے عہد کو خاص امتیاز حاصل ہے، چنانچہ اوس عہد میں اونہوں نے ایسے مساجد، مدارس، ایوان، و قصر، تعمیر کرائے تہے، کہ جس صنعت کے نمونے کبھی پہلے چشم فلک نے بھی نہ دیکھے تھے، بعض تاریخی عمارات ممالک مصر و شام و عراق میں اب بھی اس "تمدن" کی یادگار اور بقاء عظمت کے طور پر اپنا وجود پیش کرتی ہیں، جنکی زبان حال اپنے انقلابات کی داستان ایک تاریخ داں و وسیع النظر سیاح کو سناتی ہے جب وہ اس کی گذشتہ عظمت کا خیال دلمیں لیکر اون کا طواف کرتا ہوتا ہے، فقط

باقی آئندہ

خانغالی۔ ندوی

انتھراپالوجی کے قریب قریب تمام علماء اس مسئلہ پر متفق الرائے ہیں کہ عورت و مرد سوسائٹی کی ابتدائی ساخت میں مساوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کا میلان اس طرف ہے کہ اکثر جگہ عورت مرد سے فائق تھی۔ فزیالوجی نے چونکہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے وجود سے قدرت کا منشاء بقاء نوع اور حفاظت اولاد ہے اس لیے اس کے کام سوسائٹی میں بہ مقابلہ مرد زیادہ اہم اور وقعت سے دیکھے جانے کے قابل ہیں یہ خیال کہ عورت اور مرد کا پیمانۂ دماغ مختلف ہوتا ہے ٹھیک نہیں معلوم ہوتا ڈاکٹر بوک تر بہت زیادہ تحقیقات کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچا ہے۔

میاںؔ بی بی

خان بہادر مولانا شاد مدظلہ نے مرثیہ حبیب ابن مظاہر میں میاں بیوی کے تعلقات کی جو تصویر کھینچی ہے بیساختہ اسکی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ان کی بی بی جس کا پچاس برس سے زیادہ کا ساتھ ہے انہیں سراسیمہ و پریشان دیکھ کر گھبراتی ہے۔ زندگی میں کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ نئی بات نے اسکا دل تہہ و بالا کر ڈالا ہے اور آخر اس راز کو دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہیں تو (۳) بند۔ مگر اللہ اکبر کس قیامت کے ہیں تیسرے بند کے چھٹے مصرعہ نے تو بجلی گرا دی۔ جس پر حبیب ابن مظاہر بھی آخر بیچین ہو گئے۔ اس ایک مصرعہ "کیا مدینہ کی کوئی تم نے خبر پائی ہے" ؟ نے حبیب کے کیرکٹر اور حسینؑ سے اون کے اندرونی تعلقات کو صاف صاف بیان کر دیا۔

حبیب جواب دیتے اور موقعہ و وقت کو جتا کر بہ مصلحت کہتے ہیں۔ کہ "کیا کروں کیا نہ کروں مجھکو خیال اپنا ہے" اس فصیح و بلیغ بیان پر پیرزن جو کچھ جواب دیتی ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ سلیم

سست پایا جو بہت ان کو تو زوجہ نے کہا "آن دنوں کیا ہے جو بدلا ہے تمہارا نقشہ ؟

"تم میں پہلی سی بشاشت نہیں باقی اصلاً وہ ہنسی ہے نہ وہ اخلاق کی باتیں ہیں فدا"

کیا سبب جان سے ہاتھوں کو جو یوں دھوئی ہو
آنکھیں کیوں لال ہیں سچ تو کہو کیا روئے ہو ؟"

"رکھے رکھے ہوا کل دن کا بھی کھانا سب سرد شب کو فاقہ جو کیا چہرے کی رنگت ہوئی زرد"

دوراد حال کوئی رنج ہے دلمیں یا درد؟ “دل ہے نازک مرا۔ کلپانہ زیادہ ائی مرد”

تیرے ہی سر کی قسم جی سے گذر جاؤں گی

اب چھپائی ہے کوئی بات تو مر جاؤں گی

چین سے سوتے ہو را تو نکو۔ نہ دن کو آرام ا “میں تو ڈرتی ہوں کہ اچھا نہیں اس کا انجام”

صاف ظاہر ہے کہ ایسا ہی ہے مشکل وہ کام” جب تو دم بھر کا بھی آرام ہوا تم پہ حرام”

ہو نہ ہو بات کوئی ایسی ہی پیش آئی ہے

کیا مدینہ کی کوئی تم نے خبر پائی ہے؟”

اب حبیب ابن مظاہر کو بھلا تاب کہاں مختصر طور سے کرنے لگے یوں حال بیاں

“ہے لڑائی کا جو حاکم کی طرف سے ساماں” وجہ یہ ہے کہ حسین ابن علی آتے ہیں یاں”

گھر سے اس موسم گرما میں چھڑایا ہے انہیں

اہل کوفہ نے بہ اصرار بلایا ہے انہیں”

“یوں بلانے کو بلایا یہ دلو نہیں ہے فساد” “پھر غضب یہ ہے کہ حاکم ہے یہاں ابن زیاد”

“دیکھئے آپ یہاں آئیں تو کیا ہو آفت” “بے سبب بھی مرے آقا سے ہر اک کو ہے عناد”

“ہر گھڑی جان کا کھٹکا ہے یہ حال اپنا ہے

کیا کروں کیا نہ کروں مجھ کو خیال اپنا ہے”

سن کے یہ حال بصد جوش یہ زوجہ نے کہا “اسطرف آتے ہیں فرزند نبی شکر خدا”

رونق افروز ہوں یارب کہیں جلدی آقا” ہے جگہ فخر و مباہات کی ڈرنا کیسا”

مال و زر چیز ہے کیا۔ جان فدا کرتے ہیں

جو ہیں دیندار وہ اس دن کی دعا کرتے ہیں

“جان دینا تو رہ حق میں ہے آسان سا کام” “اے زہے بخت جو آقا پہ تصدق ہو غلام”

میں و لِن پردہ نشین ہوں نہیں کچھ اسمیں کلام” “یہ نہ ہوتا تو بتاتی کہ وفا کس کا ہے نام”

حکم اللہ و نبی سے ہوئی مجبور ہوں میں
ہائے افسوس کہ نصرت سے بھی معذور ہوں میں

"راتدن تم تو جپا کرتے تھے صاحب یہی نام
تم تو کہتے تھے کہ عشق انکا ہی عین اسلام
نہیں مقبول یہ غیر ان کی ولا کے کوئی کام"
ایسے ہی ہوتے ہیں دنیا میں وفادار غلام"

یہ خبر سنکے محب بھی کہیں گھبراتے ہیں۔
سجدہ شکر بجا لاؤ حسین آتے ہیں"

خوب روئے یہ سخن سن کے حبیب ذیشاں
گر پڑے پاؤں پہ اس صالحہ کے گریہ کناں
یوں لگے کہنے کہ میں سبط نبی پر قرباں"
"ہوں نثار آپ پہ میں۔ مجکو تو خود تھا ارماں"

آزماتا تھا کہ نیت میں تمھاری کیا ہے
کسکو انکار ہے اس سے کہ حسین آقا ہے"

"یہ سنو گی کبھی اسوقت سے تشویش کا نام"
مرنے والے جو ہیں گھبرانے سے ان کو کیا کام"
کہا زوجہ نے کہ"۔ ای آل پیمبر کے غلام
شب سے کھایا نہیں دو حکم تو لے آؤں طعام

ہوئی بشاش جو شوہر سے اجازت پائی
وہ زن صالحہ جلدی سے غذا لے آئی

شاد عظیم آبادی۔

ایک فلاسفر کی رائے ہے کہ صداقت اور آوارگی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر کسی ذہین شخص کو ایسے موقع میسر نآئیں کہ وہ اپنا ایجو کام انجام دیتا تو یہ یقین کر لینا چاہئیے کہ اس سے ضرور ایسے افعال سرزد ہوئے ہوں گے جو سوسائٹی کے واسطے نہایت مضر و تکلیف دہ ہوں اس لیئے سوسائٹی کا پہلا یہ فرض ہے کہ وہ ان طبیعتوں کو جنمیں خلوص اور صداقت کا مادہ موجود ہے اس کے کام میں لانے کا موقع دیں + ۔

سیّد جمال الدین الافغانی[۱]

"لَیْسَ الْفَخْرُ لِمَنْ یُحِبُّ الْوَطَنَ بَلْ لِمَنْ یُحِبُّ الْعَالَمْ"

فخر اس شخص کو ہی زیبا نہیں جو اپنے وطن سے محبت کرے بلکہ اسکے لیے ہے جو تمام عالم کو چاہے

اسلامی دنیا کی بیداری، کیا ترکی و ایران میں، کیا مصر، مراکش و ہندوستان میں، کیا کریمیا و کوہ قاف میں، جو تیس چالیس سال کے عرصہ سے مذہبی یا سیاسی رنگ میں ظاہر ہو رہی ہے، اسمیں بلاشبہ فتوحاتِ جاپان نے ایک کہربائی توجّہ پیدا کر دیا، جاپان کے نمایاں کارناموں نے تمام عالم میں غلغلہ ڈالدیا کہ اگر مشرقی قومیں بھی یورپین ساز و سامانِ جنگ سے آراستہ ہوں تو یورپ کی زبردست سے زبردست فوج کو بھی سامنے نہ ٹہرنے دیں۔ پچاس سال ہوئے ضیا پاشا، شناسی آفندی اور کمال بے نے خرقہ کہنہ اتار کے آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا، ینی ترکلر، یا ینگ ٹرکش کے طبقہ کی بنیاد ڈالی اور حکومتِ مشروطہ کا نقشہ کھینچا۔ پندرہ سال کی جان توڑ کوشش و کاوش کے بعد، ۲۳- دسمبر ۱۸۷۶ء کو کانسٹیٹیوشن کا افتتاح ہوا، لیکن عثمانیوں کی بدقسمتی کہیے یا مسلمانوں کے طالع کی پستی، جنگ روس و ترکی چھڑ جانے اور پھر سلطان عبد الحمید کی استبداد و مطلق العنانی نے تمام آرزوؤں کا جنازہ اٹھا دیا خدا کی قدرت، دفعتہً اقبال ترکی کا شہباز ہوائے "مشروطیت" میں بلند پرواز ہوا دنیا کو اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ یک بیک نہایت شاندار طریقہ سے ۲۴- جولائی ۱۹۰۸ء کو قصر یلدیز پر گرا۔ قوم کے لیے جو مارِ سیاہ تھا اوسکو گوشہ نیستی میں بھیجدیا۔ اور پارلیمنٹری گورنمنٹ کو از سرِ نو زندہ کیا، غم کا سینہ چھلنی ہوئے

[۱] ماخوذ از انقلاب ایران مصنفہ پروفیسر براؤن ۱۲

جاتا ہے اور دلپر سانپ سا لوٹے جاتا ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ اِس واقعہ نزہت افزا سے ایک ماہ قبل شاہِ ایران اور اس کے ہم نوا روس نے ایران کی پہلی مجلس کا شیرازہ بکھیر دیا، مصر کی تحریکِ ملی یا نیشنل مومنٹ جس کا طلوعِ آفتاب ۱۸۸۱ء میں ہوا اور جو نصف النہار پر عربی پاشا کی بغاوت سے پہنچی، اور جسکا زوال ۱۸۸۲ء میں ہوا۔ علی ہذا دولت فارس میں بھی بیداری کا سامان عرصہ دراز سے ہو رہا تھا، اور ہمیں اسکی تلاش میں تاریخ کے بہت سے ورق اُلٹنے پڑتے ہیں ۱۸۹۱ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے عہدِ حکومت میں "تمباکو کے ٹھیکہ" کے برخلاف نہایت کامیابی سے بے چینی و اضطراب ہوا۔ یکلخت تمام ایرانیوں نے تمباکو کا استعمال چھوڑ دیا، یہ انکی بیداری کا بنیادی پتھر تھا مخلوق ایران آفات گوناگوں جھیل کر ۱۵۔ اگست ۱۹۰۶ء کو اپنی ٹانگوں پر کھڑی ہوگئی تھی، لیکن گردشِ فلک نے کچھ زمانے کے لیے ایسا ورق الٹا کہ کتمِ عدم میں پہنچا دیا۔ ۲۳۔ جون ۱۹۰۸ء کو روسی کوڈاٹا۔ یا حکمت عملی کے زبردست مدد نے بہارستان (ایرانی ہاؤس آف پارلیمنٹ) کو قلعہ شکن توپوں سے خاک کا تودا بنا دیا۔ لیکن مجاہدین و فدائیان ایران نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا اور لکھوکھا جانیں قربان کر کے بالآخر ۱۶۔ جنوری ۱۹۰۹ء کو "مشروطیت" ایران کا جھنڈا دار الخلافہ فارس میں گاڑ دیا، یہ تو سب کچھ ہوا لیکن ان جمہوری خیالات کا شائع کرنے والا کون تھا؟ کس نے مملکت ایران میں صورِ اسرافیل پھونکا۔ اور ایرانیوں کو گہری نیند سے بیدار کیا کہ اٹھو اپنے ملک، اپنی قوم کی خبر لو اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگا دو! اتحادِ اسلام کا داعی کون تھا! یہی غیبی فرشتہ سید جمال الدین الافغان تھا، جسکی زندگی کے کارنامے مختصراً ہدیہ ناظرین "تمدن" ہیں۔

سیّد جمال الدین کے مقام پیدائش کے متعلق اختلاف ہے، ناظم الاسلام مصنف "تاریخ بیداری ایرانیان" اور ایک اور یورپین محقق، جنرل شنڈلر تو اس امر پر متفق ہیں، کہ سیّد اسد آباد جو ہمدان کے قریب ملک فارس میں ہے پیدا ہوئے، لیکن سید کی ذاتی تحریر سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۸ء میں اسد آباد جو کنار کے قریب افغانستان میں واقع ہے تولد ہوئے، ان کے والد سید صفدر جنکا سلسلۂ نسب "سید علی الترمذی" سے ملتا ہے ایک ہمہ دان فاضل تھے ولادت باسعادت کے کچھ زمانہ بعد معہ اہل وعیال شہر کابل میں آئے اور سکونت اختیار کی۔ ہونہار بچے نے اوائل عمر میں ہی انتہائے ذہانت اور طباعی کے جوہر دکھائے۔ جب آٹھویں سال میں قدم رکھا، بسم اللہ ہوئی۔ اور نیک نہاد استاد نے بچہ کی تعلیم اپنے دامنِ شفقت میں لی اور دس سال تک اسکا تار نہ ٹوٹنے دیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم عقلی ونقلی میں کامل مہارت حاصل کرلی، سیر وسیاحت کی امنگ دلیں آئی، ہندوستان آئے جوانی کی بہار کا زمانہ، جوش و ترنگ خون میں لہریں مار رہی تھی، ہمہ گیر ذہن کا یہ عالم کہ جو نئی بات سامنے آئے وہ دماغ میں محصور ہوجائے۔ جدتِ طبع کی یہ کیفیت کہ اسمیں سے چار باتیں نئی پیدا کرے، ہندوستان آئے تھے مکہ جاتے تھے۔ لیکن علوم مغربی کے ذوق وشوق نے ایک سال تک یہیں رکھا، اسمیں آگاہی حاصل کرکے حج بیت اللہ کو گئے اور وہاں سے سیدھے وطن مالوف کو واپس آئے۔ دوست محمد خاں اسوقت امیر کابل تھے سیّد کے محامد وفضائل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور معقول عہدہ پر ممتاز فرمایا۔ مہم ہرات میں امیر کے ساتھ تھے، امیر کی عمر نے وفا نہ کی۔ اور ایک سال بعد دنیا سے سفر کیا، امیر شیر علی انکا جانشین ہوا۔ بداندیش

مشیروں کی صلاح سے بھائیوں کو قید کرنا چاہا، خانہ جنگی ہوئی۔ امیر محمد اعظم اور ان کے بھتیجے امیر عبدالرحمن نے حملہ ہائے آستانہ اور چپقلشہائے افغانانہ سے دار الخلافہ پر قبضہ کر لیا، اور امیر افضل علی پدر عبدالرحمن کو غزنا سے رہا کر کے تخت پر بٹھایا، لیکن یہ بھی ایک سال بعد راہی ملک بقا ہوا۔ اب امیر محمد اعظم کا دور دورہ ہوا۔ سید جمال الدین کی جانفشاں خدمتیں اور اعلیٰ تدبیریں سفارش کو آئیں، اور کرسی وزارت پر جلوہ افروز کرایا۔ سید موصوف اپنی دانش و بینش جہاں نما سے تمام ملک کو شیر و شکر کر دیتا، اور فرزانگی حسن و تدبیر سے تمام سرداروں کی گردنیں اطاعت میں جھکوا دیتا، لیکن امیر محمد اعظم کی کوتاہ بینی اور اقارب سے سوظنی و حسد نے تیر تدبیر کو نشانہ پر نہ بیٹھنے دیا۔ بھائیوں حتے کہ بیٹوں کو مہمات ملکی و نظام دولت سے بالکل الگ تھلگ رکھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا جو ناتجربہ کار اور نالائق تھا ناک کا بال بنا ہوا تھا، غرور کا فرعون اور ظلم کا شداد تھا،

اسی اثنا میں محمد اعظم کے ایک بھتیجے نے چچا کے سامنے سرخرو ہونے کے خیال سے امیر شیر علی پر جو قندھار پر قبضہ و تصرف کئے بیٹھا تھا یلغار کی لیکن جوشش شجاعت میں دو سو سواروں کے ساتھ صدر سے جدا ہو گیا۔ امیر شیر علی کے جنرل یعقوب خاں نے جو بڑا ہی تجربہ کار آئین جنگ سے واقف تھا، جوشیلے جوان کو گرفتار کر لیا، شیر علی یہ صورت حال دیکھ کے شیر ہو گیا ادھر گورنمنٹ ہندوستان نے دام و درم سے مدد پہنچائی، پھر کیا تھا، ملک رزم گاہِ شیر دلان افغانستان بن گیا۔

امیر محمد اعظم کا ستارہ نحوست زوال میں آیا اور امیر شیر علی نے گئی ہوئی سلطنت پائی۔ امیر عبدالرحمن نے بخارے کیطرف قدم اٹھائے۔ اور

امیر محمد اعظم نے نیشاپور کی سمت باگیں ڈالدیں۔ سیّد جمال الدین وہیں رہے اور چونکہ ایک تو سیّد نژاد تھے اور دوسرے لوگوں پر ذاتی اثر بھی رکھتے تھے، اس لیئے شیر علی کا دل نہ ٹھکا کہ انپر وار کرے۔ حکومت میں انقلاب ہونے کے تھوڑے دنوں بعد اس سرزمین سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ صلاحِ وقت بھی یہی تھی کہ اس شہر وبال گزندگاہِ کمال سے نکل چلیں، چنانچہ نکلنے کا رستہ یہ نکالا، کہ روضۂ پاک کی زیارت کے لیے اجازت چاہی سنئے امیر نے اجازت دے تو دی لیکن اس شرط پر کہ براہ نیشاپور نہ جائیں ۱۸۶۹ء میں ہندوستان آئے سرکار دولت مدار نے بہت عزت کے ساتھہ مہمانداری کی۔ اور ایک ماہ کے سیر و سفر کے بعد باعزاز و اکرام سویز جانے والے جہاز میں رخصت کیا۔

سکندریہ آئے اور پہلی بار قاہرہ گئے۔ چالیس دن قیام کیا بیت العموم "اظہر" روز جاتے اور طلبا و مشائخین سے صحبتیں گرم کرتے۔ کچھ دنوں چیدہ چیدہ کو خلوت میں بلایا اور جواہر معانی کے خزانے کی سیر کرائی مکہ معظمہ جانے کے عزم کو ملتوی کیا اور قسطنطنیہ پہنچے، علی پاشا اس زمانہ میں وزیر اعظم تھے وہ اور اور خوانین سلطنت بڑی مدارات سے پیش آئے یہاں گوشہ میں بیٹھ کے عقل و دانش کا چراغ روشن کیا۔ علوم و فنون کے درس میں دل بہلانے لگے۔ چھ ماہ اسیطرح گذرے، علم و عمل نے گمنامی کی چادر اُتاری۔ ترکش اکاڈمی یا "انجمن دانش" نے ممبری کا اعزاز بخشا۔ ۱۸۷۰ء کے اختتام مطابق ۱۲۸۵ء ہجری ماہ رمضان میں سیّد موصوف کا ستارۂ قسمت آسمانِ شہرت پر چمکا، حسن آفندی ڈائرکٹر دارالفنون نے انہیں طلبا کے آگے اڈریس دینے کے لیے مدعو کیا۔

زبان پر پورے قادر نہونے کی وجہ سے عذر معذرت کی، مگر صاحب ڈائرکٹر کے اصرار پر منظور کر لیا۔ ترکی زبان میں اڈریس تیار کیا، نیف پاشا، صفوت پاشا، وزیر صیغہ تعلیم، اور شروانی زادہ وزیر پولس کی خدمت میں بغرض ملاحظہ بھیجا۔ ان سب نے پسند کیا۔ ظاہر پرست اور بوالہوس ملائے حسن فہمی آفندی شیخ الاسلام کی آنکھ سید موصوف کو نہ دیکھ سکی، اور اس کے دل میں حسد کا شعلہ بھڑکا چاہتا تھا کوئی تدبیر بن آئے تو سید کے کمال پر خاک ڈالے، اور ان کا اثر جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا تھا، زائل کر دے۔ سید موصوف نے معینہ وقت پر سلطنت عثمانیہ کے امراد اعیان، مدبران ملک و وقائع نگار اور طلبا و شائقین کے انبوہ کثیر کو اڈریس دیا۔ حسن فہمی تو موقع کی تاک لگائے بیٹھا تھا کہ کوئی نکتہ گرفت میں آئے تو حریفانہ حربہ چلائے۔ چنانچہ جب سید موصوف نے اپنے اڈریس میں باڈی پالیٹک کو ذی روح جسم سے نسبت دی اور اس کے مختلف ہنروں اور پیشوں کو مختلف اعضائے سے تشبیہ دی اور استعارۃً بیان کیا کہ انسان و ملنع کو بادشاہ تصور کرلو اس کے بازوؤں کو آہن گر، اس کے جگر کو کسان، اس کے پاؤں کو ملاح وقس علی ہذا اور مقطع کا بند یہ نکالا۔ اسطرح انسانی سوسائٹی کے وجود نے ترکیب پائی ہے لیکن وجود بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا اور اس وجود کی روح "نبوی فلسفی استعداد ہے، اور انکا مابہ الانتیاز یہ ہے کہ اول الذکر خدا کی دین ہے جو ریاضت سے حاصل نہیں ہوسکتی لیکن موخر الذکر مطالعہ اور وسعت خیال سے حاصل ہوسکتی ہے، انمیں ایک اور یہ بھی فرق ہے کہ نبی عیب و خطا سے مُعرّا ہوتا ہے لیکن فلاسفر غلط کاری اور خطا سے معمور ہے"۔ حسن فہمی جو قرابادین قدرت کا عجیب نسخہ تھا ان لفظوں کو

کو سے اُڑا۔ اور زبان کی تلوار کھینچ کے پل پڑا۔ غریب سیّد پر عجیب عجیب طوفان اُٹھائے، یہ تہمت لگائی کہ مرتبہ نبوت کو ہنر یا پیشہ سے منسوب کرتا ہے اور نبیوں کو "کاریگر" و "ہنرور" نام دہرتا ہے۔ مُلّا نوں میں بڑے کچا کے ہوئے اخبار دل نے دل کھول کے اسپر حاشیے چڑھائے، دونوں طرف کی پارٹیوں میں خوب مورچے بند ہے، گورنمنٹ ترکی نے یہی صلاح دی کہ سیّد کچھ دنوں کے لیے "عثمانی زمین" کو خیر باد کہیں اور اس طرح اس فساد کا جو بہروں کے شاد سے اُٹھایا تھا خاتمہ کردیں۔ ارادہ یہ تھا کہ خلق خدا ملک خدا مصر ہی میں نہیں رہونگا، جدہر جی چاہے گا چلا جاؤنگا لیکن کمال کے قدر دانوں نے وہیں پلکوں کو بچھادیا اور آنکھوں پر بٹھالیا۔ علم کے پیاسے اطراف و اکناف سے جوق جوق آنے لگے حکمت کے بستان سرا نے اس صحبت میں اور ہی طراوت دکھائی۔ فلسفہ و الٰہیات۔ نجوم و عرفان، فقہ و حدیث کے اعلیٰ اعلیٰ نکتے شیر و شہد بنکر بہنے لگے، اور کانوں کے رستہ دلیں اُتر گئے۔ شمیم شہرت ملک میں پھیل گئی۔ کوہِ کمال و دریائے دانش نے رموزِ فن تحریر سے روشن دلوں کو آگاہ کیا، اور ادبی فلسفی، مذہبی اور پولٹیکل آرٹکل لکھوانے شروع کیے، جس ملک میں سے دے کے نئی طرز کے دو چار ادیب تھے وہاں سینکڑوں عبد اللہ پاشا فخری، محمد پاشا، مصطفٰے پاشا دہی اور خیری پاشا پیدا کر دیئے۔ زمانہ کے مزاج کی تاثیر ہے کہ وہ کسی کے اوج کو ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتا، ایک طرف نوا ولڈ اسکول کے غلط نما باکمال مولوی فلسفہ جدید کا شہرہ عام دیکھ کے بدک پڑے اور تکفیر و تفلیل کے تیر برسانے لگے اور دوسری طرف لارڈ ڈویان سفیر انگلستان کو ان کی طبیعت کی ترقی

اور پولٹیکل رموز شناسی سے کھٹکا ہوا کہ کہیں اسرار سیاسی پر متوجہ نہ ہوں غرض اس قسم کے سامان پیدا ہوئے کہ بیچارے میدان عالم میں نکل کھڑے ہوئے اور حیدر آباد آئے "رد ملاحدہ" لکھا اسی اثنا میں عربی پاشا کے جھنڈے تلے حق پرستوں نے خدیو مصر کی فضول خرچیاں اور خودمختار حکومت کے خلاف تحریک کی، غیر اقوام کے عمل و دخل و تحکمانہ طریقہ نے بھی قوم کے دل کو ہزار پارہ، خاطر کو گرانبار اندوہ کر دیا تھا۔ ان تمام پولٹیکل حقوق کے احساس کا تخم سیّد جمال الدین ہی نے مصریوں کے دل میں بویا تھا اور وہ انجام سے واقف تھے +

ٹیل الکبیر کا اعلان جنگ ہونے سے قبل گورنمنٹ ہندوستان نے سیّد کو حیدر آباد سے کلکتہ بھیج دیا "نیشلسٹ" پارٹی کی شکست کے بعد سید بالکل آزاد تھے +

ہندوستان سے لنڈن اور وہاں کچھ دنوں قیام کر کے پیرس چلے گئے، ان کے جگری دوست اور شاگرد رشید شیخ محمد عبدہٗ مفتی مصر بھی آملے شیخ محمد عبدہٗ ایک متبحر عالم اور مسلمہ حکیم تھے اڈیٹر "المنار" سیّد محمد رشید رضا نے (جو شیخ سے واسطہ تلمذ رکھتے تھے) کئی ضخیم جلدوں میں انکی سوانح عمری لکھی ہے، ان دونوں جامع الکمالات فاضلوں نے ایک رسالہ موسومہ "العروۃ الوثقیٰ" بزبان عربی پیرس سے نکالا۔ اس ہفتہ وار میں مضامین زیادہ تر پولٹیکل ہوتے تھے۔ یہ تھوڑے روز بعد بند ہو گیا۔

سیّد جمال الدین جنھوں نے فرانسیسی زبان میں کچھ دستگاہ حاصل کر لی تھی اب اپنی آرا کو یورپین پریس کے ذریعہ تشہیر کرنے لگے۔ اور رینان مشہور فاضل فرانس سے ایک فلسفی مجادلہ درباب "اسلام اور سائنس" کیا

ترکی و مصر، روس انگلستان پر ان کے مضامین جو پولٹیکل دقیق نظری کے اعتبار سے اپنے نظیر آپ تھے۔ تمام انگریزی اخباروں میں نقل کیے جاتے تھے۔ تمام سربرآوردہ مدبرین ہفت کشوران کے وجود شریف کو فضل و کمال کا قبلہ سمجھتے تھے اور اسیقدر ڈرتے بھی تھے۔ باوجودیکہ انہوں نے سلطنت انگلشیہ کے خلاف بہت ترانہ اور بے باکانہ حملے کیے لیکن ۱۸۸۵ء میں لنڈن آئے۔ لارڈ اینڈ الف چرچل، لارڈ سالسبری اور سرو الف سے دید وا دید ہوئی۔ انہوں نے سوڈانی مہدی کی نسبت ان کی رائے لی۔ مسٹر نبیٹ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ "موسم بہار ۱۸۸۴ء میں میں پیرس گیا اور سید موصوف سے ملا۔ یہ زمانہ پرآشوب تھا، چونکہ جنرل گارڈن مہدی سے دست وگریبان ہو رہے تھے، میں نے سید سے التجا کی کہ وہ اپنے اثر سے اس معاملہ کو رو براہ کرادیں، سید نے بڑی شگفتہ روئی سے میری التجا قبول کی لیکن یہ کہا کہ اگر میں انگریزی فارن آفس کیطرف سے انہیں پورا اعتماد دلا دوں تو وہ بسروچشم اس تنازع کا تصفیہ کرادیں۔ میں انگلستان آیا اور مسٹر گلیڈسٹون سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی مدد دینے کا وعدہ کیا اور تہیہ کرلیا کہ اس مسئلہ کو کیبنٹ میں پیش کریں۔ لیکن فارن آفس کیوجہ سے یہ تجویز ناکام رہی، سال پیوستہ میں لارڈ اینڈ الف چرچل سکرٹری آف اسٹیٹ ہوئے، ان سے میرا رسم بڑھا ہوا تھا۔ میں نے سید جمال الدین کو لندن بلایا، وہ تین ماہ تک میرے مہمان ہوئے، چرچل اور والف سے "تقریب ملاقات کرائی۔ ایکدفعہ یہ بات قرار پائی کہ وہ والف کے ساتھ قسطنطنیہ جائیں جو ایک خاص مشن لیکر جارہے تھے جسکا منشا یہ تھا کہ سلطان سے اس قسم کا معاہدہ ہو جائے

کرتی، ایران و افغانستان روس کے خلاف انگلستان کے شریک حال ہو جائیں، سلطنت انگلشیہ "اس کے صلہ میں مصر کی مداخلت سے دست بردار ہو جائے گی" سیّد نے اسے منظور کر لیا اور قسطنطنیہ کا ٹکٹ بھی خرید لیا لیکن عین روانگی کے وقت کسی نے والف کو ایسا راگ دیا کہ وہ انکی صحبت سے منحرف ہو گیا، سید کو اسکا سخت صدمہ ہوا اور وہ چند روز بعد خفیہ طور پر ماسکو روانہ ہو گئے۔

ماسکو میں انکا استقبال بڑے تپاک سے کیا گیا۔ کامل چار برس تک رہے، مسٹر والف کے مشن کے خلاف کارروائی شروع کی اور کٹکاف، میڈم ناویکاف، ایم زیناولیف وغیرہ اراکین جلیل القدر کی استعانت سے مجوزہ عہد و پیمان مابین ترکی و انگلستان پر پانی پھیر دیا۔ اس شاہ تدبیر کے ارسطو نے اس سفر میں مسلمانان روس کی بڑی خدمت کی، ان کے حقوق کی بہت زور کے ساتھ زار روس سے سفارش کی اور کتب مقدسہ قرآن مجید و دیگر مذہبی کتابوں کے شائع کرانے کی اجازت دلوائی[۵۷] سیّد کے دوران

---

[۵۷] معلوم ہوتا ہے سیّد دو بار روس گئے، پہلی بار ۱۸۸۵ء جب انگلستان سے مصالحت ناممکن نظر آئی اور دوسری بار ۱۸۸۹ء میں ناصر الدین شاہ قاچار سے ملاقات ہونے کے بعد امین السلطان، اتابک اعظم ایران نے ان کے سپرد ایک خاص کام کیا تھا جو روسی فارن آفس سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاہیر الشرق صفحہ ۶۲ میں ان کے حالات میں یہ لکھا ہے کہ ۱۸۸۶ء میں ناصر الدین شاہ نے بذریعہ تار انہیں طلب کیا اور وزیر جنگ کے ممتاز عہدہ پر مامور کیا۔ ظل السلطان سے اصفہان میں ملاقات ہوئی اور آب و ہوا تبدیل کرنے کی غرض سے ملک چھوڑ دینے کی اجازت ہوئی۔ وہاں سے روس روانہ ہوئے۔ دوسری بار ایران ۱۸۸۹ء میں آئے اور ۱۸۹۰ء میں نکال دیئے گئے ۱۲

قیام میں، ناصر الدین شاہ قاچار جو سیر و سیاحت کے بڑے دلدادہ تھے اقلیم روس میں گئے سینٹ پیٹرزبرگ میں شاہ نے انہیں یاد فرمایا۔ لیکن سید نے جانا پسند نہ کیا۔ حسن اتفاق سے میونخ میں ملاقات ہوئی۔ سید موصوف کے عظیم الشان کارناموں سے متاثر ہو کر انہیں ایران لیجانا چاہا اور وزیر اعظم کا اعلیٰ مرتبہ بخشنے کا وعدہ فرمایا۔ سید نے صاف انکار کر دیا لیکن بعد میں شاہ کے مزید اصرار پر قبول کر لیا۔ سید کے رفیق شفیق عبدالقادر المغربی نے جب یہ سنا، حفظ ما تقدم کے خیال سے منع کیا کہ "شاہ ایران تمہیں کس لیے لیجاتا ہے جبکہ اُس پر ظاہر ہے کہ تم اہل سنت والجماعت کی تقویت میں دل و جان سے کوشاں ہو" اس کے جواب میں سید نے صرف اتنا کہا "انکی حماقت اور بیہودگی" غرض وہ شاہ کے ساتھ ایران آئے اور کچھ دنوں رہے۔ بادشاہوں کے گرد و پیش جو خسروے لگے رہتے ہیں ان کے دل میں یہ خار کھٹکا انہوں نے چند ہی روز میں مختلف ترکیبوں سے ان کی طرف سے سوء ظنی پیدا کر دی۔ سید نے شاہ کے طور بدلے ہوئے دیکھ کے نمائش پیرس کے بہانہ سے کنارہ کشی کرنی چاہی۔ لیکن شاہ نے ترش روئی اور بد اخلاقی سے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ نشتر سید کے دل میں چبھ گیا اور وہ شاہ محمد عظیم کے آستانہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ سات ماہ تک رہے اور جاتے ہی نہایت آزادانہ طریقہ سے شاہ کی مخالفت پر کمر باندھی۔ دھواں دھار تقریروں اور پُر زور تحریروں میں شاہ کی معزولی کی تحریک کی۔ شاگردوں کا ایک جم غفیر وعظ لکچروں میں شریک ہوتا تھا انہیں سے ایک درجن نہایت ممتاز گزرے ہیں۔ سید جمال الدین جبکہ آستانہ میں بستر علالت پر تھے اور کمزوری و نقاہت نے نقش پلنگ بنا دیا تھا کہ یکایک شاہ کا نادر شاہی فرمان انکو حدود ایران سے

نکالدینے کا پہنچا اور تعمیل کے سبب پانسو فوجی سوار بھی جا دھمکے۔ تقدیس آستانہ کو بالائے طاق رکھا اور سیّد کو بے بسی کے عالم میں بے دردی سے گھسیٹ کے لے گئے اور حد ترکی پر لیجا کے چھوڑ دیا۔ معتقدین سیّد کے دلوں کو اس حرکت ناہنجار نے ہلا دیا اور ۱۸۹۶ء میں یہی شاہ کی ہلاکت کا باعث ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ اس شکستگی کے عالم میں سیّد لندن گئے دماغ شوریدہ سینہ زخم اندود، بڑے بڑے مجمعوں میں متعدد تقریریں کیں حدت طبع نے سحر بیانی کو آتش زبانی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اخبارو میں ایرانی جابرانہ وظالمانہ طرز حکومت پر نہایت زوردار آرٹکل لکھے، یہ تحریریں کیا ہیں خون کے قطرے ہیں جو دل انگار سے ٹپکے ہیں ان میں شاہ ایران کے چال وچلن پر ایسی سخت چوٹیں ہیں کہ اسے دہلا دیا اور فاطر العقل ثابت کر دیا۔

معمورۂ جہان کو عبرت کے قدموں سے طے کر کے ۱۸۹۱ء میں قسطنطنیہ گئے اور یہیں آ کے پانچ سال بعد جام عمر کا دور ختم ہوا۔ سلطان عبد الحمید کے دربار میں باریابی کے متعلق بلنٹ صاحب نے اپنی ڈائری میں عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ عید اسلام کے موقعہ پر سلطانی دربار ہوا تمام امرا وعیان شریک بزم تھے، سیّد صاحب بھی جا پہنچے۔ منتظمان دربار میں سے کسی نے انہیں باہر کرنا چاہا۔ سید ایک جید شخص تھا اور ہمیشہ کا آزاد رو، یہ اس ذلت کو کب سہ سکتا تھا، سر دربار اسکی مونچھیں پکڑ کے ہلا دیں۔ کہا "تو نہیں جانتا ہمیں اسمیں شریک ہونے کا پورا مجاز حاصل ہے کیونکہ ہم سید النسب اور عالم العلم ہیں اور موجودہ اراکین سلطنت کے ہم پلہ وہمسر سلطان عبد الحمید کی بھی نگاہ جا پڑی، قدردانی اور مردم شناسی کی آنکھ سے دیکھا، عنایت خسروانہ سے اپنی پشت پر

کرسی دی۔ امیدوں کے گلبن پر کامیابی کی نسیم لہرانے لگی، ارنگا رنگ کی نوازشوں سے اتنے بڑھے کہ مقربین بارگاہ میں سے ہوگئے۔ انتقال سے ایک سال قبل سلطان نے سیّد سے کہا کہ شاہ ایران پر اب حملے کرنا بند کر دو چونکہ یہ تیسرا موقعہ ہے کہ سفیر دولت ایران نے ہماری حضور میں عرض کی، دو موقعوں پر ہم نے خشک جواب دے کر ٹال دیا کہ ہم اسمیں دخل نہیں دیسکتے لیکن اس بار وعدہ کرلیا ہے کہ ہم اپنا اثر کام میں لائیں گے۔ سیّد نے عرض کیا، "خلیفۃ المسلمین کا ارشاد بجالانا لازمی ہے اس لئے میں نے شاہ ایران کو معاف کیا!" سلطان نے فرمایا "شاہ حقیقت میں تم سے بہت خوف زدہ رہتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے اختتام پر مرزا رضا کرمانی جو سیّد سے ارادت رکھتا تھا اور شاگرد رشیدوں میں سے تھا قسطنطنیہ گیا۔ داستان اندوہ غم و مصائب پُر الم سنائے اِس شخص نے تحریک ایران میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور سیّد کا شاگرد ہونیکی وجہ سے شہرہ آفاق تھا۔ ایرانی حکومت اور امین السلطان نے اس پر بڑے جبر و تشدد کئے تھے، سیّد نے کہا تم بڑے بُزدل ہو جو عورتوں کی طرح رونا روتے ہو، فرانسیسی اپنی سخت سے سخت صعوبت کا بھی نہایت شگفتگی سے ذکر کرتے ہیں، تم بھی اپنی دردبھری کہانی اسیطرح بیان کرو اور میرے سامنے اِن آفات کا اعادہ کرنا بالکل عبث ہے، تمھیں چاہیئے تھا جس شخص نے تمھیں تباہ و برباد کیا اسکا وہیں کام تمام کر دیتے۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء یکم مئی کو مرزا رضا نے آستانہ محمد عظیم میں ناصرالدین شاہ کو گولی کا نشانہ بنایا۔ پہلے تو اسکا شبہ فرقہ بہائیہ کے پیرو کار و پنیر ہوا۔ پھر سید جمال الدین اور ان کے شاگردوں پر مرزا آقا خاں نائب اڈیٹر "اختر" شیخ احمد روحی کرمانی

حاجی میرزا حسن خاں خبیر الملک کو سلطنت عثمانیہ سے دولت ایران نے مانگا۔ پھر سید جمال الدین کو ایرانی حکومت کے سپرد کرنے کے متعلق سلطان نے صاف جواب دیدیا۔ اسوقت انکی قومیت کا سوال پیدا ہوا۔ اگر وہ واقعی افغان ہوتے تو سفارت انگلشیہ کی زیر حفاظت آتے اور اسی کے ذریعہ انکا ٹرائل ہوتا، کیونکہ افغانستان کا کوئی سفیر دول یورپ میں نہیں رہتا اور اس کے سیاسی امور تمام انگریزی سفارت کے توسل سے طے پاتے ہیں، سید نے یا تو وہ اصل میں افغان نہ تھے یا وہ دولت افغانستان کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے چونکہ وہاں سے آنے کے بعد عالم بسیط پر افغانستان کی تضحیک و توہین کا ڈنکا بجا دیا تھا، اس لیے اپنی جان کو سلطان کے ہاتھ میں دیدیا اور انھوں نے دم واپسیں تک ساتھ نہ چھوڑا۔ مرزا آقا خاں جو ایک فاضل کامل تھے اور شعر و سخن سے مناسبت ازلی و سرمدی لائے تھے، معہ شیخ احمد روحی اور خبیر الملک کے ایرانی سفارت کے سپرد کر دیئے گئے، موخر الذکر دونوں صاحبان بھی عقل کے فلاطون اور علم کے بہتے دریا تھے اور سید کے ممتاز شاگرد ہونے کا فخر رکھتے تھے۔ مرزا آقا خاں کے چند شعر جو پروفیسر براؤن صاحب نے اپنی تاریخ انقلاب ایران" کے دیباچہ میں لکھے ہیں، جنکی حسن سادگی پر ہزار بانکپن قربان ہیں اور جن سے وطن کی محبت کا آب حیات ٹپکتا ہے یہاں نقل کرنے کے قابل ہیں:۔

بایران مبادا آنچنان روز بد — که کشور بہ بیگانگاں اوفتد
نخواہم زمانے کہ این نو عروس — بیفتد بزیر جوانانِ روس
بگیتی مبادا آنکہ این حوردیس — شود ہمسر لہردی[1] از انگلیس

[1] لہردی از انگلیس یعنی انگریزی لارڈ

اِن تینوں فدائیانِ قوم کو شہر تبریز میں خفیہ طور پر کتے کی موت مارا، محمد رضا کرمانی کو ۱۲۔ اگست ۱۸۹۶ء میں پھانسی ملی اور بیسیوں خونِ ناحق ہوئے "اے خدا تیری شان! چوں آتش بر سر قہر نہ خویش گذارم نہ بیگانہ، سوکھوں کے ساتھ گیلے، بروں کے ساتھ اچھے سب جل گئے۔"

۱۸۹۶ء کے آخیر میں سیّد کے گلے میں ایک زخم ہوا جسکا آماس و فاسد مادہ بڑھتے بڑھتے تمام گردن پر چھا گیا۔ ۹۔ مارچ ۱۸۹۷ء کو اس فخرِ نوعِ بشر کا ہمائے روح عالمِ بالا کو پرواز کر گیا۔ نہایت تزک و احتشام سے جنازہ "شیخلر مزارلغی" قبرستانِ شیوخ میں نشان تاش کے قریب رکھا گیا ایرانیوں کا یہ خیال ہے کہ وہ طبعی موت سے نہیں مرے بلکہ ان کی ڈاڑھ کے قریب کسی زہریلے مادہ کا ٹیکہ لگایا گیا تھا جس سے ورم آگیا۔ اور زخم سطح پر سے داد کے مانند معلوم ہوتا تھا، سلطان کے درباری حکیم ابوالہدیٰ نے یہ ٹیکا لگایا تھا، ترک اس کی تردید کرتے ہیں العلم عند اللہ

یہ اس برگزیدہ انسان کی زندگی کے مجملاً حالات ہیں جس نے کم و بیش بیس سال کے عرصہ میں مشرقی واقعات کا رُخ پھیر دیا، اگر اسکی سوانح عمری تمام و کمال لکھی جائے تو ہمیں تمام "ایسٹرن کوئسچن" کی تاریخ لکھنی پڑے جسمیں ہندوستان اور افغانستان بھی شامل ہیں اور ترکی و ایران و مصر مختص طور پر داخل ہیں جہاں انکا اثر حرارت برقی کیطرح ابتک جان ہی دل میں دوڑ رہا ہے۔ اس اشرف اشراف کی زندگی کے واقعات کے محض شمار کرانے سے پورا حال احوال نہیں کھلتا لیکن مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کو مدِّنظر رکھکر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور مشاہیر الشرق میں سے کچھ ان کے خصائل اور حلیہ کی بابت اقتباس کرتے ہیں:۔

"چہرہ کا رنگ گندمی جیسے کہ حجاز کے عربوں کا ہوتا ہے کشیدہ قامت سینہ چکلا، جسم گٹھیلا اور طاقت ور، آنکھوں کی پتلیاں سیاہ اور روشن لمبے لمبے بال خشخشی ڈاڑہی رکھتے تھے۔ لباس عموماً وہ پہنتے تھے۔ جو قسطنطنیہ کے علما میں مروج ہے، کھانا دن میں ایک وقت کھاتے تہی لیکن خوب ڈٹ کے۔ البتہ چائے ایرانی فیشن میں علی التواتر پیتے رہتے تھے حقہ کے بہت شوقین تہے اور تمبا کو اپنے ہاتھ سے خرید کر لاتے تھے۔ سگرٹ پر سگار کو ترجیح دیتے تہے۔ آخری وقت میں جب انہوں نے قسطنطنیہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی، سلطان انہیں (۷۵ پونڈ) ماہوار دیتے تھے، نشان تاش میں مکان فرنیچر سے آراستہ اور شاہی اصطبل سے گھوڑا گاڑی دے رکھا تھا۔ سارے دن مکان پر رہتے تہے صرف شام کو ہوا خوری کے لیے وہ بھی "کیا غید خانے" یا سویٹ واٹرز جاتے تہے کبھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ ترکی دار الخلافہ کے کسی اور خوش منظر اور تفریح کے مقام پر چلے جاتے تھے۔ سوتے بہت کم تھے "دیر میں سوتے صبح جلدی اُٹھتے تہے۔ خود کسی کے ہاں نہ جاتے تہے، اور خصوصاً اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے ہاں تو پھٹکتے ہی نہیں تہے۔ نہایت شگفتہ بیان تہے، الفاظ چُن چُن کے ایسے استعمال کرتے تھے جو اثر میں ڈوبے ہوئے نکلتے تہے، جس سطح کے خیال کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا، اسی قسم کی تقریر کرتے تہے اور آن کی آن میں ادہر کی دنیا اُدہر کر دیتے تھے۔ مشرقی پبلک مقرروں میں انکا ثانی کوئی نہیں گفتگو متانت میں ڈوبی ہوئی زور میں بہری ہوئی ہوتی تھی ظرافت کے رنگ سے رنگی ہوئی یا فضول نہ ہوتی تھی۔ زہد و تقوے بے انتہا بڑھا ہوا تھا اور دنیا کے عیش و نشاط سے مطلق سروکار نہ تھا۔ خوف و بیم کے موقع پر بالکل نڈر اور دلیر

پاک باطن اور خلیق لیکن تیز مزاج - میل ملاقات میں بڑی محبت سے ملتے تھے، بڑے لوگوں سے بے باک و آزاد - کہتے ہیں جب مصر سے نکالے گئے تو سوئیز بالکل مفلس اور قلاش آئے - سفیر ایران نے معہ چند ایرانی سوداگروں کے ان کو کچھ روپیہ بطور قرض حسنہ یا ہدیہ کرنا چاہا، لیکن بلند نظری کی آنکھ نہ جھکی اور انکار بایں الفاظ کیا، "اپنا روپیہ اپنے ہی پاس رہنے دیجئے چونکہ مجھ سے زیادہ آپ کو اس کی ضرورت ہے - شیر جہاں جاتا ہے غذا پاتا ہے"، ان کی دماغی قابلیتیں، نہایت عمدہ اور دیدہ وری و بصری یکتائے زمانہ - جب کسی پر نگاہ ڈالتے تھے دل کے پار اُتار دیتے تھے اور اس سے قبل کہ کوئی شخص زبان سے کچھ کہے یہ اُس کے دل کا بھید پڑھ لیتے تھے، قوت مقناطیسی بھی عجیب و غریب تھی جس وقت بولنے پر آتے تھے، زبان گوہر فشان، فسونگری کرتی تھی، سامعین واہ اور آہ کے نعرے بلند کرتے تھے، علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے - فلسفۂ قدیم فلسفہ تاریخ اور تمدّن اسلام اور تمام اسلامی سائنسز میں انتہا درجہ ورک رکھتے تھے - علم السنہ میں کامل تھے اور سات زبانیں جانتے تھے، ذکی الطبع، حدید الذہن ایسے کہ تین ماہ کے عرصہ میں بغیر استاد کی مدد کے زبان فرانسیسی میں لکھنے پڑھنے اور سلیس ترجمہ کرنے کی استعداد پیدا کر لی - انگریزی، روسی، فرانسیسی، عربی، فارسی، ترکی، افغانی وغیرہ زبانیں جانتے تھے - کتاب پڑھنے کے نہایت شوقین تھے، عربی، فارسی کی کتابیں پڑھنے کا تو شمار ہی نہیں شادی کبھی نہ کی اور نہ کبھی کسی پری تمثال کے حسن و جمال نے بھی کچھ اثر کیا مشاہیر الشرق کا آخری پیرا ان کی پولیٹکل تمناؤں پر روشنی ڈالتا ہے جسکا ترجمہ کشید کر کے پیش ناظرین کیا جاتا ہے -

ان کی (سید جمال الدین) زندگی کے مختصر حالات سے مبصرین نتیجہ نکال لیں گے کہ انکا نصب العین اسلامی دنیا کا باہمی اتحاد تھا اور اسی پر انکی تمام امیدوں کا تکیہ تھا، وہ دل وجان سے چاہتے تھے کہ یہہ تمام مسلمان اور اسلامی طاقتیں ایک خلیفۃ المسلمین کے تحت میں آجائیں [1] اس کوشش وسعی میں انہوں نے اپنی تمام قابلیتیں صرف کر دیں اور اسکو عالم وجود میں لانے میں انکا نفس حرام ہوگیا تھا۔ نہ کوئی پیشہ اختیار کیا نہ شادی کی۔ باینہمہ وہ اسباب میں ناشاد ونامراد گئے۔ اپنے خیالات کا کوئی منضبط ذخیرہ بھی نہیں چھوڑا صرف ایک کتاب جو بہ تردید ملاحدہ لکھی وہ اُن کی زندہ یادگار ہے علاوہ بریں منتشر و بے ترتیب خطوط اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں جو مختلف موضوع پر محیط ہیں۔ بہرکیف انہوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ہوش وحواس کو جلا کر کے چمکا دیا جس سے انکی تیغ قلم کسب ہنر کر رہی ہے اور جنکی مساعی بلیغہ سے مشرق بے انتہا فائدے اٹھا رہا ہے اور اُٹھائیگا۔ یہ خیالات ایک شامی عیسائی کی قلم سے نکلے ہیں۔ پانچ سال ہوئے جرجی زیدان نے مشاہیر الشرق تصنیف کی تھی، اُس زمانہ سے لے کے اب تک ساری دنیا پر بخوبی ظاہر ہوگیا ہے، کہ اسلامی ممالک میں بالخصوص ایران میں سید جمال الدین جن قوتوں کو حرکت میں لائے تھے وہ برابر اب تک جاری ہیں

[1] تاریخ بیداری ایرانیان میں مرقوم ہے کہ سید نے مکہ میں ایک پین اسلامک سوسائٹی (انجمن اتحاد اسلام) قائم کی تھی۔ اس کا اصلی نام اُم القریٰ تھا۔ جسکا یہہ مقصد تھا کہ عالم اسلامی کے ایک خلیفۃ المسلمین قرار دیدیئے جائیں، خواہ مرکز قسطنطنیہ ہو یا کوفہ، اس انجمن نے اپنے قواعد وضوابط شائع کرکے ملک ملک میں تقسیم کرا دیئے تھے، لیکن سلطان عبدالحمید کے دل پر اس کا ایسا برا عکس پڑا۔ کہ انہوں نے اس کے وجود کے ایک سال بعد اسکو جڑ بنیاد سے کھودیا۔

اِس نفس الکمل کے متعلق اور بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے جو ایک جہانیان جہان گشت فاضل تھا جس کے پاس بس فصیح زبان اور ایک جادو نگار قلم کے اور کوئی دنیاوی حیثیت نہ تھی جسکا فانوسِ خیال علم کی روشنی سے منور اور جسکا مشاہدہ پولٹیکل رموز کی تہ میں اترا ہوا تھا، ایثار نفسی اور ایک اخوۃ اسلامی میں وہ غرق تھا، اسلامی انحطاط نے اس قسمتر انہ فیروزمند کے سینے میں آگ دہکا رکھی تھی اور اسس نے اپنی جان کو اسکی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسکی حسن تدبیر اور حکمتِ بےنظیر نے مدبران ہفت کشور کی بڑی بڑی تجویزوں کو مٹا دیا۔ اسکی عظمت و وقار اور اسکی طبیعت جادو کار نے سلاطین کو لرزا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس موقعہ پر کس طبقہ کے لوگوں کو ابھارنا چاہیئے اور کس محل پر لوٹیشن سے کام لینا چاہیئے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مصر میں تحریک ملی کی عمارت چنی، یہ وہ شخص تھا جس نے ۱۸۹۱ء میں تمباکو کے ٹھیکہ کی منظوری کی غلط پالیسی کو پیش بینی کی عینک سے دیکھا اور صرف ایک خط سے جو حاجی حسن شیرازی، مجتہد اعظم سامرا کو لکھا تھا، اسکو حرفِ غلط کیطرح اُڑا دیا، اور ایران کو غیر ملک کی مداخلت کے خطرہ سے بچالیا۔ اِس نے عام خود مختار اسلامی ریاستوں کو بیدار کیا، اور سب کو یورپین طاقتوں کے زر و خطرے سے مطلع کیا، اِس امر کی نہایت شد ومد کیساتھ ضرورت ثابت کردی کہ اگر وہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں تو غنیم عام کے پے در پے حملوں سے محفوظ رہنے کیلیے باہمی رنجشوں کو آب فراموشی سے دہو ڈالیں اور ایک جہتی و اتحاد کی لڑی میں منسلک ہوکر مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسی اصول پر اتحاد عالم الاسلامی کا چراغ روشن کیا۔ قلم کا جگر اب بیاں سے شق ہوتا ہے کہ اسکی آرزوؤں کی شاخ وجود میں پورے پھول نہ کھلے اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ اسلامی شاہوں میں

کوئی اسقدر قابل نہ تھا کہ اسکے خیالات کی اہمیت کو سمجھے نہ اسقدر ہمدردی اور جوش تھا کہ انکو انجام کو پہنچاسکے۔ ناصر الدین شاہ قاچار کو تھوڑے سے زمانہ میں تجربہ سے معلوم کرلیا تھا کہ وہ ایک خود غرض و خود پسند ظالم ہے جسکو سوائے نفس پرستی اور ذاتی حکومت کے دنیا سے کچھ غرض نہیں اس لیے اپنی نظریں دوسری طرف دوڑائیں اور سلطان عبد الحمید میں اسکا جوہر پایا۔ انکی تمنا یہ تھی کہ ترکی و ایرانی مذہبی اختلاف کو ہر دو قوموں کے دلوں سے نسیاً منسیاً کرادیں اور سلطان عبد الحمید کو اہل سنت کا خلیفہ اور شاہ ایران کو اہل التشیع کا رکن اعظم بنادیں اور اس قسم کی فروعات جو باعث نزع اور سنگ راہ اتحاد ہیں بالکل اڑادیں تاکہ مصالحت کا جام پینے میں کسی کو عذر نہ رہے۔ چونکہ انہوں نے تجربہ کی دوربین سے دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں ریاستوں کے لیے غنیم منہ پھاڑے بیٹھے ہیں اور صرف ان کا اتحاد ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو غنیم کا منہ پھیر سکتا ہے۔ بہت سارے مولویوں اور مجتہدوں کو سید نے اس پالیسی کیطرف راغب کرلیا تھا لیکن ایران میں پچھلے سالوں کچھ ایسی طوفان خیز ہوائے مشروطیت چلی کہ کچھ تو بہ اقتضائے فرائض ملکی اور کچھ فطری ہمدردی و حب الوطنی ایرانی گورنمنٹ کے طرز عمل میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا سلطان عبد الحمید جن کے کان ۱۹۰۸ء تک لفظ "مشروطیت" سے زیادہ دنیا کی کسی چیز سے غیر مانوس نہ تھے طبعی نفرت کے سبب مشروطیت کا دم بھرنے والی قوم سے تار عنکبوت کیطرح رشتہ یگانگت توڑ ڈالا اور ایران کی شمال مغربی حدود میں اپنی فوج بھیجکر اسکی مشکلات و مصائب کو دوبالا کردیا۔ بہرکیف ہمیں ملکہ امید سے لو لگائے رکھنی چاہیے کہ عثمانی نیا دور حکومت سید کی تمناؤں کو عملی لباس پہنائے اور مسلمان سلطنتیں اتحاد سیکھیں۔

سید شوکت دہلوی

آہِ رسا

بندِ دوم

اثر ہو کر اگر افسانۂ دل ہم سنا دینگے
عزیز اللہ نے چاہا تو ان سب کو رلا دینگے

یہاں آئے تو خود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے
جنھیں دعویٰ یہ تھا ہم رونے والوں کو ہنسا دینگے

فلک کے مدعی ہیں یہ نہ انکو عرش سے مطلب
یہ وہ نالے ہیں جس سے لگکے پردونکو ملا دینگے

نہ ہے قسمت تو توقع اوس سے اتنی بھی نہ تھی ہمکو
ہمارے شوقِ دیرینہ کو سنکر مسکرا دینگے

مداوا کرنے والو سعی بیحاصل نہ یہ سمجھو
مریضانِ محبّت تمکو سب دل سے دعا دینگے

سمجھتے ہو خموش ان عالمانِ دین کو کیوں تم
یہی وہ ہیں کہ جو بگڑی ہوئی قسمت بنا دینگے

تم اس طرزِ روش سے کسلیئے گھبرائے جاتے ہو
چلو تو ساتھ رفتارِ زمانہ بھی سکھا دینگے

وہ خود بستر سے اٹھے جب لبِ بام آفتاب آیا
جو ہم سے کہہ کے سوئے تھے اندھیرے منہ جگا دینگے

تصدق جائیے اس طرزِ دلجوئی کے اے حضرت
کسیکا خون بہائینگے پھر اسکا خونبہا دینگے

یہ سمجھے تھے کہ مرکر دادِ جانبازی ملیگی کچھ
یہ کیا اُمید تھی وہ شمعِ تربت بھی بجھا دینگے

کہاں ہیں وہ مسیحا قوم کے جنکو یہ دعویٰ تھا
صدائے قم باذنی دیکے مردونکو جلا دینگے

ستائینگے ہم تاثیرِ جذبِ نامرادی کی
بہت چھیڑو گے تو ہم مطلعِ عرفی سنا دینگے

فغاں کز سینۂ داغم آہ بے تاثیرے نزاید
صباح عید از دل نالۂ شبگیرے زاید

عزیزؔ لکھنوی

تمدّن

کئی روز ہوئے ایک ماہوار رسالے کا اشتہار میری نظر سے گذرا۔ اُردو کی فوج بے طرح نرغے میں آئی ہوئی ہے شکر ہے ایک تازہ دم رسالے کی کمک نظر آئی۔ ایسے رسالوں کے دو ایک میدان تو بڑے زور کے رہتے ہیں لیکن پاؤں ذرا کمزور ہوتے ہیں۔ رسالدار بہادر میاں خیری صاحب کئی ایک لڑائیوں کا تمغہ پائے ہوئے ہیں اس سے ذرا تقویت ہوتی ہے کہ خوب کٹ کٹ کے لڑیں گے لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیئت۔ ہندسہ۔ جرثقیل۔ علم مثلث وغیرہ کے ساتھ عورتوں کے حقوق کیونکر ثابت ہوں گے یہ نئی مہم ہے۔ تاریخ تشریح۔ اقتصاد۔ علم الابدان۔ علم الانسان تک تو کچھ گاؤزوری بھی ہوسکتی تھی اس کے آگے کیونکر بس چلے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں جیسا ایک صاحب نے قرآن و حدیث سے عورتوں کی فوقیت اور مردوں کا ظلم ثابت کیا تھا۔ وہ تو جیسا کچھ ثابت ہوا مصنف صاحب ہی کو معلوم ہوگا یا بعضے نئی دُولہا دُلہن کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ دلیل ایک آدھ مجھے بھی یاد ہے۔ فرماتے ہیں عورتوں میں کوئی آجتک جو پیغمبر نہیں ہوئے اسکا یہ باعث ہے کہ پیغمبری کوئی نعمت تو ہے نہیں سراسر زحمت ہے اور اللہ میاں عورتوں پر خاص طور سے مہربان ہیں اس سبب سے اُنکو اس زحمت سے محفوظ رکھا۔ افسوس اسکا ذکر اُنہوں نے کچھ نہ لکھا کہ مردوں سے اللہ میاں کیوں بیزار ہیں اور جو حضرات علیہم الصلوٰۃ والسلام اس زحمت کیواسطے منتخب کئے گئے اُن سے اللہ میاں کو کس جنم کا بیر تھا۔

ایک دلیل اس سے بھی عمدہ یہ ہے کہ اللہ میاں بھی مرد پیغمبر صاحب بھی مرد اسپر بھی
اتنے حقوق عورتوں کے رکھے ہیں تو نہیں معلوم اصل میں کتنے ہوں گے اب
اگر اسی طرح اخلاق ادب فلسفہ۔ سائنس وغیرہ کے ساتھ حقوق نسواں پر بحث ہوگی
تو خدا حافظ ہے۔ مردونکا ظلم و ستم عورتوں کے ذہن نشین کر کے سوچا اس
گھرونمیں بدمزگی تو اُنہوں نے پیدا کر دی آپ کچھ اور ترقی کریں گے۔ یہ حقوق
کی پاسداری کیا ہوئی کمزور کو شے دے کر اور بٹوانا ٹھیرا۔ ان بیچاریوں کو
رفیق بھی ملے تو ایسے بھلے مانس کہ ظاہر میں خیر خواہ اندر خانہ گھر
کھوانے کے سامان۔ یہ جتنے رفیق نسواں شفیق نسواں حقوق نسواں
آزادی نسواں۔ بربادی نسواں یہ نسواں وہ نسواں والے ہیں نسواں کا
اطلاق دوسروں ہی کی مستورات پر کرتے ہیں اپنے گھر میں ایسے سبق نہیں پڑھاتے
ایسے رسالوں اور کتابوں کی قدر اصل نوبیاہی دلہنوں اور اونکی سہیلیوں میں ہوتی ہے
اوس کے بعد اون ناعاقبت اندیش نوجوانوں جنکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اسی بیوی کے
ساتھ عمر بسر کرنی ہے۔ کل کو یہی بیوی بچوں کی ماں بنیگی۔ بچوں کی پرورش تعلیم و
تربیت کا کفیل میں ہونگا انتظام اسکو کرنا پڑے گا۔ من تو شدم تو من شدی
کا مضمون چند روزہ ہے۔ بڑے بڑے کام بڑے بڑے انتظام پیش
آنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بھی عورتوں کے حقوق غیر متناہی سمجھنے
سمجھانے کا موقع چند ہی روز تک حاصل رہتا ہے۔ مزا جب آتا ہے کہ کسی دن
شام کو تھکے ہارے گھر آئے بیوی گھر میں موجود نہیں ماما نے بتایا کہ اون کی
سوتیلی بہن کی خلیا ساس کی بھتیجی بہو کی سہیلی باہر سے آئی ہیں وہاں گئی ہیں
بچی کو بھی نہیں لے گئیں جنس کی کوٹھری کو قفل لگا ہوا ہے میں بھی
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں پہر رات گئے سواری اُترو الو کی آواز

کان میں آئی تو جان میں جان آئی۔ ڈیوڑہی سے انگنائی میں قدم رکھتے ہی چولہے کو ٹھنڈا دیکھ کے ایک جھڑا کا ماما پر ہوا کہ آنکھوں کی اندھی صریحاً تیرے سامنے کنجیوں کا گچھا قفل میں لگا چھوڑ گئی ہوں۔ میاں اس احتیاط اور حسن انتظام کو دیکھ کے اور بھی کھسیانے ہوئے مگر چپ۔ بڑی دیر میں جب ذرا بیوی کا مزاج کچھ درست ہوا تو آپ نے آہستہ سے پوچھا کہاں گئی تھیں تو مختصر تار کا سا جواب تعلیمیافتہ زبان میں ملا ایک "بہن کو دیکھنے" بڑی ہمت کر کے یہ بھی کہہ گذرے کہیں جایا کرو تو مجھ سے بھی پوچھ لیا کرو۔ پوچھنے کے لفظ پر جسارت پھر بڑی اور برجستہ جواب دیا "کیوں۔ تم اپنے کسی دوست کے یہاں جاتے ہو تو مجھ سے پوچھ کے جاتے ہو؟ یہ بالکل مردوں کی بے انصافی ہے آپ جہاں چاہے خاک اُڑاتے پھرتے ہیں بیویوں پر قیدیں لگاتے ہیں" میاں صاحب کسی زمانے میں حقوق نسواں خود ہی ذہن نشین کر چکے تھے اوسکو واپس کیونکر لیتے جز بز ہو کر رہ گئے۔ مگر تا کے +

ابتک حقوق نسواں کی جتنی بحثیں دیکھنے میں آئیں اونمیں اگر مردوں سے ارشاد ہے تو وہ بالکل زٹل اور عورتوں سے خطاب ہے تو وہ اسطرح کہ تم ایسی اور تم ویسی تمھارے پیٹ سے بڑے بڑے پیغمبر۔ ولی اللہ۔ بادشاہ فلیفی۔ عالم فاضل پیدا ہوتے۔ تمھارے بغیر دنیا کی آبادی اللہ میاں سے بھی نہ ہو سکی مردوں کی عزت آبرو سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خدا کے نزدیک تمہارا درجہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ مردوں کا ظلم ہے کہ تمھاری قدر نہیں کرتے سب یہی پڑھاتے ہیں اتنا کوئی غور نہیں کرتا کہ حق کسے کہتے ہیں کیونکر پیدا ہوتا ہے کس طرح ملتا ہے اور مل جائے تو کیونکر کام میں لانا چاہیئے کہ

ہمیشہ قایم رہے۔

سنیے حق دو قسم کا ہوتا ہے ایک فطری دوسرا اخلاقی۔ فطری حق وہ ہے جسپر بقائے وجود موقوف ہو جیسے ہر بچے کا حق ہے کہ اپنی ماکا دودہ پیے اپنی پرورش اور حفاظت اوس سے کرائے۔ اخلاقی حق وہ ہے جس پر آسایش منحصر ہو جسکا خلاصہ ہے ہل جزاء الاحسان الاالاحسان۔ فطری حق خدا کی طرف سے پیدا ہوتا ہے اخلاقی حق اپنی کوشش سے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماکے دل میں اوسکی ماما خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہے نہ آیندہ کی امیدوں کو اوس میں دخل ہے نہ گذشتہ خدمات کا وہ نتیجہ ہے۔ بخلاف اس کے اخلاقی حق خاص اپنی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ع

مزد آن گرفت جان برادر کہ کار کرد۔ یہ بات دوسری ہے کہ خداوندکریم نے اوس کا ایک معیار بتا دیا ہے اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ مرد اور عورت کے درمیان کتنے حقوق فطری ہیں کتنے اخلاقی۔ فطری تو شاید ایک ہی نہیں اور کھینچ تان کے نکلے بھی جائیں تو وہ برابر سرابر ہونگے اون کی نسبت کسیکو کچھ شکایت ہی نہیں جھگڑا ہے تو اخلاقی حقوق کے متعلق۔ اخلاقی حق بغیر خدمت کے پیدا نہیں ہوسکتا اور خدمت بغیر قابلیت کے ناممکن ہے کیسی بہوکے کی وہ کیا خدمت کرسکتا ہے جسکے پاس پیسہ ہے نہ اناج۔ جو شخص آٹا گوندھنا تک نہ جانتا ہو وہ بہرجی گیری کی تنخواہ کیونکر پاسکتا ہے۔ جو صاحب یورپ کی شایستہ قوموں کے برابر یہاں کی مستورات کے حقوق قائم کرنا چاہتے ہیں پہلے وہ یہ تو غور فرمائیں کہ قابلیت میں بھی برابری ہے یا صرف حقوق کی ہی برابری مقصود ہے۔ اگر قابلیت میں کمی ہے (یقیناً ہے) تو پہلے اپنے دام کھری

کرلیں اوس کے بعد پر کہنے والے کو دوشش دیں۔

حقوق حاصل کرکے اون سے مستفید ہونے کی صلاحیت بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ بڑے شہروں میں ایک آدہ واقعہ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ماباپ زرکثیر جمع کرکے چھوڑ گئے بیٹا نالائق ہوا یا قبل از شعور وہ دولت اوس کے ہاتہ آگئی یار لوگ ایسوں کی تاک میں ہی رہتے ہیں۔ ایک ایک کرکے آنے شروع ہوئے۔ کوئی دوستی کا دعویٰ کرتا ہے کوئی عاشقی کا دم بھرتا ہے ایک آزادی کے معنی سمجہاتا ہے تو دوسرا دولت کا استعمال بتاتا ہے۔ ایک دنیا کی بے ثباتی پر بحث کرتا ہے تو دوسرا لطف زندگی کی حقیقت کی تشریح کرتا ہے۔ اسیطرح سب مل کے دیوانہ بنا لیتے ہیں چند روز خوب دن عید رات شب برات رہتی ہے اوس کے بعد ڈگریاں آنی شروع ہوتی ہیں آخر کار رہنے کا مکان بھی بک جاتا ہے مُنہ چھُپانے کا کونا بھی نہیں رہتا اِس سے تو ماں باپ کی قید میں اچھے تھے مدعیان حمایت نسواں میں سے بھی بہت سے ایسے ہی نظر آتے ہیں کہ اظہار قابلیت یا ذاتی نفع کی غرض سے اِس قسم کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں لکھا کرتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ آج اگر وہ تمام حقوق جو مہذب و تعلیم یافتہ ملکوں میں حاصل ہیں ہندوستان کی عورتوں کو دیدیئے جائیں تو غدر ہو جائے۔ اس قید میں تو یہ حال ہے کہ جہاں چار مل کے بیٹھتی ہیں سوائے بدی غیبت طعن و تشنیع فتنہ و فساد کے اور کوئی بات نہیں ہوتی ہے

اس بے بسی پہ ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے۔

سب سے بڑی شکایت جو عورتوں کی طرف سے بیان کیجاتی ہے وہ یہ ہے

کہ بیچاریاں نیچروںنیں نبد میں مرد مزے سے ہوا کھاتے پھرتے ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن نیچروںنیں پیدا ہوئیں۔ نیچروںنیں بلیں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک بھی اُڑ کر کبھی نہیں گئیں آج اگر کھڑکی کھول کے باہر نکال دو تو ایک ایک کرکے سب کو بلی لے جائے۔ چار قدم اسٹیشن پر پیدل چلنا پڑتا ہے تو سانس چڑھ جاتا ہے حال سے بے حال ہو جاتی ہیں بھلا یہہ ٹھنڈی سڑک کے قابل ہیں؟۔ دس پانچ مل کے کبھی سیر کے نام سے کہیں جاتی ہیں تو وہاں کا سماں حشر کے میدان سے کیا کچھ کم ہوتا ہے۔ کسیکا بچہ پھول توڑنے پر مچل رہا ہے تو کوئی اونہیں بلک رہا ہے ایک کہیں بہی جاتی ہو تو دوسری کسیطرف اُڑی جاتی ہے۔ خدا خدا کرکے گھر ہیو کہیں تو کسی بچے کی جوتی ندارد کیسیکی ٹوپی غائب گوجروں کے ڈر سے اپنا زیور بڑھا گئی تہیں ورنہ گہر آن کے اوسکی بہی ڈھونڈیا پڑتی۔ یہ حال اوس پہلی آزادی کا ہے جسکی خواہش اکثر رہتی ہے اور سال میں ایک آدہ دفعہ حاصل بہی ہو جاتی ہے بہتیرے حقوق تو ایسے ہیں کہ اون کے وہم وگمان میں بہی نہیں۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھتی ہیں اور زبردستی اون کے حوالہ کیے جاتے ہیں وہ تو حقوق ایسے چاہتی ہیں جنمیں اون کی تفریح ذاتی متصور ہو اور ذمہ داری کچھ نہ ہو مثلاً روپیہ تو صرف کردیں گی مگر حساب رکھنے کا جھگڑا نہیں لگائیں گی بازار تو ہو آئینگی مگر سودا لانا مردونکا کام ہے۔

مختصر یہ کہ اسوقت باستثنائے الشاذ کالمعدوم عورتو نمیں نہ اپنا حق قائم کرنے کی قابلیت ہے نہ اوس سے مستفید ہونے کی صلاحیت اور بغیر اس کے ادائے حقوق کی خواہش یا ارادہ کرنا بالکل بیجا بلکہ خطرناک ہے۔

ان امور پر غور کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ہندوستان کی مستورات یورپ جیسے حقوق کی قابلیت رکھتی ہیں یا نہیں
(۲) قابلیت نہیں ہے تو اس نقص کے ذمہ دار مرد ہیں یا خود مستورات یا دونوں۔ اگر دونوں ہیں تو کتنا کتنا حصہ کس کس کا ہے۔
(۳) ناقابلیت کا نقص کیونکر رفع ہو سکتا ہے یعنی اپنی اپنی جگہ دونوں کو کیا کوشش کرنی چاہیئے +

میں سمجھتا ہوں اِن ہی امور پر بحث کرنا تمدّن کا موضوع لہٰ ہے اور دلائل عقلی و عملی و عام ہونگی نہ کہ خاص و مبنی بر اغراض ذاتی امید ہے کہ تمدن کے نامہ نگار صاحبان انہیں سے ہر ایک سوال کو ایک مستقل مضمون تصور کر کے بحث فرمائیں گے تاکہ خلط بحث نہو اور سوسائٹی کو واقعی نفع پہونچے۔ میں خود بھی بشرط فرصت کبھی کبھی کچھہ عرض کرونگا۔

اشرف حسین

آخر نقاب اُلٹ گیا۔ یہ ایک انگریزی ناول کا ترجمہ ہے جسکو منشی محمد غلام حسن خانصاحب پشاوری آرمی کنٹرکیٹر و سکرٹری انجمن حامی تعلیم نسواں ملتان نے نہایت محنت سے ترجمہ کیا ہے۔ منشی صاحب کو تعلیم نسواں سے بہت بڑی دلچسپی ہے اور اُن چند حضرات میں سے ہیں جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ قومی خدمات میں بسر کرتے ہیں اس کتاب کی تمام آمدنی منشی صاحب نے تعلیم نسواں کی ترقی کے واسطے وقف کر دی ہے اس لیے ہمیں اُمید ہے کہ صاحب موصوف کی یہ محنت وقعت سے دیکھی جائے گی اور حامیان تعلیم نسواں اسکی خریداری میں ایک نتیجہ دو کاج کی مثل کو ملحوظ رکھیں گے۔ منشی صاحب موصوف۔ کیمبرج روڈ ملتان سے ملتی ہے۔

ادائے بے نیازی

مرے دلکو بھاگئی ہے یہ ادائے بے نیازی — کہ ہے بے نیاز ہو کر تمھیں پاس دلنوازی
یہ عدم کے جانیوالے ہیں تمھارے ہی تو شایق — کوئی رہ گیا ہے پیچھے کوئی لیگیا ہے بازی
مجھے آرزوے وصلت تمھیں عاشقوں سے نفرت — مجھے دلدہی کی عادت تمھیں خوئے بے نیازی
مرا منہ ہے جو کہوں میں کہ نہیں خیال میرا — یہ نہیں تو کر رہے ہو مرے دل کی چارہ سازی
جو سحر پہ منحصر ہو رخ مہروش کا جلوہ — تو نہ عاشقوں کو کھٹکے شب ہجر کی درازی
نہیں اعتنا جو میری تو نہو کہ تم ہو کیتا — جو میں سر کو تم پہ واروں تو ہے میری سرفرازی
مرا ہند گو وطن ہے کوئی جستجو تو دیکھے — کہ چلا ہوں سوئے یثرب پئے دلبر حجازی
یہ مرے دل و جگر ہیں، جو تمہارے ہو گئے ہیں — مری جان سخت مشکل ہے مگر نہ عشقبازی
جو ہو فرد حسن میں تم تو میں عاشقی میں کامل — تمھیں فخر بے نیازی مجھے فخر جانگدازی
یہ تمہارا آستاں ہے کہ ہے دیر بھی حرم بھی — یہیں جمع ہیں برہمن یہیں آئے ہیں نمازی

کبھی سنگدل سے جلکر جو یہی ہیں گرم آہیں۔
تو کرے گی نرم **محوی** اوسے میری دلگدازی

محوی لکھنوی

تاریخ وفات حضرت تسلیم مرحوم مغفور

تسلیم کہ مقبول جناب حق تھے — پاس اپنے منگائی روح انکی حق نے
ہاتف نے خبر یہ دی مجھے اے ارشد — تسلیم کو جنت میں جگہ دی حق نے

۱۳ ۵ ۲۹

ارشد تھانوی

شکست کی آواز

اگر یہ سچ ہے کہ انسان کے لیے بہترین مضمون مطالعہ خود انسان ہے تو کوئی ذی عقل حیوان بھی ایسا نہیں جو کسی پہلو سے بھی دلچسپ نہیں۔ بُری سی بُری صورت میں بھی کوئی خاص انداز کوئی انوکھی ادا۔ غرض کوئی نہ کوئی دلکش بات ضرور نکلتی ہے۔ اگر کسی کی صورت بُری ہے تو آواز اچھی۔ اگر دونوں بُری ہوں تو بشرہ اچھا۔ جو صورت سے ایک بالکل علیحدہ چیز ہے۔ کسی کا ظاہر خوب ہے۔ کسی کا باطن خوب تر۔ صورت۔ سیرت کا ایک خاص معیار قرار دے کر ہر انسان کو اسی سے جانچنا سنیر نتھی کو سولہ گرہ کے گز سے ناپنا ہے۔ یہ طریق عمل تمدّن کی تنظیم و استواری کے لیے لابدی ہو تو ہو۔ لیکن قدرت کے تماشائی کے لیے ہرگز موزوں نہیں +

قدرت کے نقاد کے لیے صرف یہ ضروری ہے کہ ہر شے کو غائر نظر سے دیکھے۔ اور جو تاثرات یا محسوسات اُس شے کا نتیجہ ہوں۔ اُن کو بلا کم و کاست بیان کرے۔ اس خیال سے ایک شخص کے حالات بیان کرتے ہوئے صرف اسقدر لکھدینا کافی ہے کہ ہمارے آئینہ تاثرات پر اُسکا کیسا اثر پڑا۔ راقم الحروف کو اسوقت کسی خاص فرقہ کے حسن و قبح سے بحث نہیں صرف ایک دلچسپ شخصیت کا خاکہ کھینچنا مقصود ہے۔

تم ایک ایسے پیشہ سے تعلق رکھتی تھی۔ جو دنیا کے قدیم ترین پیشوں میں سے ہے اور ہند میں مثل اور پیشوں کے موروثی ہوگیا ہے۔ مغرب میں لوگ اس جماعت کو بُرے بُرے ناموں سے یاد کرتے ہیں لیکن

مشرق میں یہ جماعت تمدن کا جزو لاینفک ہو گئی ہے اور لوگ اسکی ہستی کو خاموشی کے ساتھ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انگریزی خوانوں کی ایک جماعت منجملہ اور تمدنی اصلاحوں کے اس فرقہ کی درستی کا بھی بیڑا اٹھاتی ہے۔ لیکن فی الحال ان کی کوششوں کا اسیقدر نتیجہ نکلا ہے کہ تعلیم یافتہ جماعت کی دلچسپی اس فرقہ کے ساتھ قدرے ترقی پا گئی ہے م۔ کا مسکن شمالی ہند کا ایک بارونق شہر ہے۔ جہاں راقم الحروف کا اکثر گذر ہوتا ہے ایک قیام کے دوران میں ہمارے ایک عنایت فرما جنکی م کے ہاں آمد و رفت تھی ہم کو بھی وہاں لے گئے۔ گانے کا ہنر بدرجہ کمال ہر اہل نظر کو کھینچ بلاتا ہے۔ ایک کوٹھے پر کہ جس کے نظر فریب برآمدہ کو سر کی کی نازک چقیں گستاخ نگاہوں سے محفوظ کر رہی تھیں۔ اور جسکا تنگ و تاریک زینہ اجنبی قدموں کے لیئے ضرور مخدوش تھا۔ ہماری ملاقات ہوئی صورت میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ آنکھیں۔ دوربین آنکھیں جن کی شعاعیں قلب انسانی کی تہ تک پہونچتی تھیں۔ بے چین طبیعت اور نازک حس کی گواہی دیتی تھیں سرسری گفتگو کے بعد گانے کی فرمائش ہوئی راگ کے اعتبار سے غزل پیش پا افتادہ گانا ہے لیکن مضمون بھی تو آخر کوئی شئے ہے ؎

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

استاد کے الفاظ۔ جنکی نشست گویا انگشتری میں نگینہ۔ درد بھری آواز جو چوٹ کھائے ہوئے دل کا قدرتی نغمہ تھی۔ سامع پر کیونکر اثر نہو۔ چوٹ کھایا ہوا دل، یہ الفاظ بے ساختہ قلم سے نکل گئے کسے خبر تھی کہ یہ

دریائے نغمہ بہت جلد موت کی سردی سے منجمد ہو جائے گا۔

میرے عنایت فرما جنکا مسلک اچھی صورت کی داد دینا۔ اور عالمگیر لگاوٹ بازی تہا۔ دبی زبان سے چاہنے کا لفظ زبان پر لائے۔ آہ! چاہنا آہ سرد لبوں پر تھی اور آنکھوں میں چشم آہوئے زخم خوردہ کی حسرت تہی۔ آہ! چاہنا ہاں صاحب زبان سے کہنا بہت آسان ہے۔ لیکن کر کے دکھانا بہت مشکل۔ جب کلیجہ کو پتھر بنائے تب کیسکو چاہے۔ کسے معلوم تہا کہ باغ ہستی کے اس نو دمیدہ پہول پر محبت کی اوس پڑ جائے گی۔

چند ہفتہ بعد مشہور ہوا کہ تم نے زہر کھالیا۔ ؎

بات پہوٹی ہے چمن میں مرے مرجھانے کی
اڑی پرزوں کی طرح پرزونکے اڑوانے کی

وہ بدنصیب اس شرمناک نظام کا شکار ہوئی کہ جس نے اُسے پیدا کیا تھا۔ کیا اور عورتیں محبت کرنے کا حق رکھتی ہیں اور وہ اس پیدائشی حق سے محروم تھی کیا اور عورتوں کی گود تبسم طفلی کے پہولوں سے بہر سکتی ہے اور اسکا دامن مراد ازل سے خالی تہا۔ مانا کہ اس کا انتخاب بہت مبتذل تہا اور اسمیں سوائے ہنر کے اور کوئی خوبی وہبی یا اکتسابی نہ تھی۔ لیکن پسند کسی قوانین کی پابند نہیں بعض کا مقصود ادنیٰ ہے بعض کا اعلیٰ۔ دوسروں کو کیا حق تھا کہ اپنی خود غرضی سے اسکو ہم آغوش مدعا ہونے سے روکتے وہ تائبوں کے زمرہ میں آنا چاہتی تہی لیکن اس کے عزیز سدراہ ہوتے وہ خدا کے گھر میں پناہ لینا چاہتی تہی لیکن انسان نے اسکا دروازہ بند کر دیا۔ اُسکو معلوم ہوا کہ وہ اس جگنو کی مانند تہی جسکو ایک دور افتادہ دشت کے سیاح اپنی برچھی کی نوک پر بیدرد کر مشعل کا کام لیتے ہیں اُسکو

بتایا گیا کہ تیرا کام صرف تمدن کی نجاست کو صاف کرنا ہے۔ پاک و صاف زندگی کی تمنا کرنا تجھے زیبا نہیں جب وہ غریب مفلس عورتوں کو جن کے پھٹے ہوئے کپڑے اُن کے بے ڈول اعضا کی عیب پوشی کرتے ہیں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتے دیکھتی ہوگی۔ تو اس کے دل پر کیا کچھ صدمہ نہ گذرتا ہوگا۔ جب وہ بچوں کو اپنی ماں کی گود میں مچلتے دیکھتی تھی تو اس کے کلیجہ پر کیسا سانپ لوٹتا ہوگا۔ لیکن اُس سے ہمدردی کرنے والا کون تھا۔ عوام کی نگاہ میں تو وہ صرف بازار کی مٹھائی تھی جس کی چاشنی ہر شخص مول لے سکتا ہے کون جان سکتا تھا۔ کہ اس مٹھائی کی ترکیب میں کسقدر تلخی آمیز ہے۔ اسکی ظاہری وضع نزاکت و نفاست و تنعم سے مرکب تھی۔ یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ زم چہرہ حسرت سے پتھرائے ہوئے دل کی صرف بیرونی نقاب ہے جسنے جام محبت کی تلچھٹ کو پی لیا تھا۔ اُس کے لیے زہر کا پیالہ پی لینا کیا مشکل ہے۔ تو بھی تخیل اس موت و زیست کی کشمکش کا تصور کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ جسنے آخری وقت اُس کے ہاتھوں کو ضرور مرتعش کر دیا ہوگا۔ آنکھوں کی اُس تڑپ کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے جو ابدی تاریکی کا پردہ پڑنے سے پہلے اُنھوں نے روشنی کی آخری ماند پڑتی ہوئی شعاع کے لیے کی ہوگی۔

آخر اس مشت خاک کے سب ولولے سرد پڑ گئے۔ اور آتشین جذبات کی راکھ مٹی کے ساتھ مٹی ہوگئی۔ کاش کہ اس بے چین روح کو عدم کی وسعت میں وہ آرام ملا ہو۔ جسکی وہ دنیا میں متلاشی تھی۔ دنیا کی مصنوعی تنظیم میں اُسکو جائز خوشی سے بہرہ ور ہونیکا موقعہ نہیں ملا۔ کیا کائنات کے حقیقی نظام کے ترازو میں یہ کھوٹا شر بھی کچھ کار آمد ہوگا ÷

جتنی نظمیں شعرائے ایران کی ہیں۔ اون میں سوا لفاظیوں اور ادعائی بلند پروازیوں کے فطرت کی کارسازیوں اور قدرت کے خوبیوں کے نظارے کا ذکر کہیں خال خال ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ شاعر نے فطرت کو پیش نظر رکھکر نظم نہیں کہی بلکہ جہاں اور مختلف خیالات کے اشعار قلم سے نکلے وہاں دو ایک شعر ایسے بھی نکل گئے۔ جن میں فطرت کا رنگ اتفاقی آپڑا۔

اُردو شاعری نے ابتدا ہی سے فارسی شاعری کی تقلید کا جامہ پہن لیا۔ اسکا سبب یہ ہے۔ کہ اردو انہیں لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جن کے دماغوں میں فارسی شاعری بھری ہوئی تھی۔ سنسکرت۔ اور بھاشا اوس زمانے میں ٹھنڈی ہوگئی تہیں۔ اور اہل فارس کی کثرت آمد ورفت اور شعرا رفارس کے ہجوم سے ہندوستان ملک ایران کا ایک حصّہ ہورہا تھا۔ خود ہندوستان کے اصلی باشندے اپنی زبانوں کی شاعری چھوڑکر فارسی کی جانب ٹوٹ پڑے تہے ایسی سوسائٹی کے اثر سے یہ بات لازمی تھی۔ کہ اُردو شاعری میں جو گرمی پیدا ہو وہ فارسی کے شعلوں سے پیدا ہو اور ایسا ہی ہوا۔

فارسی شاعری کے تخم سے اُردو شاعری پیدا ہوئی۔ تو سائنس کے قانون وراثت نے اپنا زور دکھایا۔ اور اُردو نے فارسی کی صورتیں لیکر بڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ فرع اپنی اصل سے بالکل مشابہ ہوگئی۔ سائنس کے قانون تباین کا اثر صرف اسیقدر ہوا۔ کہ زبان میں ہندی کی آمیزش سے فارسی کے ساتھ اختلاف ہوگیا +

بہرحال اُردو کی شاعری فارسی کی پیدا کی ہوئی اور پروردہ ہے۔ اسمیں فطری مذاق کہاں سے آتا۔ یہ بہی اپنے دامنوں کو سمیٹتے ہوئے اُسی احاطے میں بیٹھ گئی۔ جو احاطہ اسکی مادر مہربان نے کھینچا تھا

ایک مدت تک غزل، واسوخت، مثنوی، اور قصائد، وغیرہ اسی قسم کی نظموں سے اردو کی سخن سنجی کا خزانہ معمور ہوتا رہا۔ اور نثر میں فسانہ عجائب اور سرور سخن کی سی کتابوں نے بلند نامی کے جھنڈے اڑائے۔ آخر سوسائٹی کے مذاق میں کچھ تغیر ہوا۔ اور زمانے میں حضرت آتش، حضرت غالب اور حضرت انیس سے سخن سرا پیدا ہوئے۔ آتش نے غزل میں جذبات غالب نے جذبات نظم کے ساتھ نثر میں سلاست، اور انیس نے فطری نقاشی کی خوبیاں پیدا کیں۔ ان بزرگوں کے نام شاعری کی تاریخوں میں آبِ زر سے لکھے گئے۔ لیکن ان کے دماغوں۔ اور قلموں سے جو نظمیں نکلیں۔ وہ صرف ایک ہی صنف کو لیے ہوئے تھیں۔ مثلاً آتش اور غالب صرف تغزل کے عمدہ نوا سنج اور اسی صنف میں جدت آفرینی کے ساتھ لطیف گو ہوئے۔ اور انیس نے مرثیہ اور سلام کو اختیار کیا وہ صرف اسی صنف میں انتہائے کمال تک گئے اون کے کھینچے ہوئے فطری نقشے دلچسپ، دل کش، اور دلفریب ہیں لیکن وہ اونہیں حدود تک محدود ہیں۔ جو حدود مرثیہ اور سلام کے لیے قایم اور موزوں تھیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ جو تصویریں انیس مرحوم کے قلم سحر رقم نے دکھائی ہیں۔ وہ لاجواب ہیں۔ زبان اون کے قابو میں اور فصاحت اون کے قبضے میں تھی۔ مگر میرا مطلب یہ ہے۔ کہ فطرت کی عام جلوہ آرائیوں اور قدرت کی وسیع کارسازیوں کی جانب اون کو توجہ نہیں ہوئی تھی توجہ نہونے کے کچھ ہی اسباب ہوں مجھے اون سے بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ بات لکھنی ہے۔ کہ جو مذاق علمی اور عملی صورتوں کے ساتھ آج نظموں اور نثروں میں نظر آرہا ہے۔ یہ انگریزی علم ادب سے اردو میں آیا۔ اور یہ مشرق کی سرزمین سخن میں مغرب کی تخم افشانیوں کے ثمرے ہیں۔

جدید مغربی مذاق کے پھیلتے ہی ہندوستان میں نیچرل شاعری کا وہ طوفان اوٹھا جسکی انتہا نہ رہی۔ دنیائے شاعری میں نوخیز اور نوآموز لڑکے (جن کی زبانیں اور جن کے قلم صحیح رفتار سے ناآشنا تھے) اپنے لڑکھڑاتے ہوئے۔ پاؤں اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے قدموں سے چل کھڑے ہوئے اِس طوفان بے تمیزی نے سخن سنجی کے صاف راستوں کو برباد کر دیا۔ آجکل ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ ناواقفانِ سخن اپنی نافہمی کے ساتھ سخن سرائی کے مدعی ہیں۔ نہ وہ شتر گربہ کو جانیں، نہ تعقید کو، نہ شایگاں کو، نہ اور کسی نقص کو، اُن کے خیالِ خام میں سخن سنجی کے واسطے پختہ مغزی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ نافہمی کے ہجوم سے دماغ میں اِس خیال کو لا ہی نہیں سکتے کہ دنیا کا کوئی علم اور کوئی فن اصول سے متجاوز ہو کے کامیابی کی منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔ ایسے لوگوں کی نظمیں سوا اِس کے کہ ارباب فہم کے دماغوں کو پراگندہ اور نگاہوں کو پریشان کریں۔ کوئی دوسرا نفع نہیں پہونچا سکتیں۔ وہ قلمروِ سخن میں ٹکسال باہر ہیں۔

یہ طوفان بے تمیزی برپا ہوا۔ برپا ہے۔ اور غالباً ابھی برپا رہے گا لیکن اِس افسوس کے ساتھ ہی کچھ اسباب اطمینان کے بھی مہیا ہو گئے ہیں یعنی اقلیم سخن نے حضرت سحر البیان "شوق قدوائی" کے سے قادر الکلام سخنور کو پیدا کر دیا۔ جن کے پُرزور دماغ نے سائنس اور فلسفہ کے ہم مسائل کو فصیح اور سلیس اردو میں با اصول نظم کر کے یہ بات ثابت کر دی کہ اگر زبان دانی کیساتھ کلام پر قدرت کاملہ ہو۔ تو زبانِ اردو سخن پیرائی کی ہر صنف کو نہایت زور اور لطافت کے ساتھ اپنی گود میں جگہ دیسکتی ہے

علمی مسائل کے علاوہ حضرت شوق قدوائی نے جو سینریاں دکھائی ہیں اور سبزہ زار قدرت کے جیسے چمن صفحوں پر کھلائے ہیں نیز

انسان کے فطری جذبات، فطری خیالات، اور فطری اداؤں کی جیسی سچی اور خوشنما تصویریں کھینچی ہیں۔ اون کی مثال اگر آج ہندوستان کی زندہ شاعری میں تلاش کیجائے۔ توسوا حضرت شوق قدوائی ہی کے نظموں کے اور نہیں مل سکتی۔ ایسی حالت میں مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ کہ حضرت شوق قدوائی ملکِ سخن میں فی زمانناخود ہی اپنی مثال ہیں۔ اور یہ قول ہندوستان کے مشہور ایڈیٹر حضرت حکیم برہم کا جو اخبار مشرق کے مالک ہیں بہت صحیح ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی) اور حضرت شوق قدوائی کی نظم ونثر کی داد روح القدس سے ملتی ہے۔

"عالم خیال" کے پہلے نمبر پر ہندوستان کے جلیل القدر فاضل مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا کا نہایت عمدہ ریویو "الناظر" میں نکل چکا ہے۔ جسکو دیکھکر میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "کہ حضرت بیرسٹر کے سخن فہمانہ خیالات، محققانہ اشارات، اور حکیمانہ نکات نے اس نظم کے فلسفہ کی نہایت ہی فصیح، بلیغ اور لطیف شرح کردی ہے۔ اگر حضرت بیرسٹر کے ادیب قلم سے ریویو کی روشنی نہ پھیلتی۔ تو نظم کی بلندی تک بعض کوتاہ بیں نظر پہونچ بھی نہ سکتی۔ اور سلسلہ نظم کا قایم کرنا توعموماً دشوار ہوتا۔

"عالم خیال" کے دوسرے رخ پر مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا کا ریویو الناظر میں نکلا۔ وسیع الخیال اور قابل بیرسٹر نے جن لطافتوں اور نزاکتوں کی شرح کی ہے۔ اِن کو دیکھ کے نظم اور ناظم دونوں کو لاجواب اور یکتا کہنے میں ذرا بھی تامل کی وجہہ نہیں ہے۔

انگریزی تعلیم اور یورپ کے نظارے سے فطری مذاق پر جیسی وسعت

نگاہ کی اِن دونوں فاضل اور محقق بیرسٹروں سنے دکھائی ہے معمولی مذاق کے آدمیوں سے یہ ممکن نہیں۔ جیسا حق سخن حضرت مصنف نے ادا کیا۔ ویسا ہی حق شرح دونوں جلیل الشان فاضل بیرسٹر صاحبان نے۔

علمی قلمرو کے دونوں رفیع القدر اہل قلم بالاتفاق اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ انسانی جذبات اور فطری خیالات کی ایسی مسلسل نظمیں انگریزی میں بھی نہیں ہیں اور اِسی دلفریب طرز کے موجد اُردو میں حضرت شوق قدوائی ہی ہوئے۔ جن کے کمال سخن اور زور کلام نے علمی اور فطری نظموں سے ہندوستان کے سخن فہموں اور پاکیزہ خیالات رکھنے والے سخن سنجوں سے احسنت و آفرین کی آوازیں بلند کرا دیں۔

بقول نامور ادیب حضرت برہم کے اس زمانے میں یہ فخر ہمارے صوبہ جات متحدہ ہی کو حاصل ہے کہ اِس میں "لسان العصر حضرت اکبر" اور سحر البیان حضرت شوق قدوائی،، دو یکتہ تازِ سخن موجود ہیں۔

میں کہتا ہوں۔ خدا ان دونوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ انہیں دونوں سے اسوقت ہندوستان کی اُردو شاعری اصول علمی اور لطافت زبان کے ساتھ اوج کمال پر پہونچی ہوئی اپنے خوشنما جلوے دکھا رہی ہے۔

"عالم خیال" کے دو رخ دو اعلیٰ درجے کے قابل بیرسٹروں سنے دے دیئے۔ اب میں بحیثیت ایک وکیل کے نمبر سوم کا مدعی ہوں یعنے میں نے عالم خیال کے تیسرے رخ پر ریویو کے لیئے قلم اُٹھایا ہے۔

یہ نظم دوسرے رخ سے دست و بغل ہے۔ یعنی شوہر کی جانب سے اوس کی فرقت نصیب زوجہ کے خط کا جواب ہے۔ جسکا پہلا شعر یہ ہے

"تمھارے خط کو دیکھکر نظر اوسی میں گھر گئی تمھاری شکل خط کے ساتھ پتلیوں میں پڑ گئی"

خط کو دیکھ کے جوشِ محبت سے نظر کا اوس میں گھر جانا اور اوس کے لکھنے والی کی شکل کا پتلیوں میں پھر جانا۔ نہ اس سے زیادہ فطری جذبے کا اظہار ہوسکتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ فصیح الفاظ میں خط اور پتلیاں اِن دونوں کی محبتانہ کشش نظم سے پیدا ہوسکتی ہے۔ شاعر نے لطف بیان کا خاتمہ کردیا اور حرفوں سے محبت کی مجسّم شکل دکھا دی۔ اس خط کے الفاظ سے کیا حالت نظر آئی ؟ اس حالت کا مصوریہ دوسرا شعر ہے۔

"ہے لفظ لفظ خط کا درد غم کی داستان سے
قلم تمہارا دل بنا وہ بول اوٹھا زبان سے"

عورت کے درد و رقت کا اثر شوہر کے دل پر الفاظ سے پڑگیا۔ وہ الفاظ کون ہیں ؟ وہ ہیں ! جن کو قلم نے عورت کا دل بنکر اپنی زبان سے ادا کیا ہے اس شعر کا دوسرا مصرع ترکیب کی خوبی اور زبان کی فصاحت کے ساتھ اس قدر بلاغت کو لیئے ہوئے ہے۔ اور اتنے وسیع مطالب کا گنجینہ ہے کہ اسکی پوری شرح کسی رقت زدہ کا دل ہی کرے تو کرے قلم نہیں کرسکتا ۔

عورت کی دردانگیز حالت کو سمجھ بوجھ کے شوہر کس خوبی سے عورت کی دلجوئی کا پہلو لیے ہوئے اوس کے شکوؤں اور اوس کی بیچینیوں کو تسلیم کرتا ہے۔

"تمھارے سب گلے بجا۔ تڑپ بجا۔ اَلم بجا۔
تمھاری سب شکایتیں تمھاری ہی قسم بجا"

اس قسم سے عورت کے دل پر یقین کا اثر جس لطف سے ڈالا گیا ہے اسکو اہلِ فہم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور محاورے کی نفاست نے زبان کا جو مزہ

پیدا کیا ہے۔ اسکو زباں دانوں کے دلوں سے پوچھیے۔

اظہارِ اضطراب کے بعد شوہر نے عورت کے اس بیان کا (جو عورت کے لکھے ہوئے خط میں ہے) کہ وہ سٹرن کی طرح ٹہل ٹہل کے رات کاٹتی ہے۔ ذیل کے شعر سے جواب دیا ہے۔

"اُدھر ٹہل کے شب کٹے اِدھر تڑپ کے شب کٹے
یہ سوچ شام ہی سے ہو کہ دیکھیں رات کب کٹے"

دوسرا مصرعہ کتنا پاکیزہ خیال لیئے ہوئے ہے۔ اور کس لطف سے اوس فطری حالت کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو اضطراب کے وقت پیش آتی ہے۔ اور جس کی لازمی صورت یہ ہے کہ انسان شام ہی سے بیقرار ہو ہو کے صبح کے جلد نمودار ہونے کی تمنا کرے۔ یہ طے شدہ کلیہ ہے۔ کہ فرقت زدہ پر رات بھاری ہوتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ دن کو مختلف شکلوں کا نظارہ خیالات کو کچھ نہ کچھ ادہر اودہر بہلائے رہتا ہے۔ اور رات کو سب خیالات سمٹے ہوئے مصائب فرقت کے ہجوم میں گھر جاتے ہیں۔

اس شعر کے بعد چار اشعار سیات کو ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ "تمھارا چین میں تھا اور میری خوشی تم تھیں، فراق سے۔ دونوں کی راحتیں اضطراب ہوگئیں، اب نہ وہ ہنسی ہے۔ نہ وہ روح کی تازگی ہے البتہ یہ نقشہ ہے کہ

"شباب۔ رنگ حسن۔ انکی صورتیں بگڑ گئیں
گھروندیں لوٹ پڑ گئیں تو بستیاں اجڑ گئیں"

یہ شعر اظہار حالت کے ساتھ زبان کی پاکیزگی۔ بیان کی فصاحت۔ اور مثال کی خوبی کو جس لطف سے دکھا رہا ہے یہ نفاستیں شاعر کی سحرالبیانی کی نہایت پُراثر تصویریں ہیں۔

فطرت انسانی کا یہ قاعدہ ہے۔ کہ کثرت رنج کے مصائب کو جھیلتے جھیلتے اُس کے خیالات حسرت کے ساتھ اسباب آسایش کے جویا ہوتے ہیں۔ اسباب آسایش کی جستجو کے پانچ مسلسل اشعار جو سحر البیان سخن سنج نے اس موقع پر کہے ہیں اور جن میں تخیل لطیف، کمال فن، فصاحت کلام، اور جدّت معنی آفرینی کے ساتھ حسرت کا ایسا پُر درد نقشہ کھینچا ہے جس سے بہتر اور جس سے زیادہ پُر اثر اُردو کی نظموں میں آجتک میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ وہ اشعار یہ ہیں +

"جہاں کوئی دوسرا جو غم سے پاک ہو کہیں — تو ہم تم اس جہان سے نکل چلیں ہم وہیں
یہاں ہزار آفتیں - انہیں میں دل گھرا کریں — یہاں ہزار گردشیں انہیں میں پھرا کریں
وہ ملک چل کے ڈھونڈھ لیں جہاں نہ آسماں ہو — جہاں نہ اسکے ظلم سے مصیبتوں میں جان ہو
جہاں نہ ہو اجل کہ اُس کو "اوس" کا داغ مٹ سکے — جہاں زمین ہی نہو کہ گور منہ میں لے سکے
جہاں نہ کوئی فکر ہو نہ بھوک ہو نہ پیاس ہو — جہاں نہ میں اداس ہوں جہاں نہ تم اداس ہو"

یہ قدرت کلام اور ایسے دل کو ہلا دینے والے پرتاثیر مضامین جو سلاست بیان کے ساتھ انسان کے خیال کو مسخر کر کے اپنی جانب کھینچ لیں۔ فی زماننا حضرت شوق قدوائی ہی کے قبضے کی چیزیں ہیں

عورت نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ کہ بے ساختہ میرے آنسو ٹپک پڑے اور خط کے حرف بگڑ گئے۔ میں مجبور ہوں۔ شوہر کس لطیف شعر سے جواب دیتا ہے:

"تمھارے آنسوؤں کے داغ خط میں جس جگہ پڑے
وہ خط سی میرے دلمیں آکے داغ بنکے رہ پڑے"

میں کہتا ہوں کہ اس سے بہتر شعر اس موقع کے لیے ہو ہی نہیں سکتا دیکھئے سیدھے سادے الفاظ ہیں لیکن اپنی فصاحت اور ترکیبوں کی لطافت سے

شعر سہل ممتنع کی تعریف میں داخل ہوگیا۔خوبی بالائے خوبی یہ کہ چند مختلف مطالب کو صرف ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔اگر زبان اور کلام پر قدرت کاملہ نہوتی۔تو یہ مطالب بجائے ایک شعر کے چند اشعار میں ادا ہو سکتے

عورت نے مصائب سے تنگ ہو کے اپنے خط میں لکھا تہا کہ اب میں زندگی سے در گذری۔موت کی تمنا کروں گی

یہ فطرت انسانی کا عام اور خیالات نسوانی کا خاص شیوہ ہے کہ رنج وغم کی کثرت اور مصائب کے ہجوم سے مجبور ہو کے حیات مصائب انگیز سے بیزاری، اور مرگ کو قطع مصائب کا ذریعہ قرار دے کے اوسکی تمنا ظاہر کی جاتی ہے۔

مرد نے کس لطیف اور فصیح پیرایہ میں دعائے درازی عمر کے ساتہہ عورت کو جواب دیا ہے۔

"تمھاری عمر ہو دراز اجل کا نام چہوڑ دو
لحد کے مُنہ میں خاک۔منہ سے یہ کلام چہوڑ دو"

لحد کے مُنہ میں خاک" اس پُر لطف محاورے نے جو نفاست اِس شعر میں پیدا کی ہے۔قابل لحاظ ہے۔

عورت نے خط میں یہ بہی لکھا تھا۔کہ تم میری لحد پہ آ کے سبزے کو دیکھنا وہ نرم اور ہرا ہے۔سوکھ کے خار اور مجھپر بار نہو جائے۔

وفادار مرد نے کس مزے کا جواب دے کے اوس کے خیال کو کدہر سے کدھر پھیرا ہے۔

"ہوا لحد کے سبزے کی بھرے نہ پھر دماغ میں
ہے سبزہ نرم اور ہرا تمھارے خانہ باغ میں"

یہ خانہ باغ کی جانب انتقال ذہنی شاعر کی کمال معنی آفرینی کی صاف شہادت ہے معمولی شاعر کا دماغ ایسے مقامات تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔ اس لطیف تخیل کے علاوہ یہ شعر اول سے آخر تک دلچسپ محاورات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

عورت چونکہ شکستہ دل ہے۔ اب مرد کو اس امر کے یقین دلانے کی ضرورت ہوئی۔ کہ وہ اوسے بھولا نہیں ہے۔ اور اوسکی محبت کو دل و دماغ میں جگہ دیے ہوئے ہے۔ ان مطالب کو وہ جن فصیح اور دل آویز الفاظ میں جن الفت خیز خیالات کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ یہ خوبیاں حضرت شوق قدوائی ہی کی سخن سنجی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ دوسرے کو حاصل نہیں

"نہ تم ہو بھولنے کی شے نہ تم ہو چھوٹنے کی شے
قسم خدا کی تم ہو دل میں اور دل بغل میں ہے
نظر میں کھب کے۔ نور بن کے۔ تم مری نظر میں ہو
جمال بن کے دل میں ہو۔ خیال بنکے سر میں ہو"

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ بلاغت معنوی سے لاجواب ہے۔ اور دوسرے شعر میں جتنے ٹکڑے ہیں سب جواہر کے ٹکڑے ہیں۔

شوہر نے عورت کی محبت کو اپنے جذب قلبی کے ساتھ ظاہر کرکے اوسکی یاد کو تازہ رکھنے کی جو تصویریں کھنچی ہیں۔ یہ اردو کی شاعری میں حضرت قدوائی کی سحر البیانی کے سوا اور کسی کے قلم سے کھنچتی ہوئی نظر نہیں آئیں گویا فطرت کے مجسم نقشے نہایت خوشنما اور دلفریب لباس میں پیش نظر ہیں۔

وہ یاد دلانے والے نقشے حسب ذیل ہیں۔ مگر صرف یاد کے متعلق بہت سے اشعار ہیں۔ میں چند اشعار تحریر کرتا ہوں۔ جسے وہ سب اشعار لطیف دیکھیے

وہ مئی کے تمدّن میں دیکھیے۔

"تمھاری مسکراہٹوں کو یاد کر رہا ہوں میں
کھلیں نہ دانت۔ اس ادا پہ صاد کر رہا ہوں میں"

یہ ادائے خاص اور پھر لطف قافیہ دونوں قابل صاد ہیں۔

"وہ بال کھول کر کبھی جھٹک کے سر کو تھامنا
لچک پڑے بدن تو پھر پلنگ کے در کو تھامنا"

عورتوں کی عادت ہے۔ کہ وہ سر کے بالوں کو کھول کے اون کے پیچ کھولنے کو ہاتھوں سے جھٹک دیتی ہیں۔ اس ادا کے ساتھ عورت کی فطری نزاکت کو کس لطف سے دکھایا ہے۔ یعنے جھٹکے سے سر کو صدمہ پہونچا۔ تو سر کو تھام لیا اور جھٹکے کی حرکت سے (نازک) بدن لچکا۔ تو پلنگ کے در کو تھام لیا۔

اس فصاحت، اس لطافت، اور ایسی فطری حالتوں کو اس نزاکت اور اس قدر پاکیزہ ترکیب کے ساتھ۔ ایک سیدھے سادے الفاظ کے شعر میں بیان کر دینا یہ حضرت شوق قدوائی کی سحر البیانی اور انتہائی قدرت کلام کی واضح دلیل ہے گویا زبان پر ایسا مستحکم قبضہ ہے۔ کہ جس ادا پر خیال کیا اوسکی پوری شبیہ نظم سے پیش کر دی

"گلوریوں کی صورتیں وہ خوشنما نئی نئی۔
سپید پان اوپر اور اندر اوس کے پستی"

یہ لکھنؤ کی گلوریاں ہیں پستی پان لکھنؤ میں وہ کہے جاتے ہیں۔ جو نہ بہت ہرے ہوں نہ بہت سپید۔ خوش مزہ ہونے کے سبب سے عمائد میں انہیں کا رواج ہے۔ مگر گلوریوں کی خوبصورتی کے لیے ایک پان بہت سپید اوپر رہتا ہے شاعر نے کس فصاحت سے [illegible] گلوریوں کی اصل حالت دکھائی ہے۔

"وہ ہار مجھکو یاد ہے کہا تھا دیکھکر جسے ہیں موگرے کے پھول کم نہیں پہنتی میں اسے
کرخت۔ بو ہے۔ سر میں درد ہوگا۔ وہ ڈال دو نہیں کو کامنی کے پھول چن کے تم نکال دو"

کیا اس سے زیادہ زبان کی فصاحت اور ترکیب سخن کی لطافت کے ساتھ نازک دماغ عورت کی فطری حالت کا اظہار سوا حضرت شوق قدوائی کے اور کوئی شاعر نظم سے کرسکتا ہے؟ اسوقت تو ہندوستان میں اور کوئی نظر نہیں آتا آیندہ کا حال خدا جانے! موگرے کے پھولوں کی خوشبو ہلکی ہوتی ہے اور کامنی کے پھولوں کی بو کرخت۔ عورت کی فطری نزاکت کے ساتھ ان پھولوں کی فطری حالت بھی دکھادی۔ دوسرے شعر کے ٹکڑے ایسے زینے ہیں۔ جو سخن کو عرش معلّی پر لے گئے۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ

"زری کریپ سے وہ چڑھ کہ چبھتی ہے یہ خارسی
پسند صرف ململ اور گلبدن بنارسی"

ہار سے دماغ کی نزاکت کا اظہار تھا۔ اور زری کریپ سے جسم کی نزاکت کا

اس شعر کے مصرعہ دوم کا قافیہ کیا لطف دے رہا ہے۔

اب چوڑیوں سے ہاتھوں کی نزاکت دکھائی جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ ذیل کے دونوں اشعار موتیوں کی دو لڑیاں ہیں۔

"وہ چوڑیوں کا پھیرنا کہا تھا دیکھکر جنھیں
چبھینگے ان کے گوکھرو نہ پہنونگی کبھی انہیں
کہو بدل کے لائیں ایسی چوڑیاں بڑی میاں
کہ تین تین بانکیں۔ چار چار ہوں کریلیاں"

لکھنؤ میں گوکھرو کی چوڑیاں بہت خوشنما اور قیمتی بنتی ہیں۔ لیکن ان کے گوکھرو ٹوٹ ٹوٹ کے ہاتھوں میں چبھتے ہیں۔ اسی سبب سے نازک مزاج عورتیں

نہیں ہنیتیں +

پہلے شعر سے اون چوڑیوں کی حالت دکھائی گئی ہے۔ اور دوسرے شعر سے سادگی کی ادا ظاہر کی گئی ہے یعنی صرف بانکین اور کریلیاں ہوں جو اپنی سادگی سے نزاکت کے لیے موزوں ہیں۔

"بڑے میاں" کے الفاظ جو لطف دے رہے ہیں زبان داں ہی اسکو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک عورت کی زبان سے یہ الفاظ کس قدر زیبا ہیں اور معمولی بول چال کا بے تکلفانہ مذاق کس خوبی سے ظاہر کر رہے ہیں قلم سے اسکی تعریف کہاں تک کی جائے۔ نگاہیں دیکھیں اور دل لطف اٹھائیں۔

بانکیں وہ چوڑیاں ہیں جن میں لہر ہوتی ہے۔ اور کریلیاں وہ ہیں جن میں لہر نہیں ہوتی بیچ میں بانکیں اور ادھر ادھر کریلیاں ہنی جاتی ہیں۔ تین تین اور چار چار کی تکرار سے دونوں ہاتھوں کی چوڑیوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ چونکہ عورتیں ہمیشہ طاق کا شمار چوڑیوں میں رکھتی ہیں۔ اسوجہہ سے سات سات چوڑیاں دونوں ہاتھوں کے لیئے چاہی گئی ہیں۔ العدری قوت بیانیہ! زبان دانانِ ذی فہم اس لطیف بیان کا اندازہ فرمائیں۔ کہ نظم کیا ہے گویا نثر میں بات چیت ہو رہی ہے۔

اب شوہر ایک اور دلچسپ واقع کو یاد کرتا ہے۔

گرا زمرد ایک شب جو لوٹ کر پلاق سے
تم اسکو ڈھونڈھنے لگیں چراغ لیکے طاق سے

تخیل جھنجھ بدل کے ایک واقعہ کی جانب پھری ہے کمال شاعری یہ ہے اِس واقع کی تصویر کیسی عمدہ اور کس لطیف اصلیت کے ساتھ کھینچی گئی ہے طاق کا قافیہ کتنا نفیس اور چراغ کی ضرورت سے کیسا لپٹا ہوا ہے۔ یہ سخن سنجیاں! لاجواب

ہیں لاجواب۔ اور یہ فطری ادائیں بے مثل ہیں بے شل۔ زبان ہے کہ چلتا جادو
اب شوہر شائستگی کے ساتھ عورت کی طنزیہ نوک جھونک کا جواب دے کے
قسموں کے ساتھ اپنی محبّت اور وفا کا اوسکو یقین دلاتا ہے۔

قسمیہ اشعار بہت ہیں۔ اور نہایت لطیف لطیف ہیں۔ مگر میں بخوف طوالت
چند اشعار لکھ کے ارباب فہم کے فصاحت پیرا خیالوں اور بلاغت سنج دماغوں
کے سامنے پیش کرتا ہوں +

"قسم تمھاری پتلیوں کی جن کی ہر نظر بلا — قسم تمھارے ابروؤں کی جن کے بس میں کربلا
قسم تمھارے دل کی جسمیں بارہا بھرا ہوں میں — قسم تمھارے وسوسوں کی جن میں اب گھرا ہوں میں
قسم تمھارے اس سخن کی طنز جس کا کام ہے — قسم تمھاری اس چھری کی ناز جس کا نام ہے
قسم تمھاری اوس ہنسی کی جس سے گل کھلا کرے — قسم تمھاری اس زباں کی مجھ سے جو گلا کرے
قسم شکن کی جبیں پہ ناز اوسکو ڈال دے — قسم صدا کی بات کو جب اللہ کے سانچے میں ڈال دے
قسم ہے بے رخی کی جسکو پھیر کے رخ عیاں کرے — قسم ہے خامشی کی جب نگاہ کچھ بیاں کرے

ایسی نازک خیالیوں کی دلفریب نظمیں، اُردو میں اب تک تو نظر نہیں آتی تھیں
ہاں! اب حضرت شوق قدوائی کی طبّاعیوں اور جدّت آفرینیوں نے قوت بیانیہ کے
اعجاز سے شاعری کے جسم مردہ میں نئی جان ڈالی ہے۔ اور یہ بات ثابت کردی،
کہ اگر زبان اُردو میں کمال اور قوت مقال حاصل ہے تو مشکل سے مشکل مضامین
اور نازک سے نازک خیالات کو فصاحت کے ساتھ نظم کرنے کے لیے الفاظ
اُردو میں کافی وسعت موجود ہے۔

"ریویو" طویل ہوگیا۔ اگرچہ نظم کی وسیع خوبیوں کے سامنے ابھی مختصر
ہی ہے، خیر! اب میں درمیانی اشعار کو چھوڑ کے اصل نظم سے متعلق آخر
کا ایک لاجواب اور لاثانی شعر لکھ کے اس ریویو کو ختم کرتا ہوں۔

عورت نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ کہ گھر میں انار کا پیڑ ہے اوس پر ہر روز پپیہے آتے ہیں۔ وہ مجھ پر ترس کھا کے اور مجھے شرم سے چپ پا کے تم کو (یعنی شوہر کو) پکارتے ہیں (یہ مطلب پی کہاں، کی آواز سے ہے) شوہر نے جواب میں لکھا

"پپیہے خوش رہیں کہ روز وہ مجھے بلاتے ہیں
جواب کہیں وہ "پی کہاں" تو تم کہو کہ آتے ہیں"

شوہر کی آمد آمد سے عورت کو تسکین دینے والا شعر اور پپیہوں کے استفسار کا جواب کیا اس سے زیادہ لطیف، فصیح، دلچسپ، اور پُراثر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! مصرع ثانی کا آخری ٹکڑا اس قدر لطیف ہے جس نے شعر کو اوج کمال پر پہونچایا ہے۔

اب میں ریویو کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ حضرت منشی احمد علی صاحب "شوق" قدوائی کی عمر میں برکت دے اور ہمیشہ نظر بد سے اون کو محفوظ رکھے۔ اون کی بدولت سرزمین سخن پر ایسے گراں بہا موتی بکھر رہے ہیں جن کو ارباب فہم سلیم و اصحاب مذاق لطیف کی نگاہیں شوق سے چن رہی ہیں چونکہ وہ دونوں نظمیں جو الناظر میں چھپی ہیں، اور یہ نظم جو تمدن میں چھپی ہے۔ سب عورتوں سے متعلق ہیں، لہٰذا قادر الکلام مصنف اون میں اضافت کہیں نہیں لائے ہیں، اس لیے کہ عورتوں کی زبان میں اضافت نہیں ہوتی نہ وہ اضافت بولتی ہیں نہ اضافت پر اون کی زبانیں مشاق ہوتی ہیں کہ وہ اوسے بے تکلف پڑھیں۔ فقط

سید مقصود علی۔ اسیونی۔ وکیل
از گوہر گنج

کرنا اور نہ کرنا

جو کرنے کے ہیں کام اونکو نہ کرنا
نہ کرنے کے جو کام ہیں اونکو کرنا

جو تقلید کرنا" تو یورپ کی کرنا جو تجدید کرنا" تو مذہب کی کرنا
جو تذلیل کرنا" تو ملت کی کرنا اگر فکر کرنا تو۔ شہرت کی کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

تمسخر ہر اک دیں پناہی سے" کرنا رعونت بھی کچھ قبلہ گاہی سے" کرنا
عداوت جو کرنا" تو بھائی سے" کرنا برائی جو کرنا" تو مائی سے" کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

امانت میں جتبک خیانت" نہ کرنا کبھی اسکو واپس امانت" نہ کرنا
کبھی راستی اپنی عادت" نہ کرنا بھلائی کی ہرگز حمایت" نہ کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

جو وعدہ کیا ہے تو ایفا" نہ کرنا بھلائی کا بھولے سے ایما" نہ کرنا
کسیکا کبھی عیب اخفا" نہ کرنا کبھی راستی کا ارادہ" نہ کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

شریفوں کا اعزاز ہرگز" نہ کرنا غریبوں پہ اکرام ہرگز" نہ کرنا
کمینوں کی تحقیر ہرگز" نہ کرنا ذلیلوں کی تذلیل ہرگز" نہ کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

جو تائید کرنا تو فیشن کی" کرنا اگر فکر کرنا" پوزیشن کی کرنا

زبانی حمایت بھی "فیشن کی کرنا تدابیر کچھ "ایجیٹیشن کی کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

نہ کالج کے چندے میں" انکار کرنا نہ یونی ورسٹی میں" انکار کرنا
مگر عذر دینے میں ہر بار" کرنا جو مانگے اُسے خوب ہی" خوار کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

نہ بھولے سے بھی امتحاں" پاس کرنا ہے بیہودہ کالج کی بکواس کرنا
فراغت کا آخر یہ" کیوں" ناس کرنا ضروری ہے راحت کا احساس کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

پس انداز کوڑی کفن کو" نہ کرنا کبھی یاد اہلِ وطن کو" نہ کرنا
کبھی یاد پہلے چلن کو" نہ کرنا کبھی یاد ماں اور بہن کو" نہ کرنا
کبھی کام کی بات کوئی نہ کرنا

پڑوسی ہو دکھیا تو پروا" نہ کرنا ہو بھائی پہ فاقا تو" پروا نہ کرنا
جو ہو باپ بھوکا تو پروا" نہ کرنا چچا گر ہو ننگا تو پروا" نہ کرنا
غرض کام کی بات کوئی نہ کرنا
ہمیں یاد ہے اب نہ جینا نہ مرنا

سیّد شوق تھانوی

ایک مصری خاتون کی تصویر جو زیب ورق اول ہے موجودہ مصری تمدّن کا پتہ دے رہی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ہندوستان کیطرح مصری خواتین قدرت کے انعام سے محروم نہیں ہیں فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد انکو اتنا وقت ملجاتا ہے کہ وہ زندگی جیسی نعمت کی جائز قدر کرسکیں گھر والی بیگم بیچ میں ہے سہیلیاں ساتھ ہیں اور موسیقی سے اپنا دل بہلا رہی ہے۔

ضمیرہ

گذشتہ سے پیوستہ

یہ تھا وہ درد انگیز نظارہ جس نے ضمیرہ کی جان پر بنا دی۔ ماں کی موت باپ کی سنگدلی۔ عزیز اقارب کی لاپروائی غرض تصویر زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جہاں امید کی جھلک دکھائی دے رہی ہو۔ ماں مری تو اچنبھا کیا اور باپ فرنٹ ہوا تو تعجب کیوں۔ رفتار دنیا شب و روز یہ گل کھلا رہی ہے اور ہم سے پوچھو تو جو کچھ ہوا نہایت درست اور بالکل بجا ہوتا ہے اکثر ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے۔ ہاں اتفاق تھا تو اور خوبی تقدیر تھی تو مرے پہ سو درے وہ واقعات تھے جنھوں نے ضمیرہ کو دیس سے پردیس پہنچا دیا۔

بھائی کی بدھیاں دیکھ دل بھر آیا بلک بلک کر چیخی اور بھینچ بھینچ کر لپٹی یہ وقت بھی ختم ہوا اور یہ بات بھی گئی گذری ہوئی ضمیر پڑا سوتا رہا اور ضمیرہ اپنی تقدیر پر آنسو بہاتی رہی۔ گذشتہ واقعات تو جو تھے وہ تھے ہی رونا یہ تھا کہ آیندہ زندگی میں بھی خوشی قریب قریب مفقود تھی۔ غیروں کا تو ذکر کیا حقیقی عزیز جان کے دشمن ہو گئے جس باپ نے منتوں مرادوں سے پالا جو کلیجہ کا ٹکڑا اور آنکھوں کی ٹھنڈک کہتا تھا ماں کی آنکھ بند ہوتے ہی ایسا الگ تھلگ ہوا کہ "اِن تلوں تیل ہی نہ تھا گویا"۔

بہت بجا تھا اسکا رونا اور نہایت درست اسکا پیچ و تاب نادان کی قدر و منزلت تو یہ کچھ کہ چھوٹے سے بڑے اور مرد سے عورت تک گھر بھر نے

آنکھیں بچھائیں اور جوان ہوئی تو یہ تیر پڑے کہ جس باپ سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں اس ہی نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینکدیا۔

وہ اسی اُدھیڑبن میں تھی کہ ضمیر کسمسایا۔ آنکھ کھولی اور بہن سے کہا میری جیب میں بھائی احسن کا ایک پرچہ ہے آپا وہ لیلو"

احسن کا نام سنتے ہی ضمیرہ اب اس دنیا میں تھی جسمیں سچی محبت کے پھول مہک رہے تھے خلوص کے ٹھنڈے چشمے جاری تھے صداقت کی نہریں بہہ رہی تھیں اور بادِ صبا شادمانی و کامرانی کے پیغام دے رہی تھی؛ اب احسن کی تصویر اس کے سامنے تھی جسنے برسوں کی باتیں مکتب کے دن اور بچپنے کی راتیں یاد دلادیں۔ ناتجربہ کار دل ان ٹھوکروں سے واقف نہ تھا جو اس منزل میں قدم قدم پر کھانی پڑتی ہیں۔

اس کے احسانات اور ان حسرت آمیز نظروں کا خیال جو شام کے جھٹپٹے وقت میں اسوقت جب ضمیرہ باپ کے حکم سے گاؤں بھیجی گئی ہے ایک تیر تھا جو ضمیرہ کے کلیجہ پر لگا اور پانی ہوکر آنکھہ سے نکل پڑا۔ اُٹھی بھائی کی جیب میں سے پرچہ نکالا۔ لکھا تھا۔

مبارک تھا وہ وقت اور اچھے تھے وہ دن جب آنکھوں کا نور سچ مچ کی حور سوہنی مورت اچھی صورت سیرت کی اچھی بات کی سچی بچپن کی رفیق شفیقوں کی شفیق احسن کی محرم ضمیرہ جیسی بیگم آنکھہ کے سامنے تھی۔ آج وہ باتیں کہانیاں اور وہ دن خواب وخیال ہوگئے بچی جان کی صورت مرکر (میرے منہ میں خاک) چچازاد بہن کی صورت جیتے جی ایسی چھپی کہ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈھ رہی ہیں مگر بیکار۔ راتیں اس اُمید پر صبح اور دن اس آس پر شام کئے مگر حسرت نصیب دل کی پژمردہ کلی

آجتک نہ کھلی محض اتنے سے قصور پر کہ ہم قبرستان کیوں گئے چچا جان نے
خون کے آنسو رلوادیے وہ مرنے والی بی بی جس کا دردِ فراق ہمکو کھینچکر لے گیا
آج کو زندہ ہوتی تو چچا جان کی اتنی مجال نہ تھی کہ اتنا بڑا ظلم کرتے ضمیرہ بیگم
تمہیں نہیں معلوم کہ بدنصیب احسن پر کیا گذر رہی ہے زندگی وبال زندگی کا
ایک ایک لمحہ ایک ایک سال عزیز دشمن اور جان اجیرن دنیا آفت اور جینا
مصیبت ہوگیا کس کا سبق اور کیسی تعلیم - کتابِ محبت ہر وقت آنکھہ کے
سامنے ہے جسکا ہر ورق ضمیرہ کی تصویر سے مزین ہے راتیں آنکھوں میں کٹیں
اور دن جنگلوں میں گذریں بادِ صبا فراٹے بھرے چشمے محل محل کر بہیں اور اترا
اترا کر چلیں مگر احسن کے کان ضمیرہ کی آواز سے آشنا نہ ہوں اکیوں پردیسن
ضمیرہ کیا اس آسمان سے زیادہ ظالم بھی کوئی شے دنیا میں ہوگی جو ہندوستان
کی سرزمین پر چھایا ہوا ہے اور جسنے سچی محبت کو دقیانوسی نگاہوں سے
دیکھکر دو دل توڑ دیئے -

عزیز اور عزیزوں کی عزیز ضمیرہ احسن کتنی ہی دور کیسا ہی مجبور اور
کسی حد تک معذور کیوں نہو اسکی دلی دعائیں ضمیرہ کے ساتھ ہیں -

اچھا! خدا حافظ

لڑکی اور لڑکی بھی ناتجربہ کار ناتجربہ کار بھی ضمیرہ جیسی جس نے محض باپ
کے حکم کی تعمیل میں کامل چار سال ایک ایسے گانوں میں بسر کر دیئے
جہاں پانوں تلے کی چیونٹی بھی دشمن تھی احسن کا یہ پرچہ دیکھکر تھرا اٹھی
گو اسکا دل یقین دلا رہا تھا کہ یہ تحریر احسن کی حالت زار کی سچی تصویر ہے
مگر اس شرم وحیا اور عصمت وعفت نے جو ان بنگیا ہوں کا ازلی زیور ہے ضمیرہ
کو پریشان کر دیا۔ جواب تو درکنار اسنے پرچہ پڑھتے ہی چتی چتی کر دیا۔ اور سہم کر نیچے آ بیٹھی

(۵)

آسمان کھل کھل کر گھرا، ابر جھوم جھوم کر برسے گھٹائیں آئیں اور گئیں کلیں اور برسیں، بجلی کوندی، بادل گرجے، منہ بند کلیاں پھول ہو ہو کر مرجھائیں، تاری سے چمکے اور ڈوبے پھول مہکے اور لہکے، خزاں آناً فاناً بہار، اور لہلہاتے سبزہ زار دیکھتے ہی دیکھتے اوجاڑ ہو گئے مگر نہ بدلی حالت تو حسن بدنصیب کی، جسکو دن مصیبت اور رات پہاڑ تھی، دیوانوں کی طرح پھرنا سودائیوں کی طرح رہنا، ہرچند کوشش کرتا کہ کسیطرح چھٹکارا ہو مگر ضمیرہ کا خیال ایسا ہاتھ دھوکر پیچھے پڑا کہ مردوں کی سی صورت بنادی، کھانے کا ہوش اُسے نہ تھا۔ پہننے کی سدھ اُسے نہ تھی، لوگوں کے کہنے سننے سے برائے نام دسترخوان پر بیٹھتا۔ نوالہ منہ میں لیا اور درد فراق نے چٹکیاں لینی شروع کیں ۔

ایک رات چودھویں رات کا چاند نیلگوں آسمان پر اٹھکھیلیاں کر رہا تھا اور بادل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آگے پیچھے بساط فلک پر دوڑ رہے تھے رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اور حسن اپنے خیالات میں منہمک خاموش پڑا اپنے اوس وقت پر غور کر رہا تھا جب ضمیرہ اور وہ شام کے وقت املی کے درخت کے نیچے بیٹھکر کھیلا کرتے تھے لڑائیاں ہوتی تھیں مار کٹائی ہوتی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد یہ کدورت میل ملاپ سے بدل جاتی تھی دفعتہً اسکو اس واقعہ کا خیال آیا جب وہ ضمیرہ کے لیے گڑیا کا گھر بنا رہا تھا اور بنتی کے خراب ہو جانے سے ضمیرہ بگڑ گئی کچھ دیر تک دونوں میں بات چیت موقوف رہی مگر تھوڑی دیر بعد ضمیرہ کو خود ہی کہنا پڑا اچھا تو دوسرا ٹکڑا چپکا دو ۔

یہ یاد ایک نشتر تھا جو حسن کے کلیجہ میں چبھ گیا وہ بیتابانہ آسمان کیطرف دیکھکر چیخ اوٹھا "اُسے کمبخت آسمان تب کا بدلہ لیا۔"

(باقی)   راشد الخیری

غزل

تصنیف جناب نواب حافظ سید محمد زکریا خانصاحب مرحوم رضوی دہلوی المتخلص بہ ذکی
نبیرہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خانصاحب بہادر معظم جنگ المتخلص بہ سرور۔

دکھاؤں سوزشِ وحشت کی کیفیت زمانے کو — چمن سے دشت کو جاؤں جلا کر آشیانے کو
کہاں سے آئے دل اس نازِ بیجا کے اٹھانے کو — کہ وہ بے وجہ روٹھیں جمع ہوں دشمن منانے کو
یہیں مل جاؤں گا میں خاک میں نقشِ قدم ہو کر — نہ چھوڑا ہے نہ چھوڑوں گا تمہارے آستانے کو
نہ ہوگی اس سے زلفِ خم بخم کی اسقدر تزئین — دلِ صد چاک پر ترجیح کیوں دیتے ہو شانے کو
جگر سے لیکے طفلِ اشک نے دل تک کیا خالی — ملایا خاک میں اس بے سر و پا نے گھرانے کو
وہ صورت خوش گلو اور یہ صدائے جانگزا دل کی — ملاتے ہو مرے نالے سے بلبل کے ترانے کو
دلِ مضطر کو تسکین دو نگاہِ قہر کر لینا — لگانا تیر بھی قائم تو ہونے دو نشانے کو
یہ اربابِ طلب کیا بیخبر ہیں ذوقِ وحشت سے — معاذ اللہ بیگانہ سمجھتے ہیں یگانے کو
رہینگی یہ چمن آرائیاں جلوہ نما برسوں — بہارِ بیخزاں سمجھو مرے رنگیں فسانے کو
نہیں تسبیحِ نامِ یار سہل اے زاہدِ ناداں — کہ سو سو عقدۂ دل پیش ہیں اک ایک دانے کو
فراغِ دل نشاطِ عمر ہم جنسوں کی صحبت ہے — جنوں میں غم شادی جانتا ہوں قید خانے کو
جہاں کو گلشنِ تازہ بنایا میرے جلوہ نے — تری خو نے بدل جانے کی رنگت دی زمانے کو
ادائے شوخ جب دل چھین کر آزردہ کرتی ہے — نگاہِ صلح جو اٹھتی ہے عاشق کے منانے کو
یہ ہوگا دستِ بیدادِ خزاں سے پائمال آخر — عبث گل کیوں لیے پھرتا ہے سر پر آشیانے کو
وفورِ کاوشِ غم کیلئے آنکھیں بھی لازم ہیں — بنائے ہیں یہ دونو چشمے خونِ دل بہانے کو

خجالت سے ذکی ہو سرنگوں تا بازوئے رحمت
مکافاتِ عمل سے باز رکھے تازیانے کو

"تعلیم و قومیت"

ہندوستان میں آجکل ہر فرد بشر کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہے کہ قومی ترقی کے لیے تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے اور مسلمانوں میں خصوصاً اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمان جو اپنے دیگر ہم وطنوں سے بلحاظ تعلیم کے پیچھے ہیں اُنکو ابھار کر ہم پلہ کیا جائے لیکن بیشتر اسکے کہ ہم مسلمانوں کو تعلیم کیطرف رجوع کریں ہمکو تعلیم کے معنی معلوم کرنے لازمی ہیں اور ساتھ ہی ہمکو یہ بھی فیصلہ کرنا ہے کہ اُنکو کس قسم کی تعلیم دینی چاہیئے تاکہ وہ مقاصد جن کے لیئے تعلیم محض ایک وسیلہ ہے خاطر خواہ حاصل ہوں۔ مجھکو اس مضمون میں جیساکہ عنوان سے ظاہر ہے صنعت و حرفت کی تعلیم سے بحث کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ اس تعلیم سے مدعا ہے جو اہل اسلام میں قومیت کی روح پھونکے۔ فی زماننا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص تعلیم یافتہ ہے تو عموماً اُس سے یہ مُراد لی جاتی ہے کہ وہ انگریزی پڑھا ہوا ہے چنانچہ "موجودہ تعلیم" کے معنی ہی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ وہ سکولوں یا کولجوں کی تعلیم ہے اور ایک حد تک موجودہ تعلیم اور انگریزی تعلیم مُترادف ہیں یہاں سرسری طور پر یہ بھی بتلا دینا ضروری ہے کہ اس جدید طریقہ تعلیم کی شروعات ہندوستان میں کیونکر ہوئی۔ سنہ ۱۸۱۶ء میں بمقام کلکتہ راجہ رام موہن رائے اور سر ای ہائیڈ ایسٹ کی کوششوں سے ہندو کولج قایم ہوا۔ یہ ہندوستان میں پہلا مدرسہ تھا جس میں فرنگی علوم مثل طبعیات اصول ادب وغیرہ کی تعلیم شروع ہوئی اسکی بعد سنہ ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل کے حکم سے ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے مقاصد یہ تھے "وقتاً فوقتاً گورنمنٹ کو ایسی تجویزیں بتائے جس سے ہندوستانیوں کی تعلیمی حالت میں ترقی ہو اور ایسے علوم مفیدہ کی اشاعت کے لیئے جس میں فرنگی علوم و فنون شامل ہیں مشورہ دے۔ نیز اہل ہند کی

اخلاقی تعلیم کے طریقے وضع کرے۔" دس سال تک اس کمیٹی کی توجہ کلکتہ کے عربی اور بنارس کے سنسکرت کو لج کی ترقی کیطرف مبذول رہی اور علاوہ ان دو مدرسوں کے ۱۸۲۴ء میں کلکتہ میں اس کے زیر نگرانی ایک سنسکرت کو لج کھولا گیا اور ایک سال کولج مذکور کی افتتاح کے بعد دہلی میں ایک کولج قایم ہوا جسمیں عربی فارسی۔ اور سنسکرت پڑھائی جاتی تہی مگر ۱۸۳۴ء میں اس کمیٹی کے ممبروں میں ایک ایسا اختلاف رائے پیدا ہوا جس کی وجہ سے کمیٹی کو اپنا کام بند کرنا پڑا اس سے ممبران دونوں فریقوں میں منقسم ہو گئے ایک مستشرقین کہلاتا ہے اور دوسرا مجددین۔ گروہ اول کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو فقط عربی فارسی۔ اور سنسکرت کی تعلیم دیجائے اور طریقہ تعلیم جیسا کہ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے اُسی اصول پر قایم رہے نیز ان زبانوں میں جو مفید کتابیں ہیں ان کے طبع کرانے میں گورنمنٹ فراخ حوصلگی سے روپیہ خرچ کرے برخلاف اس کے فریق ثانی اس بات پر زور دیتا تھا کہ ہندوستان کے مدارس میں انگریزی اور ہندوستانی زبانیں معہ دیگر علوم مفیدہ کے پڑھائی جائیں اور پرانے طریقہ تعلیم کی بجائے انگریزی طریقہ پر سلسلہ تعلیم جاری ہو۔ مزید براں عربی اور سنسکرت کے طالب علموں کی مطلق ضرورت نہیں۔

چونکہ ان دونوں فریقوں کے ممبروں کی تعداد برابر تھی اس لیئے جب گورنمنٹ نے کمیٹی سے درخواست کی کہ آگرہ کولج کے لیے ایک نصاب تعلیم تیار کرے تو کمیٹی نصاب پر باہم متفق نہو سکی۔ اس کے تہوڑے دن بعد میکولے ہندوستان آنے پر اس کمیٹی کا صدر بنایا گیا اور اس نے دوسری فروری ۱۸۳۵ء کو اس کمیٹی کی کارروائی پر ایک نہایت بسیط مضمون لکھکر بحیثیت لیجسلیٹو ممبر ہونے کے لارڈ بنٹنگ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کیا اور

لارڈ بنٹنگ نے اُس مضمون کی عام فہم صداقت سے مؤثر ہوکر انگریزی زبان
کے حق میں فیصلہ کر دیا چنانچہ اُس وقت سے اب تک سرکار انگریزی کی تعلیمی
مصلحت انہی اصول کی پابندی ہے جو لارڈ میکولے نے اپنے فاضلانہ
مضمون میں بالتفصیل بیان کئے ہیں۔ اس پچھتر برس کے عرصے میں اس
طریقۂ تعلیم نے جو ترقی کی اور جو اسکا اثر اہل ہند کی اخلاقی حالت پر ہوا
وہ ظاہر ہے اس میں شک نہیں کہ اس سے ایسے بُرے نتائج بھی نکلے ہیں کہ
وہ تعلیم کے نام پر دھبا لگاتے ہیں مگر ساتھ ہی ہم کو وہ فوائد فراموش کرنے نہ
چاہییں جو اسکا خاطر خواہ نتیجہ ہیں ہر ایک مسئلہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آجکل
کے نوجوان کالجوں اور سکولوں سے نکلکر صرف اس کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ اُنکو کوئی سرکاری نوکری مل جائے تو
ہمکو افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ انکی تعلیم کا نقص ہے کیونکہ دس پندرہ سال انگریزی وضع کے مدرسوں میں ضائع
کر کے وہ اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی آبائی پیشہ میں مہارت پیدا کریں اور وہاں کی تعلیم اگر اون کو کسی قابل
بناتی ہے تو وہ یہی کہ کسی دفتر میں ملازم ہوں یا کسی مدرسے میں پڑھانے کی
نوکری کریں۔ لیکن جب اِس تعلیم کے دوسرے پہلو پر نظر کرتے ہیں تو یہ بھی صاف
پایا جاتا ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اُس طالب علم سے جو اپنی عمر کا بہت
سا حصّہ پُرانے طرز کے مطابق عربی و فارسی سیکھنے میں گزارتا ہے بدرجہا
بہتر ہے کیونکہ اُس میں کم از کم موجودہ زمانے کی رفتار سے واقفیت پیدا
پیدا کرنے کی قابلیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور اپنی قوم کی طرف سے
اگر بہت نہیں تو تھوڑا سہی مگر یہ خیال تو پیدا ہو جاتا ہے کہ اسکی حالت
زبوں ہے اور اس لیے وہ ترقی کے ذرائع سوچنے میں تھوڑا بہت وقت
ضرور دیتا ہے برخلاف اس کے ایک پُرانی لکیر کا فقیر جہاں تک دیکھا گیا
ہے اپنے سرور علم میں کچھ ایسا سرشار ہوتا ہے کہ دنیا ہیچ نظر آتی ہے

اور اسکو ہر ایک نئی بات بدعت معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ قوم کے ذرائعہ ترقی سوچنے تو کبھی مُوقع بہ موقع علوم موجودہ کی جہالت کی وجہ سے راہ سلامتی میں مشکلیں کھڑی کر دیتا ہے۔ اِس لیئے ہمکو قومی بہتری کے لیے اگر قدیم طریقہ ناموزوں معلوم ہوتا ہے تو جدید طرز تعلیم میں بھی بہت سے ایسے نقص دکھائی دیتے ہیں جو قوم کے حق میں نہایت ضرر رساں ہیں۔ یہ واضح ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے نہ یہ مراد ہے کہ ہم انگریزی لکھنے پڑھنے میں انگریزوں کی برابری کرنے لگیں اور نہ اُس سے یہ مقصد ہے کہ ہم عربی وفارسی میں دیوان متنبی یا مقامات ظہوری کے فاضل ہوں۔ قومی تعلیم کے میرے خیال میں یہ معنی ہیں کہ خواہ ہم کو انگریزی یا عربی آتی ہو یا نہیں مگر ہم میں اتنی قابلیت ضرور ہو کہ اپنی مادری زبان اچھی طرح لکھ پڑھ سکیں اور ہمارے میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ اپنی قوم کے بُرے بھلے کو دیکھ سکیں اور اپنے پیشے کے متعلق ضروری واقفیت رکھتے ہوں۔ قوم کو بحیثیت قوم کے اس عام تعلیم کی ضرورت ہے یہ اور بات ہے کہ قوم کے بہت سے آدمی ایم۔ اے بی۔ اے۔ ہوں یا مولوی فاضل اور عالم ہوں مگر قوم کے ہر فرد کو جس تعلیم کی ضرورت ہے وہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی خواہ وہ لازمی طریقہ سے اُنکو دیجائے اور خواہ کسی اور طرح پر۔ انگریزی تعلیمیافتہ اشخاص کا یہ ایک فقط اخلاقی نہیں بلکہ قومی فرض ہے کہ وہ انگریزی زبان سے مفید مفید کتابیں اپنی مادری زبان میں یعنی ہندوستانی میں ترجمہ کریں تاکہ آیندہ نسلوں کو ایک غیر زبان سیکھنے میں جو محنت اور اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے اسکی کفایت ہو۔ اور وہ وہی محنت اور وقت کسی اور مفید مطلب کام میں دے سکیں اگر ایک موجودہ انگریزی کالج کے

نصاب میں سے انگریزی زبان کو مضامین لازمی میں سے نکال کر عربی و فارسی کا درجہ دے دیا جائے اور دیگر مضامین مثلاً علوم طبیعات۔ ریاضی فلسفہ وغیرہ اُردو میں سکھائے جاتیں تو ایک معمولی درجہ کے طالب علم کو بی۔ اے کی لیاقت حاصل کرنے کے لیے اُس سے ایک چوتھائی مدت صرف کرنی ہوگی جو اس وقت اُس کو دینی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ لوگ جن کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہو تاکہ قوم کو فائدہ پہونچا سکیں اُن کو اس زبان کے حصول کے لیے زیادہ آسانی ہو جائے گی۔

"رؤف" (از لندن)

اطلاع

سوا "تمدّن" کے میں اور کسی نئے رسالے کی جانب متوجہ ہو کر اپنے خیال کو تقسیم نہیں کر سکتا، اور سوا "تمدّن" کے سرپرستی میں اپنے دماغ پر کسی رسالے کا حق نہیں تسلیم کرتا ہوں،

میرے مضامین نظم یا نثر میں جو کچھ تھے، سب میں "تمدّن" کو دے چکا اس سبب سے کسی دوسرے رسالے کی خدمت ان دنوں مجھ سے ممکن نہیں ہے، مجھے اُمید ہے کہ بغیر میری اجازت کے کوئی صاحب مجھے اپنا نیا رسالہ نہ بھیجیں ورنہ میں اون کے نقصان کا ذمہ وار نہ ہونگا،

معافی کا طالب

احمد علی، شوق، قدوائی

از مقام بھوپال

عصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ کنوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُنکو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُرلطف و باطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں۔

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہی عصمت اُنکو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے عقل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں۔ اُن کی ذمہ داریاں اُنپر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جنسے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کیساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی قیمت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ۴۸ یا ۶۴ صفحہ کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں سالانہ قیمت (۲ روپے)

مینجر عصمت و تمدن۔ دہلی

جلد ۲ جولائی سنہ ۱۹۱۱ء نمبر (۱)

بابت

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا
مخزن

ایڈیٹر = شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت سالانہ قسم اول ۳ روپے قسم دوم ۲ روپے تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹ھ قیمت فی پرچہ (۴ آنہ)
کتبہ حقیر ابوظفر حامد میرزادہ

تمدّن

یہ ۳۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہوکر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہے۔

تمدّن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالٹکس سے علیحدہ ہو اس وجہ سے ہرگز رد نہیں ہوسکتا کہ **تمدن** اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدّن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خوانین کے مطالعہ سے گذر سکیں +

تمدّن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دویم باتصویر شائع ہوگا **قیمت** قسم اوّل (عہ) قسم دوم (عہ) نمونہ کا پرچہ (۴؍)

در شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا:-

مولوی ابوالنعیم سید تصدیق احمد صاحب۔ شاہ گنج۔ مولوی نور احمد صاحب شاہ گنج۔ مولوی لطیف الدین صاحب بمبئی۔ مولوی محمد اسد مرزا صاحب دہلوی۔ شاہ گنج۔ مولوی سید ابوالعاص صاحب بانکی پور۔ مولوی جواد علی خانصاحب عالی دکن۔ مولوی ابو حامد سید محمد مہدوی صاحب دکن۔ منشی لیاقت علی صاحب کمالپور۔ منشی سید حامد حسین صاحب مظفر نگر۔ منشی مختار احمد صاحب مظفر نگر۔ سید شوکت صاحب دہلوی۔ نواب نظیری بیگم صاحب کلکتہ۔ منشی محمد حسین خانصاحب منتر انوالی۔



دربار اکبر ثانی

تمدّن
دہلی

تمدّن اسلام

نمبر (۳)

مُغل | اون خوش نصیب قوموں مین جنھیں افعال شنیعہ اور خفیف الحرکتیاں میں صدیاں گذریں تہیں۔ مگر زمانہ نے اون کا راز طشت از بام نہیں کیا۔ ایک مغلوں کی قوم بھی ہے۔ جو سائبیریا کے جنوبی میدانوں میں اپنی وحشیانہ کارگذاریوں کا جال پھیلائے خونخوار اور لاگو درندوں کی طرح بے حساب انسانی زندگیوں کا خون کر رہے تہے۔ اور ہر ایک بدنامی یا دار وگیر سے بری الذمہ تھے۔ کیونکہ اُن کے افعال سے نہ کوئی شخص بجز اُن بیگناہ مقتولوں کے واقف تھا جو کبھی کبھار اُن بیہڑ راستوں سے ہو گذرتے تہے جہاں اُن کا عمل و دخل تھا۔ اور نہ وہاں کوئی زبردست قوت اُن پر حاوی تہی جو اُن کے کرتوتوں کی اُنہیں سزا دیتی۔

غرضکہ نہایت اطمینان اور زمانہ کی آنکھوں سے بالکل اوٹ ہو کر وہ اپنے رنگ میں

اپنی زندگی کو نہایت خوشگوار طریقوں سے بسر کر رہے تھے کہ اونکی آنکھوں نے ایک عجیب و دلکش نظارہ کا مشاہدہ کیا۔ جس کے مشاہدہ میں اُنہوں نے اپنی طرز زندگی سے زیادہ مسرت بخش خوشی کا احساس کیا۔

یہ نظارہ مسلمانوں کے فتح و اقبال کا تھا جو جزیرۂ عرب سے داب کشورکشائی کے ساتھ نکلے تھے اور جو سرزمین ترکستان میں اپنی فاتحانہ عظمت کا نشان گاڑ چکے تھے +

چونکہ مسلمانوں کو ہر کمال اور ہر وصف میں اونہوں نے یکتائے روزگار پایا۔ اس لیے مسلمانوں کی ہر ادا اُن کے دل میں گھر کرتی اور اونکی نگاہوں پر بیٹھتی جاتی تھی۔ کسب اور فنون میں اون کا انہماک۔ ذوق کمال اون کی جفاکشی۔ اون کا اقبال اون کی دولت۔ جاہ و مکنت۔ اقتدار طاقت اور باہمی الفت و محبت۔ غرضکہ اُن کی ہر بات میں متجسس نظروں نے شان دلکشی پائی جس کی اون کے ستم پیشہ دل و دماغ پر قبضہ و فتح حاصل ہوتی جاتی تھی۔ جسکا اثر یہ ہوا۔ کہ اُنہوں نے مسلمانوں کی ادائیں سیکھیں۔ اون کے نقش قدم پر چلے اور بالآخر اس تقلید اور تتبع کا پھل اونہیں یہ ملا کہ اُن مغلوں کی جو ایک گمنام اور بادیہ نشین قوم تھی دنیا میں سلطنت قایم ہوئی۔ جس کے بعد کئی صدیوں تک اون کا دور حکومت رہا۔ اور جس کے زیر سایہ اکثر زبردست اور عظیم الشان سلطنتیں مثل اقطائی۔ طلوئی۔ جوجی۔ چغتائی۔ تھیں۔ اس کے علاوہ زنگار سائبیریا۔ اور ترکستان میں متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بھی اونکی قایم ہوئیں +

جب فتح و اقبال کا سہرہ زمانہ نے اُن کے سر باندھا۔ تو اونکو یہ بھی

حوصلہ دیا کہ جن اقالیم پر اہل عرب سکّہ زن ہیں وہاں مغلوں کا سکہ رواں ہو۔ چنانچہ یاوری اقبال سے اونہوں نے یہ ارادہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس منصوبہ کو یوں پورا کر دکھایا کہ نسل تاتار کے مشہور و معروف سردار چنگیز خاں کے سرگروہی میں مسلمانوں پر فوجکشی کی جس سے سلطنت اسلام کا ایک حصہ ان کے قبضہ میں آگیا۔

اسلام کی اوس خصوصیت نے جسکا منشا یہ ہے کہ جو قومیں علم و تہذیب کے اثر سے ہمیشہ بے بہرہ رہیں۔ اسلام نے جاتے ہی اون کے تمام حالات میں انقلاب برپا کر دکھایا۔ یہاں بھی جلوہ افگن ہوئی۔ جبتک مغل اسلام نہ لائے تھے تہذیب و روشنی کا چلن انہیں نہ تھا۔ لیکن جب وہ اسلام کے بابرکت حلقہ میں آنے لگے۔ تو تہذیب اور علم کی روشنی وہی اون میں آنے لگی جو اسلام کا خاصہ ہے۔

اس روشنی کے زمانہ میں بڑے بڑے علما، حکما، مدبر، پالٹیشن انہیں پیدا ہوئے شاندار مساجد۔ مدارس۔ اجرام فلکی کا راز بتانے والی رصد گاہیں۔ انہوں نے بنوائیں۔ شہر بسائے جنہیں فلک نما قصور۔ باغ بہشت کے نمونے پر طیار کرائے۔ اور جملہ سامان ترقی مہیّا کیئے +

غرضکہ اعلیٰ تمدّن کے زمانہ میں جو جو ترقیاں ملک میں ہوتی ہیں اون سے انکا عہد آراستہ و پیراستہ ہوا۔ جس کی یاد دلانے کے لیے گلزار تاریخ کے سجے سجائے تختہ ہائے گل موجود ہیں۔ اور سیر کے لیے محض مطالعہ کی عینک درکار ہے۔

بَربَری | شمالی افریقہ کے بادیہ نشین یا بدو۔ جو بربر کہلاتے ہیں جبتک اسلام نہیں لائے تھے وشں پرست وحشی۔ اور اہل بادیہ تھے انسانی

گروہ کے میل ملاپ اور آباد مقامات سے دور دور بھاگتے تھے۔ اہل یونان و روما کو ان کی سفاکی اور بیدردی کی بدولت بڑے بڑے مصائب اور نقصانات برداشت کرنے پڑے مگر اون کا انسداد امکان سے باہر ہی رہا۔

عربوں سے بھی اُن کی فتوحات کے زمانہ میں اون کی جرات جانبازی نے یہ تسلیم کرالیا تھا۔ کہ ان کا زیر کرنا کوئی منہ کا نوالا نہیں۔اور پھر عرب ہی ایسے تھے۔ جنھوں نے اُن کی مشکیں باندہ کر اُن کی رگیں ڈھیلی کیں لیکن جب وہ اسلام لائے۔تو اون کی وہ قوتیں جو امن عامہ میں خلل انداز اور فسادات کی جڑ تہیں جن سے زیان مال کا خطرہ تو ایک طرف خود انسانی زندگی معرض خطر میں تہی۔ انہیں فسادات کی رُوک تہام میں صرف ہوئیں۔قبل از اسلام اگر ان کی جلادت سے بیگناہوں کا قتل ہوتا تھا۔ اور اُن کا مال غارت، تو بعد اسلام لانے کے امن کے پہیلانے اور ان مظالم کے فرو کرنے کا کام انہیں سے لیا گیا پہلے اُن کی وہ قوتیں جو رہزنی اور قطاع الطریقی کے رکیک افعال میں صرف ہوتی تہیں وہ بعد اسلام لانے کے شرعی اور سیاسی جنگوں میں صرف ہونے لگیں جن کے حاکم و آمر عقل وعدالت تہی۔

چنانچہ بربریوں تمام فتوحات اور خصوصاً مغربی بلاد و امصار کی فتح و تسخیر میں انکی شرکت ایک زبردست کمان کے ہم پلہ رہی ٭

دول فاطمیہ مرورینہ اور ادریسیہ کی بقا اور استقلال کو اُن کی قوتوں نے بہت کچھہ اہمیت دی تہین۔ مُرابطین اور موحدین وغیرہ حکومتوں کے بانی بہی یہی ہیں ٭

طارق ابن زیاد انہیں کی شجاعت و اصالت پر بہروسہ کرتا ہوا فتح

اُندلس کو روانہ ہو فنون سپہگری کے سوا تمدّن اور شایستگی کے مدارج میں بھی اِس قوم سے نے درجہ حاصل کیا ہے۔

قوم زنگی | گو آج زمانہ کی رفتار ایسے انکشافات کی اٹھکھیلیوں سے بھری ہے جس نے اُن مسائل کی پردہ دری اور تکذیب میں جو سلف سے بطور مسلمات چلے آتے تھے۔ کوئی دقیقہ اوٹھا نہیں رکھا۔ مگر یہ مسئلہ جسطرح سلف کے مسلمات سے تھا۔ ویسا ہی آج بھی قابلِ تسلیم ہے کہ قوم زنگی دنیا کی تمام قوموں میں مدارج انسانیت کے لحاظ سے پست، اور اخلاقی اعتبار سے بدترین نسل آدم ہے باوجود نفوسِ انسانی میں اُن کا شمار ہونے کے بھیڑ اور بکری کی طرح اُنکی خرید و فروخت کی گئی۔ مگر وہ اپنی فطری اور جبلی ذلت کی وجہ سے ہمیشہ قانع اور راضی برضا ثابت ہوئے اون کی اِس فطرت پر زمانہ کی ترقی کا کوئی رنگ نہ آیا نہ گیا +

اس قوم کا اصلی مولد و مسکن تو شمال افریقہ ہے مگر افریقہ کے شرقی اور غربی مقامات میں بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب عساکر عرب ربع مسکون کو کھنگال رہے تھے تو کسی ریلے میں اِن کے چند قبائل ان مقامات سے وسط افریقہ اور سواحل کی طرف جا پڑے۔ جو بعد کو مثل شمالی افریقہ کے ان کا مولد و مسکن بن گئے۔

اِن قبائل کے جلاوطن اور حملہ آور عربوں سے اُن کا تصادم اُن کی اخلاقی اور علمی نشو و نما کے لیے ایک خوش آیند فال تھی۔ کیونکہ عربوں کے دیکھا دیکھی اپنے طرزِ عمل کی درستی کا انہیں احساس ہوا جس کا اثر اون کی درستی اخلاق پر بھی پڑا پھر رفتہ رفتہ اونہیں اسکا ایسا چسکا پڑا کہ کسب فضائل کر کے وہ دوسرے متمدّن قوموں کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ وہ عربوں کے اثر سے اسلام لائے۔ اِس کے

بعد اُنہوں نے عرب مجاہدین کے قوت بازو بنکر خلفاء اور سلاطین کے اشاروں پر زبردست لڑائیوں میں اکثر جوہر شجاعت دکھلائے انمیں ایسے بھی مرد آدمی ہوئے کہ مرحلہ دیانت و وفاداری میں ان کے غیر معمولی تدین اور غیر عادی پائے ثبات سے متاثر ہو کر بعض خلفا نے انہیں اپنی خانگی زندگیوں کا شریک بنایا۔ اُنہوں نے بسا اوقات دربارِ خلافت میں اپنا یہہ اعتبار بھی پیدا کر دکھایا ہے کہ حل و عقد سلطنت اور عزل و نصب اون کے اقتداری آمد ہو گئے۔

بیا ایسے اولوالعزم اور عالی خیال بہی ہوئے کہ اکثر اون کے سروں میں یہہ سودا بھی سمایا کہ وہ حاکم علے الاطلاق بنکر رہیں چنانچہ دوسری مہذب قوموں کی طرح اونہوں نے بھی برابر کی سلطنتوں سے مقابلہ اور اونکو بادشاہ منوانے کے لیے آراستہ لشکر و باقاعدہ فوجیں طیار کیں۔ اور مدتوں مصروف پیکار رہے سلطنت عباسیہ کو سالہائے سال تک ان کے ان جوشیلے ارادوں کی وجہ سے چین لینا نہیں نصیب ہوا اِن کی گو کوئی بڑی سلطنت تو قایم نہیں ہوئی لیکن متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتیں وسط اور غربی افریقہ میں قایم ہوتی رہیں۔

دماغی صلاحیت کے لحاظ سے اونمیں دقیقہ رس لور نازک دماغ مدبرین سیاست اور عدالت بھی ہوئے جن کے نام دنیا میں شہرت نصیب بہی ہیں۔

کافور الاخشیدی ان میں ایک نامور شخص ہو گذرا ہے جس کے متعلق حکومت مصر تھی اِس صلاحیت اور ترقی نے اونہیں امور معاملہ سے فنون لطیفہ کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ اکثر داد شعر دینے والے نازک خیال شعرا بھی اس طبقہ سے نکلے جنہوں نے اپنے قصیدہ خوانیوں سے صلہ و انعام میں خزانے حاصل کیے اور جن کی غزلخوانیوں سے محفلیں کی محفلیں جھوم اٹھیں فقہا اور قرا کی جماعتیں بھی انہیں سے نکلیں۔

غرضکہ یہ سب جوہر اونمیں کب آئے۔ جب وہ مسلمانوں سے ۔۔ اسلام سے اور اُن کے اثر سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ۱۶ ای باد صبا این ہمہ آوردہ تست باقی۔ رقم خانخانی ندوی

زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ

(۱)

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذار یاد آیا۔
مگر جب یاد آ ہی گیا، تو چل، اے دل چل۔ لیکن دھیرے
دھیرے چل رے دوانے، دھیرے دھیرے چل

ایسی بیتابی کی کیا ضرورت ہے، مانا کہ تجھے اسیر کرنے کے لیئے احباب، اعزا، فرائض و علائق سب جال پھیلائے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں پہونچنے کے لیئے ایک جست کی ضرورت ہے۔ مگر مجھے بھی تو ساتھ بیچتا ہے

وطن سے یہ دوسری مرتبہ ہے کہ میں باہر جاتا ہوں! اور دونوں مرتبہ میرے ساتھ "ظلم" کیا گیا۔ میں اُس محبت کے برتاؤ کو ظلم ہی سے تعبیر کرتا ہوں۔ جانے والے کے دل کو الفت اور مہماں نوازی سے لبھا لینا، اُس پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ملک سے باہر جا کر اسے یاد کر کر کے تڑپتا ہے۔ بمبئی میں، اپنے کلاس فیلو "ڈاکٹر" سید محمد دجن کی بے ریا، پر صداقت مہماں نوازی کے عوض میں میں صرف "تھینک یو، ڈاکٹر" کہہ سکتا ہوں) اور اُس ہیکل اخلاق و تواضع ہز ہائی نس نواب جنجرہ جو تواضع ز گردن فرازاں نگوست کی زندہ تصویر ہے، اور مس عطیہ فیضی اور اون کے

خاندان کے التفات و توجہات کے چھاپے دلپر لیے ہوئے جہاز پر سوار ہوا۔ یہ چھاپے اب تک ویسے ہی گہرے ہیں اور رہیں گے۔

جہاز نے لنگر اُٹھایا، اور میں گھنٹوں تک یہ شعر پڑھتا رہا ؎

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں

بلادِ عثمانی کی طرف یہ میرا دوسرا سفر ہے۔

کوئی صاحب، ان اوراق میں مصر اور استنبول کے متعلق "معاشرتی، ادبی، سیاسی و نمیدانم چہ وچہ حالات" کے جویا نہوں۔ نہ میں وہ غائر نظر رکھتا ہوں کہ ان حالات کی تدقیق کر سکوں، نہ نفوذ رکھتا ہوں، نہ علم رکھتا ہوں۔ ان حالات کے لیے لائق اور قابل حضرات کے سفرنامے ملاحظہ ہوں۔ اُن سے آپکو بتفصیل معلوم ہوگا کہ خسنرینہ ہمالوں موزہ خانہ ہمالوں میں کیا کیا چیزیں رکھی ہیں، اور کس ترتیب سے رکھی ہیں۔ مکاتبِ عالیہ، در شدیہ، و اعدادیہ کی تعداد کیا ہے۔

ان اوراق میں اک وارفتۂ محبت کے ہزیانات ہیں اور میں تو صرف یہ کہتا ہوں:-

جو آج جائزہ لیتا ہے جاں نثار دل کا
لبیک! لبیک!! لبیک!!!
ہمارا نام بھی لیکر پکار ہم بھی ہیں۔
لبیک! لبیک!! لبیک!!!

سمندر پر لطف تھا۔ یہ لوٹتے وقت کا ذکر نہیں ہے۔ اور جہاز کی سوسائٹی بھی پر لطف، راستے میں صرف عدن کو، (جہاں باوجود میرے پاس دوربین

اور فوی عینک ہونے کے، مجھے "باغ" نظر نہیں آیا) دور ہی سے سلام کرتے ہوئے دسواں دن تھا کہ "ہم ارض فراعنہ" کے سامنے پہونچے یہاں پہلی چیز جس نے ہماری نظر اپنی طرف کھینچی وہ اُس شخص کا بت تھا جس نے گو دعویٰ خدائی نہیں کیا، لیکن نیچر کے کاموں میں عظیم الشان تبدیلی کردی دو بر اعظم جدا کر دیے دو سمندر ملا دیے۔ موسیو لیسیپ! یہ کامران فرہاد جوئے سیز نکال کے، اپنا آسمان کے تلے نام کر گیا۔ جوئے شیر لانیکا کام عشاق کے لیے اب بھی باقی ہے۔ ہمارا جہاز دن بھر، نہر سوئز میں چلا گیا۔ نہر سوئز کے کنارے پر بہت دور تک ریلوے لائن اس قدر قریب ہے کہ جہاز سے دکھائی دیتی ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا، مجھے اسلامی ملک میں ریل! دیکھنے کا شوق اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ میں کئی گھنٹے متواتر جہاز کے ڈیک پر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کوئی ٹرین گذرے۔ یہ اژدر آہنین، جسنے دنیا میں ایسے ایسے تغیرات پیدا کر دیے ہیں، اسلامی ملک میں کس شکل اور کس وضعیت کا ہوگا۔ ادرا دفعہ اُسے اپنی دہماکے کی چال سے، اس زمین پر چلتے ہوئے تو دیکھ لوں۔ میں نے ساڑھے تین برس بغداد میں گذارے مگر وہاں بغداد ریلوے کی گونج تھی، خود ریلوے ابھی نہ پہونچی تھی۔ سو یہ حسرت مصر میں جاکر نکلی۔ مگر اتفاق دیکھیے میں جتنی دیر تک ڈیک پر بیٹھا رہا ٹرین نہ گذرنی تھی نہ گذری۔ جوں ہی میں ڈیک سے اتر کے اندر گیا لوگوں نے کہا کہ ٹرین گذر گئی۔ پھر دوسری مرتبہ ڈیک پر جا کر بیٹھا، کھانیکا وقت بھی گذر گیا لیکن ٹرین ندارد۔ جب بھوک نے بہت ستایا، میں کچھ کھانے کے لیے نیچے اترا، اور جھٹ ٹرین صاحب گھڑگھڑاتی ہوئی گذر گئیں۔ ایک صاحب، جن سے میں نے اپنے فراق کا حال بیان کر دیا تھا، مسکراتے

ہوئے آئے اور خبر سنا کے اور مجھے جلا کے چلے گئے - آخر میں پھر تیسری مرتبہ ڈیک پر جا کر بیٹھا۔ اِس مرتبہ اُس محبُوبہ مطلوبہ نے اپنا جمال دخاں افزا مجھے دکھایا۔ اک ترکی ٹوپی ٹرین کو لیے جا رہی تھی ۔ ٹرین چھوٹی پٹری کی ٹرین تھی، اور وہی ہندوستان میں - جزئی اختلاف نظر انداز کر کے میری دیکھی بھالی ٹرینوں سے ملتی ہوئی ۔ مگر میری کیسی حسرت پوری ہوئی! نہر سوئز کے دونوں کنارے، (اور وہ ایک دوسرے سے بہت دور نہیں) کچھ جاذب نظر نہیں۔ دونوں طرف میداں ریگ یا تو دہانے ریگ ہیں اور بس۔ ایک طرف بادیۃ الشام ہے اور ایک طرف ریگستان مصر ریگستان مصر! آپ مصر کی زرخیزی، شادابی، اور چپہ چپہ زمین پر زراعت ہونے کے فسانے سنتے ہیں؛ یہ فسانے صحیح ہیں ۔ مصر نیل کے صدقے میں اِس سرے سے لیکر اوس سرے تک ایک کشت زار ہے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ ہیں اور سر بفلک کشیدہ کھجوروں کے درخت ہیں۔ مگر یہ آپکو آگے چلکر ملیں گے۔ مصر میں ریگستان ہی ہے اور یہ مصر کو نظر بد سے بچانے کے لیے، کاجل کا ٹیکا ہے۔ اور جیسا کوئی کاجل کا ٹیکا، کسی پیارے حسین بچے کو نظر بد سے نہیں بچا سکا، یہ کاجل کا ٹیکا بھی بیکار ہی نکلا۔

ہم آدھی رات کو پورٹ سعید پہونچے۔ پورٹ سعید، زبردست بندرگاہ ہے۔ بہت سے جہاز، موٹر کشتیاں، آجا رہی تھیں اور جہازوں کی سیٹیوں کا تار بندھا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ ان نالہائے نیم شبی کے سبب رہائشی پورٹ سعید کیسے سو سکتے ہوں گے۔ ایک دو گھنٹے بعد، کنارے سے ملے ہوئے ایک ہوٹل میں میرے خراٹے لینے نے بتا دیا کہ یوں!۔ (باقی جب میں جاگوں)

سجاد حیدر (قسطنطنیہ)

محمڈن یونیورسٹی

از مولوی احمد علی صاحب شوق، قدوائی، لکھنوی،

او سوادِ علم، تجھ پر حکمرانی چاہیئے	او حروفِ صفحہ، تم سے نکتہ دانی چاہیئے
او قلم، تو شاخ ہے، تو گل فشانی چاہیئے	او سخن ہے بحر تجھ میں، تو روانی چاہیئے

او صریرِ خامہ تو مطلب ادا کر، بول کر
کہہ دو اتوں سے، کہ کچھ دیکھیں یہ آنکھیں کھول کر

جہل کے بڑھنے سے عزت قوم کی کتنی گھٹی،	جتنی یہ آگے بڑھی تھی اتنی ہی پیچھے ہٹی
لٹ گئی یہ، دولت اسکی جا کے غیروں میں بٹی	مثل بالوں کے پریشاں ہو گئی، ایسی کٹی

قوم میں، اب تو، فقیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
زر کہاں، کف میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

جہل سے رستا ترقی کا خرد پاتی نہیں	رات اندھیری ہو، تو کوئی شی نظر آتی نہیں
چھپ رہی دولت، ہمیں اب شکل دکھلاتی نہیں	ہم سے شرماتی ہے وہ، غیروں سے شرماتی نہیں

ہم سے کیا مطلب، اگر دنیا میں دھن برسا کرے
ہم ہیں مفلس، ہماری آرزو ترسا کرے

عید کا دن اور بلا نازل ہمارے گھر پہ ہے	عیش کیا آئے، کہ پہرا مفلسی کا در پہ ہے
زر نہیں، اور منحصر بچوں کی زینت زر پہ ہے	پاؤں میں ان کے نہ جوتا ہے، نہ ٹوپی سر پہ ہے

عیش و غم کے واسطے، سامان اب تو ایک ہے
عیدگاہ اور کربلا کی شان، اب تو ایک ہے

ضعف دیکھو، ان یتیموں کا کہ چل سکتے نہیں	خشک پیڑ ان کو سمجھ لو، پھول پھل سکتے نہیں

لیں سنبھالا موت کا، یوں تو سنبھل سکتے نہیں　　جان نکلے، حوصلے لیکن نکل سکتے نہیں

اِن کے مورث، بن کے جاہل، علم سے بے حس رہے
اِن کو ترکے میں ملا افلاس، یہ مفلس رہے

کیا پڑھیں یہ، کیا لکھیں یہ، پائمالِ درد ہیں　　اِن کے جسموں میں نہیں خوں، اِن کے چہرے زرد ہیں
اِن کے نالے گرم ہیں، اور اِن کی آہیں سرد ہیں　　اِن کے اعضا خاک ہیں، اور اِن کی جانیں گرد ہیں

غم میں دل ہے، دل میں غم ہے، کیا کریں، ناچار ہیں
سر میں درد، اور درد میں سر، روتے ہیں، بیمار ہیں

ایں، اِدھر سے آئی، طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا[1] کی صدا　　آ رہی ہے اس گھڑی، اُتّر[2] کی جانب سے ہوا
ہو نہ ہو ہے یہ علیگڈھ کا پیامِ جاں فزا　　ہو نہ ہو، ایماء ہے یونیورسٹی کے قصر کا

ایک ہی آواز کیسی، مچ گئی کالج میں دھوم
هٰهُنَا[3] رَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّ تَعْلِيْمُ[4] الْعُلُوْمُ

اَب تو کالج بول اُٹھا، میرا مقدّر دیکھنا　　آج جو دیکھا ہے، کل اور اِس سے بڑھکر دیکھنا
وہ کھڑا ہے اوج، وہ اقبال، در پر دیکھنا　　چترِ گردوں پھر رہا ہے میرے سر پر دیکھنا

نام اُچھالوں قوم کا، بچّوں کی شان اوج سے
فتح گردوں میں قلم و علم کی اِس فوج سے

باغ سیّد کا جما جب خطّۂ اخلاق پر　　سایۂ علم اِس نے ڈالا، پھیل کر آفاق پر
جڑ ہے مذہب، وہ ہے قائم قدرتِ خلّاق پر　　ثبت ہے "نَصْرٌ[5] مِّنَ اللّٰهِ" اُس کے اوراق پر

اِس کے پودے، قوم کے بچّے ہیں، پھل لائیں گے یہ
آج بوٹے ہیں، ثمر شاخوں میں، کل لائیں گے یہ

یاس کو زک دے سکے، اُمید تیّ ورد ہے　　ہو یہ کالج علم و دولت کا خزانہ، تو یہی
بلکے آغاخان کا رُخ، یہ بات کالج نے کہی　　شارح "لَا تَقْنَطُوْا[6] مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" ہیں یہی

---

[1] خوشی کے ساتھ اس میں داخل ہو۔ [2] ہوا یہاں سے علی گڑھ اُتر کی جانب ہے۔ [3] یہاں فرصت ہے اور قوی خوش ہے۔ [4] اور علوم کی تعلیم ہے۔ [5] مدد ہے خدا کی جانب سے۔ [6] یا امید نہ ہو خدا کی رحمت سے۔

قوم کے ہونٹوں پہ، اِن کی گفتگو کا شور ہے
لَن تنالُوا[51] البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا، کا شور ہے

بے ادب بنکر تمھیں، واقف کروں میں راز سے — تم مِرے آغا خاں ہیں عیسٰی اپنی ہر انداز سے
قوم مُردہ تھی، اِسے زندہ کیا اعجاز سے — جان ڈالی "قُم بِاِذنِ اللّٰہ"[52] کی آواز سے

سایۂ رحمت ہے، سایہ اِن کا ساری قوم پر
آیۂ رحمت[53]، ہوا نازل، ہماری قوم پر

فخر اِس کالج کو ہے، دنیا میں، جس[54] کے نام سے — سو رہا ہے، گوشۂ مسجد میں، وہ آرام سے
جاگ جاگ او سونے والے، خوش ہو اپنے کام سے — علم کا لنگر ہے جاری، تیرے فیضِ عام سے

یہ ترے "مشتاق"[55] ہیں، دیکھ ان کو آنکھیں کھول کر
شہ انہیں نے دی تھی، کالج کی، تجھے اِس بول کر

کیا ہمیں بھولا ہے سیّد، نہیں ممکن نہیں — قوم ہی میں ہوگا دل، گو خود وہ ہے جنّت نشین
یوں کہیگا، کرکے سجدہ، جانبِ عرشِ بریں — شکر تیرا یا الٰہی، تو ہے ربّ العالمین

کالج اَب دنیا میں جنت کا نمونا ہو گیا
جنتیں[56] دو، میں نے پائیں، لطف دونا ہو گیا

اُسکو کالج سے بہت اُلفت تھی تو ہے یہ قیاس — روح اُس کی، پھر رہی ہوگی اسی کے آس پاس
قوم سب مِل کر، کرے اللہ سے، یہ التماس — کر دے سر سیّد کو زندہ، دے کے پھر جسم و جاں

انتظام طولِ عمر، اُس کے لیے کرے گی قوم
اپنی اپنی عمر کا، ایک ایک حصّہ بانٹے گی قوم

---

۵۱ ہرگز نہ پہونچو گے بھلائی کو اگر تم خرچ نہ کروگے۔ ۵۲ اُٹھ کھڑے ہوئے ہو ساتھ حکم خدا کے ۵۳ لفظ آیۂ مذکر ہے۔ ۵۴ سر سیّد احمد خاں مرحوم۔ ۵۵ نواب مولوی محمد مشتاق حسین خاں جو آجکل علیگڈھ محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری ہیں سب سے پہلے اس کالج کے قائم کرنے کے لیے سر سیّد کے ارادے کو انہیں نے قوت دی تھی ۵۶ یعنی ایک جنت اعتقادی جسے اصلی کہنا چاہیئے اور دوسری جنت کالج کی جہاں سیّد کی تربت

شرط یہ ہی، پھر نہ سرسیّد کو مرنے دیں گے ہم — پھر نہ اُسکی عُمر کو، ہرگز، گذرنے دیں گے ہم
پھر نہ آنکھیں پھیرنے، اور بند کرنے دیں گے ہم — پھر نہ اِس کالج کے زینوں سے اُترنے دیں گے ہم

وہ ہمارا خضر ہے، ہستی کے عالم میں رہے
وہ ہمیں رستا بتانے کے لیے ہم میں رہے

دے نہیں سکتی فنا کے بعد فطرت پھر حیات — توبہ! کیا میں کہہ گیا، فانی نہیں سیّد کی ذات
وہ ہی زندہ خلق میں، جب تک ہے باقی کائنات — وہ ہی زندہ قوم میں، جب تک ہے کالج کو ثبات

کالج اُس کا جسم ہے، تعلیم اس کی جان ہے
قوم کے بچوں میں اعضائے بدن کی شان ہے

کس محبت سے مسلماں کر رہے ہیں یاد اُسے — دے رہے ہیں سب دُعائے مغفرت سے داد اُسے
بن کے یونیورسٹی، کالج کرے اب شاد اُسے — دے مسرت سے اُسی کا دل، مبارک باد اُسے

تب تو سوچیگا کہ رضواں سے یہ کہنا چاہیئے
اپنی جنت لے، مجھے، کالج میں رہنا چاہیئے

تربتِ سیّد کو، قدرت نے دیا، کتنا وقار — صاف کرتی ہے ہوا، جاروب کش بنکر غبار
شب کو شبنم، اپنے موتی، اُس پہ کرتی ہی نثار — صبح کو کرنیں چڑھایا کرتی ہیں سونے کے ہار

کیا کشش ہے، آتی ہے، کیا بوئے اُلفت خاک سے
دل مسلمانوں کے لپٹے ہیں، مزارِ پاک سے

یاد ہی، کالج سے "مسٹر بک"[1] کی اُلفت یاد ہی — اُن کی تقریر، اُن کی تحریر، اُن کی محنت یاد ہے
قوم کے "محسن"[2] ہیں یاد، اور اُنکی ہمت یاد ہی — وہ شگفتہ اُن کی پیشانی، وہ صورت یاد ہے

---

[1] مسٹر تھیوڈر بک متوفی جو علی گڑھ محمڈن کالج کے پرنسپل تھے وہ مسلمانوں کے بڑے ہمدرد تھے اور یونیورسٹی کے لیئے انہوں نے بے حد کوششیں کی تھیں [2] نواب محسن الملک مہدی علیخاں مرحوم جو سرسید کے بعد کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے تھے اُن کے عہد میں کالج اور اُس کے سرمایہ نے بہت ترقی کی، ۱۲

پھر رہے ہونگے وہ، جنت میں لبِ خنداں کے ساتھ
آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں کے ساتھ

گو ہے کالج، معدنِ اب بھی بے بہا سامان سے — لوگ، علموں کے جواہر چنتے ہیں اس کان سے
قوم لیکن کہہ رہی ہے، جوش سے، ارمان سے — اور اسے چمکاؤ، یونیورسٹی کی شان سے
ہو بِنا مستحکم ایسی، جو سمک[۱] سے جا ملے
اس قدر چھت کو اچھالو، جو فلک سے جا ملے

چار جانب خوب آغا خاں نے پھیلائی صدا — پہلے چوبائی ہوا تھی اب ہے چوبائی صدا
وہ، اودھ، بنگال، اور پنجاب سے، آئی صدا — وہ، ہوا، بمبے سے اور مدراس سے لائی صدا
دی صدا، ہز ہائنس نے، اُٹھ کے اس انداز سے
ہند گونجا، اَسْرِفُوْا[۲] لِلْقَوْم کی آواز سے

ناپتی پھرتی ہے چندے کے لیے، قوم اب زمیں — رحم کر ہم پر خدایا، اَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْن
بعض زر کے جمع ہونے کا نہیں کرتے یقیں — کہہ اُٹھیں شاید، کہ فَأْتُوْنَا[۳] بِسُلْطَانٍ مُّبِيْن
سوچ تھا، ہم دینگے، سلطانِ مبین کا کیا جواب
لفظ "سلطان" سے، مگر، خود ہی ہوا پیدا جواب

بول اٹھیں، ہر ہائنس نواب سلطان[۴] جہاں — مجھ سے ہمت لے، قدم آگے بڑھا، اے قوم، ہاں
در خزانے کا کھلا، جس دم کھلا قفلِ دہاں — مثل سورج کے ہوئیں دستِ کرم سے زر فشاں

---

۱ سمک کے معنی مچھلی، شاعرانہ مراد اُس مچھلی سے ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو اپنے اوپر لئے ہوئے ہے، از سما تا سمک محاورے میں اسی مچھلی سے مطلب ہے۔ ۲ فضول خرچی کرو واسطے قوم کے ۱۲

۳ قرآن پاک کا جملہ ہے، یعنی لاؤ دلیل واضح ۴ ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے ملک بھوپال جنہوں نے یونیورسٹی فنڈ میں ایک لاکھ روپے عطا فرمائے ہیں، اور اس عطیے کے علاوہ فیاضی کر… علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے برقی پنکھوں اور برقی روشنی کے کثیر مصارف اپنے ذمے لئے ہیں ۱۲

تو یہ سمجھ کیوں کہا، کیا خاک دیتا ہے وہ زر
بخش دیتی ہیں یہ زر، اور پھیر[۱] لیتا ہے وہ زر

کی عیاں کرنل عبید اللہ خاں[۲] نے شانِ فیض | فیض کو جسم، اور اُن کے دل کو کہیئے جانِ فیض
بارشِ زر سے نکالا، دل نے جب ارمانِ فیض | جوش سے شملے[۳] کی کوٹھی پر اُٹھا، طوفانِ فیض

یادِ قرآن[۴] نے، فَلَا تَنْهَرْ پہ مائل کر دیا
قوم سائل تھی، تو کاسہ اُس کا زر سے بھر دیا

شہ حمید اللہ خاں[۵] کی، ہل گئی جب فیض کو | جوش میں لانے لگی ہر جنبشِ لب فیض کو
جانبِ تعلیم، مائل دیکھکر، اب فیض کو | دلولے سمجھاتے ہیں بڑھ کر، یہ مطلب فیض کو

رعد جیسے، اس قدر رہو، بول بالا، قوم کا
آب زر چھلکے، بھرے ایسا پیالا قوم کا

قوم کا جھرمٹ ہوا، چندے کی دولت بڑھ گئی | عورتوں[۶] کی بالیوں سے زر کی زینت بڑھ گئی
اتحادِ قوم سے ملت کی شوکت بڑھ گئی | حوصلے کا، حوصلہ ہمت کی، ہمت، بڑھ گئی

---

[۱] شام کو سورج اپنی روشنی کو اپنے ساتھ سمیٹ لے جاتا ہے ۱۲ [۲] جناب کرنل حاجی حافظ، محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر، جو ہر ہائنس فرمانروائے بھوپال کے منجھلے صاحبزادے ہیں آج سے چند ہی دنوں پہلے انہوں نے پچاس ہزار روپے علیگڈھ محمڈن کالج کو عطا فرمائے ہیں، اور اب دس ہزار روپے یونیورسٹی فنڈ میں دیے ہیں سنٹرل پراونسز میں اس فنڈ کے متعلق وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ [۳] شملہ بھوپال میں ایک پہاڑ کا قدیم نام ہے جسپر کرنل صاحب بہادر کی کوٹھی ہے، اس میں یونیورسٹی فنڈ کے لئے جلسہ ہوا تھا، جسکے پریسیڈنٹ کرنل صاحب بہادر تھے [۴] یادِ قرآن سے یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک کا خیال کر کے اور یہ بھی کہ کرنل صاحب بہادر حافظ قرآن ہیں فلا تنہر کے معنی، پس نہ جھڑک [۵] حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، ہر ہائنس فرمانروائے بھوپال کے چھوٹے صاحبزادے جو یونیورسٹی فنڈ کی تکمیل کے واسطے دلی جوش کے ساتھ توجہ فرما رہے ہیں اور سات ہزار روپے خود اس کے چندے میں عطا فرما چکے ہیں [۶] شہر بھوپال کی ایک نیکدل بیوی جن کے پاس زر نقد نہ تھا، اُنہوں نے یونیورسٹی فنڈ میں اپنی سونے کی بالیاں بھیجدی ہیں ۱۲

رشتۂ الفت سے، سب بھوپال وابستہ ہے آج
قوم، گویا، مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے آج

ہمت اب کہتی ہے، میں بڑھنے کی شیدا ہوں — جوش کہتا ہے کہ بڑھ چل میں ترے ہمراہ ہوں
بولے آغا خاں، میں خضرِ شاہ راہِ جاہ ہوں — جانی بوجھی منزلِ مقصد ہے، خوب آگاہ ہوں

آؤ، لو بخشیں گے سامانِ ہنر کنگ[1] اِمپرر
دیں گے یونیورسٹی کا چارٹر[2] کنگ اِمپرر

وہ کھڑے ہیں، صاحبِ تاج و نگینِ ہند، وہ — وہ ہیں وہ، فرماں روائے سرزمینِ ہند وہ
رہتے ہیں لنڈن میں لیکن ہیں مکینِ ہند وہ — گھر دلوں میں کر لیا، ہیں دل نشینِ ہند وہ

خوش مسلماں ایسے شاہنشاہ کے سائے میں ہیں
ان کے سائے میں ہیں، تو اللہ[3] کے سائے میں ہیں

ہر تصور دل کا اب بولا کہ میں اُمید ہوں — بخت چمکا اور کہا اس نے کہ میں خورشید ہوں
خندہ ہنس کر بول اُٹھا، میں عشرتِ جاوید ہوں — کہہ اُٹھا دِن، اے مسلمانو، میں روزِ عید ہوں

دی صدا کالج نے، مجھکو چارٹر درکار ہے
بندہ پرور، اک نگاہ لطف اِدھر درکار ہے

ساتھ لیکر چند لوگوں کو وہ آغا خاں بڑھے — جیسے اُمیدوں کو لیکر ہمتِ انساں بڑھے
جیسے کرنوں کو لیے خورشید نور افشاں بڑھے — نیکیوں کے ساتھ جیسے قوتِ ایماں بڑھے

لوگ اتر لتے ہوئے، پیرو بنے، یوں، پا کے ساتھ
جیسے لہراتی ہوئی، موجیں چلیں، دریا کے ساتھ

[1] کنگ کے معنی بادشاہ اور امپرر کے معنی شاہنشاہ، انگریزی میں ان الفاظ کو ملا کے مفہوم یہ رکھا گیا ہے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اور ہندوستان کے شہنشاہ، [2] چارٹر انگریزی میں اُس شاہی سند کو کہتے ہیں جو بادشاہ کے حضور سے عطا ہو ۱۲۔ [3] اِس اعتبار سے کہ بادشاہ ظل اللہ ہے ۱۲

وہ کھڑے جا کر کھڑے کنگ ایمپرر کے سامنے رُخ پہ فرحت اور رُخ اُنکی نظر کے سامنے
اب دعائیں قوم کی، پہونچیں اثر کے سامنے بخت چمکا جا کے شاہِ بحر و بر کے سامنے

سرنوشتِ قوم کو، ہز ہائینس پڑھنے لگے
آرزوئیں کھل پڑیں، اور حوصلے بڑھنے لگے

اڈریس نکر ہوا شکلِ تمنا کا ظہور لب ہز آغا خاں کے جنباں دل میں ہمت رُخ پہ نور
سنتے ہیں کنگ ایمپرر، اور کرتے ہیں ظاہر سرور اُن کے ہونٹوں کا تبسم، کچھ تو کہتا ہی ضرور

چشمِ رحمت، لطف کی تصویر دکھلانے لگی
چارٹر کی شکل چتون سے نظر آنے لگی

ہز مجسٹی نے، وہ سوئے جیب کی ترچھی نظر جیب میں وہ ہاتھ ڈالا، وہ نکالا چارٹر
بختِ کالج بنکے، وہ چمکے حروفِ آبِ زر شوق دیکھو، وہ عطا فرماتے ہیں کنگ ایمپرر

لے کے، وہ ہز ہائینس پلٹے خوشی کی چال سے
رُخ سے فرحت یوں عیاں ہے جیسے چھوٹ لال سے

احمد علی، شوق، قدوائی،

لہ ہز ہائنس آغا خان ٢ہ لال عربی میں عین کے ساتھ لعل ہے، اور اُردو میں الف کے ساتھ لال بھی صحیح ہے لال کی چھوٹ اُس عکس کو کہتے ہیں، جو اس کے رنگ کی تاب سے نکلکر سفید شے پر سُرخی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ١٢-

غزل

صوفی آں سرِ حقیقت کہ ہویدا میکرد برحدیثے کہ بیا کرد ہم از ما میکرد
پیچ و تابے کہ دلِ غمزدہ در پنہاں داشت شکنِ طرۂ گیسوئے تو پیدا میکرد
دوش رفتیم و ندیدیم کہ طوطی بہ چمن داستانہا ز لبِ لعل شکرخا میکرد
فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشاد گشت رازِ دگراں راز کہ افشا میکرد
تنشیلی از قامتِ زیبائے تو میگرد سخن یا لتو گوئی سخن از عالمِ بالا میکرد

عورت کی خلقت بھی دلیل واضح ہے وحدانیت خالق کی

عالم کی ہر ایک شے اگر اوسکی حقیقت کو بنظر تعمق دیکھا جائے تو ایک حکیم صانع کا پتہ دے رہی ہے۔ مثلاً ایک بھٹے میں سیکڑوں دانے اور ہر ہر دانہ کے لیے ایک ایک خانہ پھر اُن نازک دانوں کی حفاظت کے لیئے ریشم سے نرم تر ریشے ادن پر بچھے ہوئے پھر ادن پر کئی غلاف اس ترتیب سے کہ اندر والا غلاف حریر محض سے زیادہ تر نازک اور باہر والا کرباس کے قریب قریب سخت۔ جوہری کی مجال نہیں کہ موتیوں کو بھی اس احتیاط سے رکھہ سکے اور ہوائے سرد وگرم سے اِس طرح بچا سکے یہ حکمت و تدبیر نہ اون دانوں نے خود اپنے لیے کی ہے نہ کاشتکار کی زحمت کو اس میں کچھہ دخل ہے نہ ابرو باد کو اس حکمت کے ساتھہ کچھہ لگاؤ ہے نہ مہر و ماہ کو کچھہ تعلق ہے۔ انسان کی عقل ان تمام مصالح و حکم کو سمجھتی ہے اور یہی عقل حجت خدا ہے۔ منکر پر بھی اوسنے حجت تمام کر دی ہے۔ مسلہ ارتقا والے وجود باری کے باب میں خاموش ہیں یہاں تک کہ ہکسلی اپنے تئیں متوقفین میں شمار کرتا ہے حیات کے باب میں اپنی تحقیق یہ بیان کرتے ہیں کہ حیوانات میں حیات وہی ہے جو نباتات میں ہے اور نباتات میں ابتدائے حیات یوں ہوتی ہے کہ پہلے ایک تھیلی سی بنتی ہے جس میں جان ہوتی ہے۔ بس یہیں تک علم انسانی کی رسائی

ہوئی ہے لیکن یہہ نہیں سمجہہ میں آتا کہ وہ مادہ جو غیر ذی روح تھا کیونکر ذی روح بن جاتا ہے اور غیر مرئی شے کیونکر دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ تیلی جس مادہ سے بنی نہ پہلے وہ مادہ دکھائی دیتا تھا نہ اوس میں جان تہی۔ ع

نورحیرت درشب اندیشۂ اوصاف تو

بس ہمایوں مرغ عقل از آشیاں انداختہ

ان حکمائے وقت کا وجود باری میں توقف کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ چاہتے ہیں حواس ظاہری سے وجود باری کا پتہ لگالیں اور اون کا یہ کہنا کہ وجود باری ہم پر نہیں ثابت اِس کے یہ معنی ہیں کہ حواس ظاہری سے ہم اوس کو نہ پاسکے اور اسباب میں ہم بہی اون کے ساتہہ اتفاق کرتے ہیں کہ حواس ظاہری سے اوس تک رسائی کسی طرح ممکن نہیں فیلسوف ہکسلی جوان لوگوں میں سربرآوردہ ہے۔ کہتا ہے کہ مادیین کا مذہب یہ ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کوئی اور شے موجود نہیں میں اس مذہب کو غلط سمجھتا ہوں۔ قوت کوئی اور شے نہیں سوا اس کے کہ علتہ حرکتہ اوس سے مرادلیں۔ میں اِس کو نہیں سمجہہ سکا۔ ہاں انکشافات علوم طبعیہ سے اتنا ثابت ہوا ہے کہ جسے لوگ مادہ سمجہا کرتے ہیں اوسکا دائرہ وسیع ہوگیا ہے اور جسے محض قدرت الہی کی طرف منسوب کرتے ہیں یا فعل روحانی سمجہتے ہیں اوسکا دخل کم پایا جاتا ہے۔ لیکن اِس سے وجود مادہ پر یا مذہب مادیین پر کوئی استدلال نہیں قایم ہوسکتا۔ اور جلد ۹ صفحہ ۱۴۰ میں اوس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی دیوانہ ہی ہوگا جو وجود باری کا انکار کرے انتہی

حکیم برکلی مادیات کے وجود کا منکر ہے اور وہ سچ کہتا ہے کہ مادہ ایک ایک مجہول شے ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں علم مابعد الطبیعتہ سے اوسکو

تعلق ہے اور وجود نفس کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوتا۔ انتہی۔
راقم حروف کہتا ہے کہ بلاشبہ ہر نفس بخوبی یہ علم رکھتا ہے کہ میں ہوں مگر اس سے بے خبر ہے کہ میں کیا ہوں اور کیونکر ہوں اور کہاں ہوں۔ اسکی توضیح حکیم لوک کے اس مقولہ سے بخوبی ہوتی ہے کہ میں دیکھتا ہوں یا سمجھتا ہوں یا سوچتا ہوں جب کہ خدا کو منظور ہوتا ہے لیکن یہ کیا علاقہ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا انتہی۔ مگر لوک نے مادیات و روحانیات دونوں کے وجود کی تصریح کر دی ہے وہ کہتا ہے کہ جس قدر اجسام مادی کا علم ہم کو ہے روحانیات کا علم اوس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہم کو مادیات کا علم اتنا ہی ہے کہ اوس کے اعراض محسوسہ کا ہم کو حس ہوتا ہے مگر خود وہ شے نامعلوم ہے روحانیات کا علم بھی اسیقدر ہم کو حاصل ہے کہ اوس کے خواص معقولہ کا ہم کو تعقل ہوتا ہے گو خود وہ شے نامعلوم ہے انتہی۔ یہ تینوں شخص اساطین علوم مغاربہ میں سے ہیں ان کے اقوال کے ساتھ حکمۃ مغربیہ کے امام حکیم نیوٹن کی اس تحقیق کو منضم کر کے دیکھنا چاہیئے کہ جس طرح گھنٹی کی صدا یا کسی باجے کے تار کا سر یا کسی اور چیز کی آواز سوا اس کے کہ ایک حرکۃ ارتعاش ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ ہوا میں بھی سوا اسی حرکۃ کے جو کسی چیز میں سے اس میں سرایۃ کر گئی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اور حاسۃ اسی ارتعاش کے حس کو آواز سمجھتا ہے۔ بس یہی حال رنگوں کا ہے کہ اجسام پر جو رنگ ہیں وہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اون اجسام کی ساخت ایسی ہے کہ فلاں فلاں رنگ کی شعاع کو بہ نسبتہ دوسری شعاعوں کے اچھی طرح منعکس کرتے ہیں۔ شعاعوں میں جو رنگ ہیں وہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اون شعاعوں میں یہ خاصہ ہے کہ فلاں یا فلاں قسم کی حرکۃ کو پردۂ چشم میں منقش کریں

اور آنکھ اوسی حرکت کے ادراک کو رنگ سمجھتی ہے انتہی۔

نیوٹن کے اِس قول سے جو ثابت و مبرہن ہوچکا ہے ظاہر ہے کہ تمام مبصرات و مسموعات کا وجود ہمارے نفس ہی میں ہے خارج میں ایک حرکت کے سوا کچھہ بھی نہیں ستاروں کا تلالو آفتاب کا لمعان اجسام کا اختلاف الوان بادل کی گرج نغمہ کی شیرینی حروف کے مخارج فقط ہمارے پردۂ چشم و پردۂ گوش میں یہ سب چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں خارج میں ایک حرکت کے سوا کچھہ بھی نہیں۔ بعبارۂ آخری اِس کا یہ مطلب ہوا کہ عالم میں تاریکی ہے ہم کو روشنی معلوم ہوتی ہے۔ عالم میں خاموشی ہے ہم کو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے حواس خمسہ کے مدرکات کی۔ انہیں حواس کے ذریعے سے جو لوگ خدا کو ڈہونڈھتے ہیں وہ تو اوسے کبھی نہیں پا سکتے۔

ہکسلی گو فرقۂ لا ادریہ میں سے ہے اور ذات باری اور روح اور مادہ کے ثبوت وجود میں توقف کرتا ہے لیکن اِس الزام کو کہ وہ حواس خمسہ پر اپنے مدرکات کو منحصر سمجھتا ہے گوارا نہیں کرتا۔ اوس کا فاضل معاصر فیلسوف للی جب اوس پر معترض ہوا کہ ہکسلی جس چیز کو حواس خمسہ سے محسوس نہ کر سکے اوس کے ثبوت کا منکر ہے تو ہکسلی نے اوس کا جواب یہ دیا مجھے یقین ہے کہ للی کو غلط فہمی ہوئی اور اِس غلط فہمی کا احساس حواس خمسہ کے ذریعہ سے نہیں ہوا ہے پہر بھی میں اوس کی غلط فہمی کا منکر نہیں ہوں۔ اور میں للی کی اوس خوش بیانی کا معترف ہوں جس خوبی سے اونہوں نے اعتراض کی تقریر کی ہے لیکن یہ اعتراض بھی حواس خمسہ کے ذریعہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اوس کے استدلال منطقی و سبک عبارۃ کی خوبی میرے ذہن نے سمجھی ہے۔ انتہے۔

حیات کی تحلیل پر جیسی حیرت ڈارون کے متبعین کو پیدا ہوئی ہے ویسی ہی حیرت نیوٹن کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے کہ اجسام میں جذب و انجذاب باہمی کا ضابطہ تو ایک پایا جاتا ہے لیکن یہ میں کس منہ سے کہوں کہ اجسام ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں جسم تو بے جان و بے حس ہے وہ بھلا کیا کھینچیگا۔ انتہی

یہ حیرت پچھلے کی چاندنی ہے جس نے صبح کاذب کی طرح دہوکا دیکر طائر عقل کو وطن آوارہ و تباہ کر رکھا ہے ورنہ جو لوگ آنکھوں سے یہ دیکھ چکے کہ کیونکر حیات عالم غیب سے محل شہود میں آجاتا ہے یا اس نکتہ کو سمجھ چکے کہ قوت اس کے سوا کوئی اور شی نہیں کہ اوس سے علتہ حرکتہ مراد لیں یا یہ فیصلہ کر چکے کہ جسم بے جان بے حس چیز ہے کشش کا فعل اس سے خود نہیں سرزد ہو سکتا یا یہ جانتے ہیں کہ ہمارا دیکھنا سمجھنا سوچنا یہ سب فعل ہمارے اختیاری نہیں ان لوگوں کا وجود باری میں توقف کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ حواس ظاہری سے اوس کا ادراک نہیں حاصل ہوا۔ ورنہ خود ان کے نفس میں جو آثار احتیاج و افتقار کے موجود ہیں وہ باری تعالیٰ کا پتہ بتا رہے ہیں۔

لیکن محض وجود باری کا پتہ مل جانا کافی نہیں اصحاب توحید و تثلیث کا معرکہ اس کے بعد سر کرنا ہے۔ تمام حکمائے فرنگ اصحاب تثلیث میں ہیں اور جب ابطال تثلیث تک اون کا استدلال منجر ہوتا ہے تو موحد ہونے کے بہ نسبت منکر وجود باری تعالیٰ ہو جانا اونہیں نہایت آسان معلوم ہوتا ہے پریسٹلی حکمائے انگلستان میں بڑا مشہور و سر برآوردہ ایک فاضل جلیل القدر گزرا ہے جو فن کیمیا کے بہت سے مسائل کو حل کر گیا۔ اوس نے اپنے موحد ہونے کا اظہار کر دیا خلق خدا دشمن ہو گئی گھر کھدوا ڈالا۔ ساری کتابیں اور گراں بہا آلات اوس کے تباہ کر ڈالے۔ آخر مجبور ہو کر امریکہ میں جا کر ستر برس کی عمر میں ۱۸۰۴ء میں اس حکیم نے انتقال کیا مصلحت ملکی کے

آگے استدلال عقلی کا زور کچھ نہ چل سکا۔

وحدانیۃ باری تعالیٰ کا ثبوت بھی نفس انسان میں ہے۔انسان کو بقائے شخص کے لیئے ہوا کی ضرورت ہے کہ سانس لے اناج کی احتیاج ہے کہ غذا کرے۔اس سے ثابت ہے کہ جس نے انسان کو پیدا کیا اوسی نے ہوا کو اور اوس کے لیے غذا کو پیدا کیا۔امیر المومنین کے اِس ارشاد سے کہ خالق النملۃ ہو خالق النخلۃ اُردو میں یوں کہیں گے کہ جس نے چیونٹی کو پیدا کیا اوسی نے شکر کو پیدا کیا و حدانیۃ خالق کی دلیل ظاہر ہے۔

جسطرح احتیاج انسان کی اپنے وجود میں ثبوت ہستی باری تعالیٰ ہے اور احتیاج انسان کی بقائے شخص میں ثبوت وحدانیۃ باری تعالیٰ ہے۔ اسیطرح احتیاج انسان کی بقائے نوع میں بھی ثبوت وحدانیۃ باری تعالیٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو بقائے نوع کے لیے عورت کی ضرورت ہے کہ اوس سے نسل چلے اور عورت کو اوس نے خود نہیں خلق کیا۔غرض کہ عورت کی خلقۃ بھی وحدانیۃ خالق کی دلیل واضح ہے۔

علی حیدر طبا طبائی

تاریخ سپارٹا میں لکھا ہی کہ جن دنوں میں وہاں یہ دستور تہا کہ ہر چھوٹا اپنے بڑے کو سلام کرے۔ایک لڑکے نے جو سڑک پر جا رہا تہا ایک بزرگ کو آتے ہوئے دیکھا اور سلام نہ کیا بزرگ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اوسکو پکڑ کر مجسٹریٹ کے سامنے لیگیا مجسٹریٹ نے لڑکے سے پوچھا کہ تمنے کیوں نہیں اس بزرگ کے ادب کو ملحوظ نہ رکھا لڑکے نے جواب دیا اس لیئے کہ مجھے معلوم ہی کہ اس بڈہے کا کوئی لڑکا نہیں ہی اس لیے کہ اس نے شادی نہیں چونکہ یہ لاولد مریگا اور اپنے بعد کوئی لڑکا نہ چھوڑیگا جو میرے بڑھاپے میں مجھے سلام کرے اسکو اس نے حق نہیں ہی کہ یہ مجھہ سے تعظیم کا متوقع ہو۔مجسٹریٹ نے یہ عذر پسند کیا اور بڈہے کو نکالدیا ۱۲۔

حقوق نسواں

جون کے رسالہ تمدن میں جو مضمون "تمدن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ درحقیقت نہایت غور و توجہ سے دیکھنے کے قابل ہے گو قابل نامہ نگار نے آخر میں جا کر مضمون کو بہت سادہ اور مفید بنانے کوشش کی ہے اور اسمیں کلام نہیں کہ جو سوال پیدا کئے گئے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ انپر بحث کی جائے لیکن تمام مضمون بلکہ ہر صفحہ ہر پیرا ہر سطر آئینہ ہے اس طرز معاشرت کا جسمیں ہماری عورتیں آجکل زندگی بسر کر رہی ہیں اور ثبوت ہے اس دعوے کا کہ عام نہیں بلکہ خاص اور خاص الخاص افراد قوم بھی اس طرز معاشرت کے ایسے عادی ہو گئے ہیں اور بیو یونپر حکومت کا چسکا ایسا پڑگیا ہے کہ اب اسکا چھوٹنا آسان نہیں +

حامیان حقوق نسواں کی بابت قابل نامہ نگار کے ان الفاظ سے کہ "اظہار قابلیت یا ذاتی نفع کی غرض سے ایسے مضامین رسالوں میں لکھا کرتے ہیں" ہمیں بحث نہیں کام کرنیوالوں نے اس سے بہت زیادہ سنا ہے ہاں بحث صرف مضمون کے اس حصہ سے ہے جس میں مولانائے موصوف نے حقوق کی تصریح کی ہے - اس سے ہم اتفاق کر لیتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان فطری حق ایک ہی نہیں لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب فطری حق ہے نہیں تو مرد کی فوقیت ثابت ہوتی چاہیے تھی تاکہ عورتوں کے ذمہ یہ بار پڑتا کہ وہ خدمت کر کے اخلاقی حقوق پیدا کریں جس حالت میں کہ قدرت نے فریقین کے حقوق میں کوئی امتیاز نہیں

رکھا اور مرد کو عورت پر فوقیت نہیں دی تو ضرورت یہ ہے کہ مرد خدمت کر کے اخلاقی حق پیدا کریں۔ مولانائے موصوف کا مضمون مکمل ہوتا اگر مولانا اس بات کے ثابت کرنے کی بھی کوشش فرماتے کہ مرد کو عورت پر کیا فوقیت ہے اگر ہماری رائے غلط نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلیل قیاس مذہب کسی طرح بھی مرد کی فوقیت عورت پر ثابت نہ ہوگی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قابل نامہ نگار نے مسئلہ کے اس پہلو کو ہاتھ نہ لگایا۔

مخالفہ حقوق نسواں سب سے بڑی دلیل مرد کی فوقیت کی اسکی وہ طاقت پیش کرتے ہیں جو قدرت نے جانوروں تک میں نر کو مادہ کے مقابلہ میں عطا کی ہے لیکن یہ دلیل اسوقت ٹوٹ جاتی ہے جب ہم بہت سے جانور ایسے بیان کرتے ہیں جنہیں نر اور مادہ میں بصورت ظاہری کوئی مابہ الامتیاز نہیں علاوہ ازیں طاقت وجہ فوقیت ہو بھی نہیں سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو طاقت حسن اس سے بہت زیادہ افضل و اشرف ہے +

مولانا صاحب نے چونکہ اس خاص معاملہ پر کچھ نہیں لکھا اس لیے ہم بھی اسکو خارج از بحث سمجھکر صرف ان واقعات پر بحث کرتے ہیں جو مولانا نے تحریر فرمائے مولانا کو نہ صرف یہ اعتراف ہے بلکہ انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ مرد عورت میں کوئی فطری حق نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ باسانی نکلتا ہے کہ مذہب نے دونوں کو دنیا میں اس غرض سے پیدا کیا کہ وہ تعلقات میں اخلاقی حقوق قایم کریں اور زندگی پر لطف بنائیں۔

ایسی حالت میں جتنا فرض عورت کا ہے اوتنا ہی مرد کا بھی کہ وہ اخلاقی حق قایم کرنے کی کوشش کرے مگر اس بیوی کے واسطے زندگی کا وہ لمحہ کیسا درد انگیز ہوگا جو علی الصباح نماز سے پہلے اٹھکر چولہے میں گھسی شوہر کے اُٹھنے سے پہلے چار انڈے وغیرہ تیار رکھئے۔ نہانے یا منہ دھونے کو پانی

گرم کیا اور اس ڈر کے مارے کہ کہیں اٹھ نہ بیٹھیں جھپاک جھپاک ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر، کھانا پکانے پر پل پڑی مارا مار کھانا پکا یا دستر خوان بچھانا چاہتی تھی کہ باہر سے کسی نے آواز دی اور میاں صاحب جو یہ کہکر باہر گئے کہ تم کھانا نکالو میں آتا ہوں تو ساری دوپہر پوری شام اور آدھی رات نکل گئی مگر میاں ہی نہ پلٹے اس عورت کو کیا معلوم کہ میاں یار دوستوں کے مجمع میں اپنی آنکھیں سینک رہے ہیں اس کی آنکھیں دروازے ہی کو لگی رہیں عصر کی اذان کان میں آئی تو یہ خیال ہوا کہ صبح کا کھانا باسی ہوگیا دن بھر کے بھوکے تھکے ہارے آئیں گے ٹھنڈے چاول کیا آگے رکھوں جلدی جلدی سودا سلف منگوا مغرب سے پہلے پکا بکو راہ تکنے بیٹھ گئی بچے بھی پڑ کر ڈھیر ہو گئے رات کا وقت ڈھنڈار گھر سنسان سماں دروازہ کھلا ہوا میں کھٹکے ہزار خوف اتنی مجال نہیں کہ محلہ کی کسی عورت کو بلا کر بات کر لے یہ حکم نہیں کہ گھڑی بھر کو خود کسی کے ہاں چلی جائے آدھی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات اِس ڈر سے کہ کہیں کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے انگیٹھی میں کوئلے دہکا. کھانا لیے بیٹھی رہی آتنا بڑا دن اور اتنی لمبی رات نیند کا جھوکا آگیا وہیں منڈکری مار پڑ رہی دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ میاں صاحب چرچر کرتے آدھمکے بیوی کو سوتا دیکھ تو آنکھوں میں خون اتر آیا آہستہ سے پکارا پہلی ہی آواز پر گھبرا کر اٹھ بیٹھی اٹھنا تھا کہ حشر ٹوٹ گیا اس میں تو اتنی قابلیت تھی ہی نہیں کہ وہ حق پیدا کر سکتی اور یہ پوچھ سکتی کہ کہاں رہے۔ ہاں میاں میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ وہ کمزور پر عمر بھر حکومت کرتے اور یہ فرماتے کہ "جب مجھے تم سے اتنا آرام ہی نہ ملا کہ کھانا کھلا سکو تو تمھارے ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوا۔"

ہم نہیں جانتے کہ کونسے مذہب کس اخلاق اور کیسی عقل نے اپنے بدبخت شوہر کو یہ حق دیا تہا کہ وہ بیوی سے آکر یہ توقع بھی رکھتا کہ اسکو کھانا تیار ملیگا۔

اسلام فریقین کی مساوات کو ان الفاظ میں ادا کر رہا ہے کہ "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم انکا لباس ہو"

اب رہا اخلاق اس سے بدتر اخلاقی گناہ اور اس سے ظالم اور جابر شخص دنیا میں کیا ہوگا جو ایک شریف بہولی بہالی لڑکی کو ایسی لڑکی کو جو عزیزوں کو دوبہر تھی نہ ماں باپ کے گھر کا کوڑا محبت کے وعدوں اور حسن سلوک کے اقرار و پیغم حقیقی عزیزوں سے تڑا اپنے گھر لایا اور برسوں کی رفیق ہمدم کے سا یہ قدر کی۔ گویا بیوی کا فرض صرف شوہر کی خدمت ہے

جسطرح انسان کی فطری حریت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اسی طرح یہ بھی قابل بحث نہیں کہ انسانیت کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر یکساں ہے روڈلو جیکل سیر زرین مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں فزیالوجی اور علم تشریح کی تحقیقات کا نتیجہ اس دعوے کا کافی ثبوت ہے پروفیسر مانجاراجوائی کا ایک زبردست عالم ہے لکھتا ہے کہ مرد کتنا ظالم اور خودغرض ہے کہ اسنے علم تشریح تک میں اپنی مکاری کو ہاتھ سے نہ دیا اور یہ کوشش کی کہ عورت کو اپنے مقابلہ میں انسانیت کا ادنیٰ درجہ دے صرف اس لیے کہ اسکو ان حقوق سے محروم کردے جو وہ صرف اپنے واسطے مخصوص کرتا ہے اسکی راے ہے جبتک کہ عورت کو فطری حریت سے پوری طرح متمتع ہونیکا موقع نہ دیا جاے۔ اسکی طبیعت کا فیصلہ کرنا یقینی غلط ہے۔

علمار انتہراپالوجی کے تمام علمار اس تحقیقات پر متفق ہیں کہ سوسائٹی کی ابتدائی ساخت میں مرد اور عورت دونو برابر تھے بلکہ اکثر جگہ عورت افضل تھی

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ ہے جو کامیابی رسالت میں قوۃ بازو رہیں انکی بابت پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ مجھے خدیجہ کی زندگی میں کبھی کوئی وقت ایسی پیش نہیں آئی جسمیں اسنے مجکو مدد نہ دی ہو۔

کم از کم مسلمان تو ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مرد کی بڑی سے بڑی دقت میں بھی عورت کی اعانت اتنی ہو سکتی ہے جتنی زیادہ سے زیادہ کسی مرد کی

کیا اسپر بھی اکثر حضرات یہ ہی فرمائیں سگے کہ عورت ناقص العقل ہے اور اسی وجہ سے مرد کو خدا نے عورت پر افضل کیا ہے تا کہ وہ بیوی پر حکومت کرے اور اس کی حریت کو سلب کرے۔

ہمیں نہایت ہنسی آتی ہے جب ہم ان بحثوں میں اکثر حضرات کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ قرآن صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ مرد عورتوں کے حاکم ہیں حالانکہ اس آیۃ کا مفہوم صاف ہے کہ چونکہ قوائے فطری کے اعتبار سے مردوں کے فرائض عورتوں سے زیادہ ہیں اس لیے وہ عورتوں کے بطور کفیل کے ہیں اور انکا فرض ہے کہ جو کچھ وہ کمائیں وہ بیوی کے آگے ڈالدیں تا کہ وہ اپنے فرائض باحسن الوجوہ انجام دے سکے۔

خیر البحث یہ تھی کہ قدرت نے نہ مرد کو عورت کا غلام پیدا کیا نہ عورت کو مرد کا۔ صرف تحصیل معاش کے واسطے مرد کے قوا نسبتہً مضبوط بنائے تہے لیکن ہندوستان نے اس طاقت سے یہ کام لیا کہ عورت پر حکومت کرنی شروع کر دی۔ عورت چونکہ فطرتاً باعتبار طاقت مرد سے کمزور تھی اور تحمل طینت میں ودیعت تہا دبتے دبتے غلاموں سے بھی بدتر ہو گئی لیکن یہ مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بجار سڑک پر پہر رہا ہو اور کسی آتی جاتی بڑھیا کو ایک ایسی ٹکر دے کہ وہ غریب چاروں خانے چت جا پڑے یا ایک بندر کسی معصوم بچے کے ہاتھ سے

داغِ فرزند

آج اپنے، پرائے، ہمسائے — کیوں نظر آرہے ہیں گھبرائے؟
ہیں! یہ خاموش کیوں ہیں بت کیطرح — کیا ہوا ان کو بیٹھے بٹھلائے؟
روح پرواز کر گئی شاید — ہائے اللہ کیا کیا جائے؟
طیبّہ طیبّہ! کدھر ہے تو؟ — تیرا بابا تجھے کہاں پائے؟
کیا تجھے اس کی اب نہیں پروا — سو رہی ہے جو پاؤں پھیلائے؟
ابّا کہہ کر گلے سے لپٹے کون؟ — کون گودی کو ہاتھ پھیلائے؟

وہ بھی کیا لوگ تھے! معاذ اللہ — اُٹھے اور زندہ بیٹی گاڑ آئے
ایک میں ہوں کہ دل نہیں کہتا — لاش مٹی میں داب دی جائے
ناز سے ماں کی گود میں جو پلے — اُف وہ آغوش قبر میں جائے!
دیکھ اے خاکِ گور لعل تجھے — داغِ حسرت کلیجہ پر لائے

جب تری بھولی باتیں یاد آئیں — تیرے مکھڑے کا جب خیال آئے
صبر کیا آئے قلبِ مضطر کو — کوئی کسطرح دل کو بہلائے؟
ضبطِ گریہ میں کیا کروں ناصح — تیری آنکھوں میں اشک بھر آئے
جو نہ واقف ہو ذوق گریہ سے — مفت کیوں آکے میرا سر کھائے
داغِ فرزند، کیا کہوں! اللہ — غیر کو بھی یہ دن نہ دکھلائے
ہائے کیا ہوک دل میں اٹھتی ہے — کاش سینے سے دم نکل جائے!

"وہ چھٹے ہم سے جسکو پیار کریں
جبر کیونکر یہ اختیار کریں"

آپ ہنسکر ہنسائے گا اب کون؟ — دل کا غنچہ کھلائے گا اب کون؟
تھی چمن کی بہار اُس گل سے — دوسرا ویسا لائے گا اب کون؟
تھی اجالا اندھیرے گھر کا تو — یہ خرابہ بسائے گا اب کون؟
آہ گل ہوگئی وہ شمع خوشی — یہ دیا پھر جلائے گا اب کون؟
صبحکو آکے کھینچنی چادر — نیند سے یوں جگائے گا اب کون؟
دیکھتے ہی مجھے لپٹ جانا — دل سے یوں غم بھلائیگا اب کون؟
ہائے طفلانہ وہ رکوع وسجود — وہ تماشے دکھائیگا اب کون؟
جانتی تھی تو رنج کے تیور — آیا غصہ مٹائے گا اب کون؟
عمر ہی کیا تھی؟ دو برس اسمیں — یہ ذہانت دکھائیگا اب کون؟
تو بھری گود کر گئی خالی — ماں کو تسکین دلائے گا اب کون؟
کانوں میں گونجتی تھی جو آواز — ویسی بولی سنائیگا اب کون؟

"دل کو باتیں جب اُس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں"

آہ میں آج ہوگیا برباد! — دشمنو لو تمہیں مبارکباد!
آہ اندھیر ہوگئی دنیا — کاٹے کھاتا ہے اب عظیم آباد
یاں کسی شے کا اعتبار نہیں — اِس جہاں کی ہوا پہ ہی بنیاد
ہائے وہ عندلیب خوش الحاں — جس کے دم سے تھا یہ چمن آباد
آسماں تجھ پہ کیوں نہ ٹوٹ پڑا — لے چلا جب پکڑ کے او صیاد
توڑی کچی کلی جو اے گلچیں — کیا ملا اس سے او ستم ایجاد؟

درد دل کس سے میں کہوں جاکر — آہ لے جاؤں میں کہاں فریاد!
دے، نہ دے، دیکھے لیلے لے داتا، — تیرے سوگن ہیں اور ہی تو آزاد
اے خدا تیری ہی امانت تھی — تو نے لے لی اگر تو کیا فریاد؟
کون دم مارے فیصلوں پہ تری — اپنی سر آنکھوں پر، جو ہوا ارشاد
لب پہ آیا ہو حرف ناشکری — کی ہو بیتابیوں میں گر فریاد
ہم سے کیجو نہ باز پرس اس کی — در گذر کیجو اس سے رب عباد
کچھ تو اسمیں بھی مصلحت ہوگی — ہوگا کوئی نہ کوئی اس میں معاد
ہے جو اعمال کی سزا مقصود — ہے جو تیری عذاب سے یہ مراد
یعنے دنیا میں جھیل لیں سب رنج — پرسش آخرت سے ہوں آزاد
جب یہی مصلحت ہے۔ یہ خوبی — صبر کر صبر اے دل ناشاد
بھول جا۔ یوں گناہ گار نہ کر — لب پہ آئے نہ شکوۂ بیداد
ہائے سب سچ ہے کیا کروں لیکن — دل سے جاتی کہاں ہے اسکی یاد

اشک خوں آنکھوں سے جو جاری ہے
بند کیا ہو۔ کچھ اختیاری ہے؟

دل ریش
محمد مسلم عظیم آبادی

---

(۱) وہ جو اپنی آباد اجداد کی تعریف کرتا ہے وہ اسبات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خود کوئی خوبی نہیں رکھتا
(۲) درحقیقت مالدار وہ ہے جو کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا اور غریب وہ ہے جو ہر شے کے حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے۔
(۳) ہر رنج کے بعد خوشی کا ہونا ضروری ہے۔
(۴) ہمیشہ خوش رہنا عقلمندی کی نشانی ہے۔

بہن کا خط بھائی کے نام

(مرقومہ پروفیسر مشتاق احمد زاہدی۔بی۔اے)

بھائی جان۔آپ نے اپنے خیالات کا جو اظہار اپنے محبت بھرے خط میں کیا ہے میں بحیثیت ماں جائی ہونے کے کچھ کہہ نہیں سکتی۔مگر آپ کے بہنوئی وہ خط پڑھ کے بہت بر ہم ہوئے اور کہنے لگے کہ ظالم ظلم کو روا کہنے کے لئے ایسی ہی دلائل پیش کرتا ہے جیسی شیطان بُرائی کا کام کرتے وقت" جب چور چوری کرتا ہے تو وہ اپنے دلیں نادم نہیں ہوتا۔بلکہ یوں کہتا ہے کہ اگر میں چوری نہ کروں تو میرے ننھے ننھے بچے بھوکے مرجائیں میرے باپ دادا کے نام پر دھبا آئے۔میری برادری میں میری آبرو نہ رہے خدا مرنے کے بعد مجھہ سے دریافت کرے گا کہ تو نے اپنے بچوں کو کیوں بھوکا مرنے دیا۔اور جس پیشے میں ہمنے تجھے اتارا تھا اس میں کیوں نہ رہا۔غرضکہ وہ اپنی چوری کرنے کو روا کرنے کے ثبوت میں وہ وہ دلائل لائے گا کہ سقراط کو مات کرے گا۔میری طرف سے آپ اپنے بہائیصاحب سے پوچھیئے گا کہ آپ کی یہ دلیل تو صحیح ہے کہ پولیس یا قانون کا قائم رکھنا شریفوں کو چور سمجھنا نہیں ہے لیکن شریف اگر چوری کرنے لگیں تو پولیس انکو بخشنے والی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ پردہ وہ کام نہیں دیتا جو پولیس دیتی ہے پولیس انسداد جرائم کے لیئے ہے اور خواہ کوئی چور ہو یا نہو حفظ ما تقدم ضروری ہے۔آپ کے بہائیصاحب پردے کو حفظ ما تقدم بتاتے ہیں۔لیکن یہہ کس قانون نے انکو اجازت دیدی کہ اس حفظ ما تقدم میں عورتوں کو قید کردیا

جائے۔کیوں نہ یہ حفظ ماتقدم مردوں کے ساتھ کیا جائے جسطرح عورتوں کے بدچلن ہونے کا ڈر ہے اسیطرح مردوں کے بدچلن ہونے کا خطرہ ہے دونوں اجناس میں سے ایک کو قید کردیا جائے۔ آپ کے بہائیصاحب عورتوں کو قید کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مردوں کو پردے میں بٹھانا چاہیئے"

کیا عورتوں کو پردے میں بٹھانے سے مرد اپنی بد ذاتی سے باز آئے عورتوں کے پاؤں میں زنجیر پڑگئی مگر مرد تو اُن کے پاس پہنچ سکتے ہیں اور پہنچتے ہیں خواہ عورتوں کا لباس پہنکر اور ڈولی میں بیٹھکر کیوں نہ جانا پڑے

چور کو سزا دی نہیں جاتی اُلٹی اُس شخص کو سزا ہوتی ہے جس کے ہاں چوری ہوئی ہو کہ تو نے کیوں اپنے مال پر قفل مضبوط نہیں لگایا۔ شہر والوں کے لیے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ اپنا مال و اسباب مقفل کر کے رکھدیں نہ کچھ پہنیں نہ کچھ برتیں ننگے پہریں اور بہوکے مریں اسوجہ سے کہ شہر میں چور ہیں چوروں کو نہیں روکا جاتا۔ وہ دترانہ شہر میں لوٹ مار کرتے پھریں۔

مرد عورتوں کو بہکائیں دہوکا دیں اور پھر خود ہی عورتوں پر فتوے دیا کہ انکو پردے میں رکھا جائے اور مرد مزے اُڑاتے پہریں کیونکہ وہ مرد ہیں چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد دکھائیں اور بہکائیں

اگر عورتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنی خوبصورتی سے مردوں کو لبہاتی ہیں اور اشتعال طبع دلاتی ہیں اس لیے انکو مردوں کی نظر سے دور رکھنا چاہیئے تو معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ عورت نما غیر جنس کو بھی پردے میں بٹھانا چاہیئے۔ کمسن لڑکے کم سے کم سولہ برس کی عمر تک پردے میں بٹھائے جانے چاہئیں۔ آپکے بہائیصاحب اس کے جواب میں شاید یہ کہیں گے کہ اگر لڑکوں کو پردے میں بٹھایا جائے گا تو وہ کمزور

ہو جائیں گے۔ اُنکی صحت خراب ہو جاوے گی وہ دنیا کے کاروبار کے لائق نہ رہیں گے یہ اُنکا فرمانا بجا۔ لیکن خواہ وہ کمزور ہوں۔ بیمار ہوں یا مرجائیں لیکن چونکہ ان کی عصمت بچانی سوسائٹی کا پہلا فرض ہے اس لئے اُن کی کسی تکلیف کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ انکو فوراً چوڑیاں پہنا کر عورتوں کے ساتھ پردے میں داخل کر دینا چاہیئے۔ آپ کے بھائی صاحب اس خیال پر بہت ہنسیں گے اور مجھے باولا کہیں گے اور کہیں گے یہ کسطرح ممکن ہے کسطرح آزاد دنیا ان عورتوں کو پردے میں رکھنے والوں پر ہنستی ہے انکو باولا کہتی ہے اور ان پر افسوس کرتی ہے کہ یہ اس ایک موہوم خیال کے پیچھے جس کی کامیابی نامعلوم ہے۔ اپنی نصف آبادی کو برباد کر رہے ہیں اور اپنی آیندہ نسلوں کے حق میں کانٹے بو رہے ہیں"

عورت کی عصمت کی محافظ پتھر کی دیواریں یا مرد کی نگہبانی نہیں ہو سکتی اسکی حفاظت صرف عورت کا دل کر سکتا ہے۔

مثل مشہور ہے رہے تو آپ سے . . . . . . اُس مرید تک جادوگر کا قصہ طوطا کہانی میں کس نے نہ پڑا ہوگا جو ہاتھی بنکر ہر وقت اپنی بیوی کو اپنے اوپر لیئے پھرتا تھا اور ایک منٹ کے لیے اپنے سے جدا نہ ہونے دیتا تھا اسپر ہی اُس عورت کے ساتھ جو ہونا تھا سو ہوا۔ پردہ ایک مذموم رسم ہے جسکو عصمت کی حفاظت کے ڈھکوسلے پر قایم کر رکھا ہے"

اُن کا تو پھر لکچر شروع ہوگیا اور خدا جانے کب ختم ہوتا۔ لیکن میں یہ کہکر اُن کے پاس سے اٹھہ گئی کہ تم تو نیچری ہو۔

بھائی آپنے سچ کہا ہے۔ یہ نیچری مرد تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم عورتوں کو تو پردے سے باہر نکال دیں اور خود پردے میں بیٹھہ جائیں۔ ان کا

یہ حال ہے کہ کہیں آنا نہ جانا ہر وقت گھر میں گھسے رہتے ہیں اور مجھے نصیحتیں کرتے رہتے ہیں کہ عورت نے اپنا وقار بہت گھٹا لیا ہے۔ اور مردوں سے بہت دب گئی ہے۔ اور بغیر عورت کے اُٹھے کام نہ چلیگا۔ ورنہ ہم جیسے حقوق نسواں کے حامیوں پر مدعی سُست گواہ چُست کی مثل صادق آتی ہے بہائی جان عورت کی عقل تو گدّی پیچھے بتاتے ہیں مگر میں آپ کے بہنوئی صاحب کی عقل پر حیران ہوں کہ اُن کا مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اُن کا سامنا کروں۔ اُن سے نہ دبوں بازاروں کی سیر کرتی پھروں۔ اور مردوں کی طرح جو میرا جی چاہے کروں۔ یہ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں اگر ایکدن میں اُن کی نصیحت پر نہ عمل کروں تو حضرت خود ہی گھبرا جائیں۔ بہائی جان۔ آپ اُن باتوں سے نہ گھبرا جائیگا۔ انکو یہ ایک مرض ہے سے کہنے دیجے۔ اُن کے کہنے سے ہم پر یا آپ پر کچہ اثر تہوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہم کوئی ... تہوڑا ہی ہیں جو ایسی باتوں میں آجائیں گے۔ جنھوں نے اپنے بچوں کو مذہب چھوڑکر انگریزی تعلیم ہی دینی شروع کر دی۔ ہم نے نہ اُسپر عمل کیا۔ نہ اسپر کریں گے کم سے کم شروع میں تو نہ کریں گے۔ جب دنیا بے پردہ ہو جائیگی۔ اور دوسروں کی عورتیں مردنا ہو جائیں گی تب دیکھا جائے گا۔ اسوقت تک کون جیتا ہے۔ بہائی جان آپ ہراساں نہوں۔ ہمارے جیتے جی تو پردہ اُٹھتا نہیں۔

آپ کی بہن

مال دنیا کا نہیں ہے تو جہاں میں مستحق ہو وہ دولت یا عمارت یا زمیں کا ہر طبق
تجکو آبادی دنیا سے فقط اتنا ملا ہے ترے قد کے برابر اس زمیں میں تنگ احق

(ترجمہ قول حضرت علیؓ) عزیز لکھنوی

اشاعتِ اسلام

چند سال سے بنارس میں ایک انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے منعقد ہوئی ہے جس کے اغراض و مقاصد اسلام کے نمایاں واقعات پر فلسفیانہ نظر ڈالنا اور اون خیالات کی تردید جو اعتراض کی حیثیت سے اسلام پر وارد کیے جاتے ہیں چنانچہ اسکے ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء کو یہ جلسہ نہایت مہتم بالشان طریقے سے بنارس میں منعقد ہوا قریب قریب اکثر طبقہ اور مذہب کے لوگ اس میں شریک تھے آخری جلسہ میں یہ نظم پڑھی گئی جس سے حاضرین میں ایک نہایت جوش و خروش پیدا ہوا

ہے بنارس میکدہ اک رندِ دُردآشام کا دیکھتا ہے صبح تک منظر طلائی جام کا
ہاں یہی تو وقت ہے دورِ مے گلفام کا دوڑتا ہے پھرتا ہے رگ رگ میں لہو اسلام کا

انجمن میں ختم یہ وقتِ طرب انگیز کر
عقل کے دریا ذرا ہاں اپنا دھارا تیز کر

محفلِ ملت میں پیہم دورِ ساغر چاہیئے عقل کہتے ہیں جسے ساقی وہ جوہر چاہیئے
اور ہلکی سی شرابِ خواب آور چاہیئے مجکو روحانی تعقل بندہ پرور چاہیئے

تا کہ دکھلا دوں جہاں کو اون حقائق کا اثر
جنتیں ہوں ذوق و وجداں کی تری پیشِ نظر

کیا یہی شک فلسفہ مغرب کا پڑھکر چاہیئے خونِ فاسد جوش زن ہے ایک نشتر چاہیئے
اب ہدایت کو کوئی اعجاز گستر چاہیئے ہیں پیام اُن کے بہت سے اک پیمبر چاہیئے

کیا فرائض ہیں ہمارے باخبر ہو جائیں ہم
اور دل سے بندۂ پیغام بر ہو جائیں ہم

ہوشیاری ہاں خبر لے اب کہ غفلت ہی ہمیں بے ترے مشکل بہت قطع مسافت ہی ہمیں
دشت غربت میں تری ای خضر حاجت ہے ہمیں عقل کہتی ہی پیمبر کی ضرورت ہے ہمیں

طلعت شب کو ہی خواہش ایک شمع نور کی
ہے کلیم اللہ کو حاجت چراغ طور کی

کیوں الٹتا ہی زمین و آسمان کے تو طبق کیا نہیں واضح ہوا اب تک یہ تحبیر امر حق
دیکھ بتلاتے ہیں یہ تاریخ کے روشن ورق جب لیا ہر قوم نے اپنے پیمبر سے سبق

دین کی عزت ملی دنیا کو بھی حاصل کیا
وسوسے جو ذہن میں آئی اونہیں باطل کیا

کب ہوا اسلام رائج قوت شمشیر سے بلکہ اخلاق حسن سے صلح جو تدبیر سے
موعظت سے پند سی الہام سے تقریر سے نعرہ تہلیل سے آوازہ تکبیر سے

باطنی تہی اک کشش اون کے دل پر جوش میں
جذب روحانی تہا اوکی کوشش خاموش میں

واعظ اسلام کے اخلاق ہیں سب آشکار کافروں سے کیا کیا برتاؤ بعد از کارزار
تھا ہر اک مفتوح کو اوسوقت یہ قول و قرار یا وہ جزیہ دے کرے یا دین احمد اختیار

قوت شمشیر اگر تہی کیوں کیا مختار اونہیں
اختیار جزیہ حضرت نے دیا بیکار اونہیں

تو ہی کہدے منصفانہ ای عرب کی سرزمین سختیاں تجہپر رسول اللہ نے کیا کیا سہیں
ہوگئی جنبش تجہی اور کانپ اٹھا عرش بریں کیسے استقلال سے تجہکو کیا زیر نگین

ذرہ ذرہ کو ترے مہر منور کر دیا
جہولیوں میں تہی جو تیرا اونکو گوہر کر دیا

یہ سمجھ لو ہو بیاں کیا اوسکا خلق دلپذیر جسکا ہر فقرہ ہے اک اخلاق کا گنج خطیر

۴ بادشاہوں کا شہنشہ اور فقیروں کا فقیر + تھا زمانے میں خدا کی سلطنت کا جو سفیر + دل کا ہر جذبہ نگاہوں سے نمایاں ہو گیا + آنکھ بھر کر جسکو دیکھا وہ مسلماں ہو گیا +
(میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی)

مسٹر ابلیس

نمبر (۱)

وہ شیطان علیہ اللعن نہیں جو پرانے زمانہ میں لاحول کے وِردوں سے دُم دبائے گوشہ گوشہ چھپتا پھرتا تھا، جو اکثر منڈے ہوئے سر دراز ریش اور اُٹنگے پائجامہ کے ساتھ تقدس کا روپ بھرے ہوئے مسجد کے ملانوں کے دل میں رات کی روٹی کی فکر پیدا کر کے نمازِ عشا کا خیال بُھلا دیتا تھا: نہیں وہ نہیں۔ بلکہ وہ ابلیس جو نہایت کامیابی اور عیش کے ساتھ گذار رہا تہا، جو ہر سوسائٹی میں بلا روک ٹوک شامل ہوا کرتا تھا اور جو آئے دن نت نئی رنگتیں بدل کر اپنے حلقہ کامیابی اور دائرہ فتح کو بڑھاتا جاتا تھا!

عقل کا فرشتہ کہتا ہے کہ یہ ابلیس ہشتادم ہے: اور ہونا ہی چاہیئے کیونکہ قدرت کا واضع قوانین زمانہ کی رفتار اور ضروریات کو دیکھ کر، کم و بیش ہر صدی میں، ایک نئے ابلیس کے ہاتھ میں عنانِ شیطنت دیتا رہتا ہے!۔ اس کی عمر، اور اس کی صورت؟ کچھ نہیں، اور سب کچھ! وہ اپنی قوت ابلیسی سے۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے لیے تماشبین قدرت کیطرف سے عطا ہونے والی قوت ابلیسی سے۔ اُن ذاحد میں جس صورت، اور جس سن کا چاہے نظر آسکتا ہے!

مسٹر ابلیس نے۔ ابلیس ہشتادم نے جو اپنا نام بغیر مسٹر کے استعمال کئے جانے کو سخت ہتک سمجھتا تھا اپنی توجہ، بیشمار ذریات کیطرف۔ دنیا کے

چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ذریات الشیاطین کیطرف۔ مائل کی، آناً فاناً، آنکھ بند کرتے ہی اُسے اپنی قوت پر تلبیس کی مدد سے۔ ہویوگراف وائرلس ٹیلیگرافی، شعاع نور و برق تاباں، باد صرصر و تخیل دماغی، ان سب سے بدرجہا تیز اور سریع السیر قوت کی مدد سے، معلوم ہوگیا کہ اُس کی ذریات اپنا مشکل کام عقل رکھنے والی انسان کی آنکھ میں اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا دکھانے کا مشکل کام۔ نہایت آسانی کے ساتھ انجام دے رہی ہے!

یہ دیکھ کر اُسے جسقدر فرحت، جسدرجہ مسرت، ہوئی اُس کا اندازہ یا تو وہی بازیچۂ اطفال کا تماشا دیکھنے والے کارپردازان قدرت کر سکتے ہیں یا خود مسٹر ابلیس ملعون کا دل۔ جولانگاہ خباثت دل۔ اچھی طرح جانتا ہوگا!

مسٹر ابلیس کی موجودہ کامیابی مُسلم ہے، اُس کی روز افزوں ترقی تسلیم شدہ، لیکن اس کارخانۂ دنیاوی کے فانی ہونیکا خیال، ایک ناقابل بیان خلش پیدا کرنے والا کانٹا تھا جو رہ رہ کر کھٹکا کرتا تھا! یہ ہی بے چین کرنے والا خیال ہر موقعہ مسرت پر۔ دلم تزویر میں کسی نئے شکار کے پھنس جانے سے پیدا ہونیوالی عارضی مسرت کے موقعہ پر۔ مسٹر ابلیس کے دل و دماغ کے ساتھ، مسکن شیطنت دل و دماغ کے ساتھ، قدرت کے زوردار اور بے پناہ طمانچۂ غیبی کا کام کیا کرتا تھا! اسوقت بھی، خوش ہوتے ہوتے، دفعتاً وہی خیال۔ اس تمام کائنات کے ایک نہ ایک دن درہم و برہم ہو جانے کا خیال۔ مسٹر ابلیس کے نخل مسرت و کامیابی پر بجلی کیطرح گرا، اور وہ چونک پڑا: وہ تھرا گیا، اور وہ کانپ اٹھا!

اس غیر معمولی اور اچانک خلش کا فوری علاج حسب معمول اُس نے سامنے رکھی ہوئی بوتل سے۔ ہاؤس آف لارڈس کے لیبل والی سیاہ بوتل سے

کیا! آتشِ سیال کے ایک کناروں تک بھرے ہوئے گلاس نے اُس کے دفعتہً پژمردہ ہوجانے والے دماغ کو پھر از سرِ نو مشتعل کر کے نمونۂ دوزخ بنادیا اور وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا ” اب تو آرام سے گذرتی ہے! عاقبت کی خبر...... “ بس صرف اسی حرف تک پونہچکر وہ خاموش ہوگیا! کیونکہ وہ اُس کے بعد کا حرف۔ قادرِ مطلق کا نام جسکی ایک صفت قہار بھی ہے اپنی زبان سے نکالنے کی جرآت نہ کرسکتا تھا!

فوراً اُسے کسی خاص کام کا کسی پہلے سے سوچی ہوئی شیطنت کا خیال آیا، وہ کھڑا ہوگیا اور چلنے کی تیاری کرنے لگا! سب سے پہلے اس نے اپنی طوقِ لعنت کو جو آٹھ ہزار برس سے یکے بعد دیگرے ہر فرمانروائے شیطنت کے گلے کا ہار ہوتا آتا ہے نہایت احتیاط کے ساتھ چھپایا، اپنے متقدمین کیطرح اونی گلوبند یا شالی رومال باندھ کر نہیں چھپایا بلکہ چمکدار اسفید براق ڈبل کالر لگا کر چھپایا: پھر سر سے پانوں تک انگریزی لباس پہنا اور نکل کھڑا ہوا! اب وہ ہندوستان کے مشہور شہر...... کے ایک بازار میں جارہا تھا! ایک خوبصورت ہلکی ہلکی کیمرولیٹ جسے ایک سُرنگ عرب اُڑائے لیے جاتا تھا اُس کے پاس سے گذری، اِس میں ایک جوان آدمی اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے اور ہیٹ لگائے راس میں ہاتھ میں لیے نہایت تمکنت کے ساتھ بیٹھا تھا مسٹر ابلیس نے پہلی ہی نظر میں معلوم کر لیا یہ حضرت کوئی جج صاحب تھے؛ لیکن اُس نے کچھ زیادہ التفات نہیں کیا؛ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ اُن حضرت پر ایک دیو خبیث مسٹر ابلیس کی ذریات میں سے ایک خاص پلید پہلے سے ہی مسلط تھا! ایسے مغرور حضرات کو وہ اپنا خاص الخاص، تابعِ قوت پر تلبیس سمجھتا تھا! اگر وہ سے گرد، کوئی بگی میں کوئی گھوڑے پر

کوئی موٹر میں کوئی بائیسکل پر، اس بھرے پُرے شہر کے بازار میں اُس کے پاس سے گذر رہے تھے اور کوئی فرد بشر اُس کی ذریات کے حلقہ تزویر اور دائرہ فریب سے باہر نظر نہیں آتا تھا! اس لیے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود تکلیف گوارا کرتا، اور جو پہلے ہی سے اُس کے ادنے کارپردازانِ شیطنت کے آگے گردن جھکائے ہوئے تھے، اُن پر کوئی سپہ چلاتا! یا اُن کو رام کرنے کی کوشش کرتا!

مسٹر ابلیس سگار کے دُھوئیں سے ہوا میں چھلے بناتا ہوا برابر آگے بڑھے جارہا تھا اور اپنے معائنہ میں - اپنی ذریات کے اہم اور ذمہ داری کے کام کے معائنہ میں مصروف تھا: یہ اُسکا ہمیشہ کا معمول تھا - وہ اسیطرح گشت لگاتا اور جہاں کہیں اپنے ماتحتوں کو - اپنی قوت تلبیسیہ کی عملی مشین کے چلتے پُرزوں کو غلطی کرتے یا کاہلی میں مبتلا، بلکہ یوں کہئیے کہ، غلطی سرزد کرانے میں ناکامیاب یا کاہلی پیدا کرنے میں سست پاتا، تو فوراً اصلاح کر دیتا، ڈانٹ دیتا اور تاکید کر دیتا!!

یوں تو دنیا کا ہر نیک نہاد شخص بالعموم، مسٹر ابلیس کا مد مقابل؛ اور مسٹر ابلیس اُس کے پھلنستے یا آزار دینے کے درپے! لیکن جو بغض اور دشمنی مسٹر ابلیس کو بالخصوص مسلمانوں سے تھی وہ حد سے بھی تجاوز کر گئی تھی؛ اور کیوں نہ تجاوز کر جاتی، جبکہ وہ جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اُس کے متقدمین کو - گذشتہ فرمانفرمایانِ خباثت کو - مع اپنی بیشمار لشکر ذریات کے فاش شکستیں ہوئی تھیں، اور صدیوں تحت الثرےٰ تک بھی گوشہ عافیت و اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا! مگر ایک عرصہ دراز سے وہ اسطرف سے بھی مطمئن تھا: اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو - موجودہ مسلمانوں کو - اُس نے

اور اوس کی ذریات نے، ایک ایسی ناگفتہ بہ حالت تک پہنچا دیا تھا کہ وہ گردن جھکائے، آنکھیں بند کیئے پستی کے غار کیطرف بڑہے جاتے تہے۔!!

اب پھر ایک موٹر مسٹر ابلیس کے برابر سے گذری: اس میں دو تین ھندوستانی عورتیں جلوہ افروز تہیں، جن میں غالبًا دو ہندو، ایک یہودی، اور ایک مسلمان تہی!! یہودی لڑکی بقیہ تین سے عمر میں کم مگر حسن میں بدرجہا زیادہ تہی! یہ موٹر کچھ آگے بڑھکر ایک دوکان کے سامنے رکی اور مسٹر ابلیس بہی فورًا اُس کے پاس پونہچکر ٹہٹک گئے! یہ سب کی سب کچھ سامان دیکھنے بہالنے میں مصروف تھیں، اور تمام راہگیر جو پاس سے گذرتے اُن کے دیکھنے کے لیئے ٹہرتے جاتے تہے!

کیوں ٹہرتے جاتے تھے؟ اس لیے کہ کمسن یہودی لڑکی۔ شعلہ جوالہ تہا برق بلا۔ اپنے تبسم زیرلب سے غنچۂ ناشگفتہ کی تصویر کھینچ رہی تہی: اُس کی سیاہ اور کمر تک پونہچ کر ہوا میں لہرانے والی زلف دراز۔ عمر تسلسل اور لیلۃ القدر اپنے پیچ وتاب سے مرگ سنبل کی خبر دے رہی تہی: اُس کی شوخ اور چمکتی ہوئی آنکھیں، اپنی نگاہوں سے۔ مست اور سرشار نگاہوں سے عقل وہوش کے فرشتہ کو فنافی العشق کا چھلکتا ہوا جام پلا رہی تہیں: اُس کی پیوستہ اور گنجان بہنویں خنجر آبدار وکمان سخت۔ مژگان خمیدہ کی مدد سے چنگل شاہین تقدیر کی مدد سے۔ مرغ تدبیر کا دل نہایت آسانی کے ساتھ اُچک لیتی تہیں! مختصر یہ کہ، وہ کمسن نازنین اپنی خوبصورت ناک سے۔ چشمۂ نور کی موج سے؛ اپنے نازک ہونٹوں سے۔ آب حیوان کے منہ میں پانی بہر لانیوالے ہونٹوں سے؛ اپنے صاف اور سرخ سرخ رخساروں سے۔ رشک وہ حور وغلمان گلاب کی پنکھڑیوں سے؛ اپنی نازک اور تنگ کمر سے بتکلیف دست اندازی شوق کی

زندہ تصویر سے؛ اور سب کے آخر میں مگر سب سے زیادہ۔ اپنے علاج قوت بصارت سے؛ دیکھنے والوں کے دلپر، اور دل سے زیادہ ایمان پر، وہ وہ بجلیاں گرا رہی تھی کہ مسٹر ابلیس خوشی کے مارے آپے سے بے آپے ہوئے جاتے تھے۔ مسٹر ابلیس کو ایک حسین کمسن لڑکی سے جو بے پردگی کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ جو اپنے حسنِ زاہد فریب کے نظارہ سے نوجوان طبیعتوں کے دل میں شعلۂ جہنم مشتعل کر دیتی ہو۔ خواہشاتِ بد اور شرورِ نفس کی بیحد امید تھی! اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ خاندانِ ابلیسیہ کے بانی نے ملعون اوّل نے اپنے انتقام کی آگ کا شکار، ایک عورت ہی کے ذریعہ سے، آدم کو بنایا تھا!

وہ نہایت خوش ہوتا تھا، اُس کی قوتِ تلبیس جوشِ مسرت میں کرۂ نار بنجاتی تھی۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ بے پردگی کی وبا مسلمانوں میں بھی پھیل رہی ہے؛ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اس خنجرِ عصمت کش کے سامنے اِسلام کا طبقۂ نسواں۔ دامِ تزویر اور بدکاری کے جال میں کبھی نہ پھنسنے والا طبقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی راستبازی اور نیک نیتی کے ہتیار ڈال دیگا اور اپنے مردوں کو مسٹر ابلیس کا شکار بنانے میں قوتِ مقناطیسی اور کششِ اجسام کا کام دیگا!!

موٹر چلا اور وہ کیوپڈ کی نورِ نظر یہودی لڑکی جو قامتِ دلنواز میں قیامت سے بھی ایک قدِ آدم زیادہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں کی نظروں سے حسن عالمگیر کی شمع پر گرنے والے انسانی پروانوں کی نظروں سے۔ ہلالِ عید کیطرح غائب ہوگئی؛ مسٹر ابلیس اس حسن گلو سوز کے اثر بد کا اندازہ کرتا ہوا، پردہ کے خیال میں منہمک، اچل نکلا! پردہ اور بے پردگی کا

مقابلہ کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ سب سے پہلے اُسے پردہ کے رواج کی بیخکنی کرنی لازمی ہے! اُس نے طے کرلیا کہ وہ طبقۂ نسوان کے متعلق، اپنی ذریات کی تمام کوششیں پردہ کے برباد کرنے پر عصمت آباد کی مضبوط فصیل کے منہدم کرنے پر۔ لگادیگا، اور ضرور لگادیگا!!

اب وہ ایک کوٹھے کے نیچے سے گذر رہا تھا، اوپر کے کمرے میں سے گانے اور ساز کی آواز آرہی تھی! مسٹر ابلیس نے یہاں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا یہ فرقہ۔ تمام خوبیوں کو خواہشاتِ نفسانی اور مبلغ علیہ السلام پر سے قربان کردینے والا فرقہ، مسٹر ابلیس کا موردِ عنایاتِ خاص تھا! صرف یہہ ہی گروہ تھا جس کے توکل اپنے شیطان پیشہ کا کام۔ غارتگری اور تباہی کا کام۔ سالانہ رپورٹ میں مسٹر ابلیس کی تمام ذریات کے پُرتلبیس کامیابی کے برابر نظر آیا کرتا تھا! وہ آگے بڑھ گیا اور گانے کی۔ قوتِ سامعہ کے ذریعہ سے دل و دماغ کو بندۂ جذباتِ نفس بنانے والے جادو کی سُریلی اور دلکش آواز برابر آتی رہی: فوراً مسٹر ابلیس نے کسی عمدہ شعر پر جو ہوا میں گونج کر اُس کے کان تک پہنچا تھا "مرحبا! آفریں! صد آفریں!!! ابے خبیث کہا۔ شعر نہایت عمدہ تھا؛ اور مسٹر ابلیس اپنی خبث بھری طبیعت اور پُرفن دماغ کے زور سے اس شعر کے ایسے معنی تراشتا تھا جو شعر کے مصنف کو۔ شاعرِ مرحوم کو اگر سنائے جاتے تو غالباً وہ تمام عمر کے لیئے شاعری سے دست کش ہوجاتا!

جو کچھ بھی ہو، مسٹر ابلیس اس شعر کو بیحد پسند کرتا تھا، اور اب جبکہ وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا، جبکہ گانے کی دلکش آواز اُس کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ اُس نے وہی شعر بشوقِ تلبیس اور اشاعتِ الحاد کے جوش میں خود گنگنانا شروع کردیا.....

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن   دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

سلطان حیدر جوشؔ (علیگ)

اِنقلابِ تمدّن

تڑپ، تڑپ، دل بیقرار تڑپ، اور ان صور تو نیر خون کے آنسوؤں سے رو، جنھوں نے، آبادی چھوڑ، جنگل بسائے، گئے اور ایسے داغ دیکر گئے، جو مدۃ العمر تازہ رہیں گے، عمر دنیا کہیں سے کہیں پونہچ جائے مگر آنکی یاد دل سے نہ جائیگی، آینوالا زمانہ ان کے نام آنکھوں سے لگائیگا اور یہ فانی دنیا ان کی ہستی پر فخر کرے گی،

راتیں اور دن، ہیں تو ویسے ہی، مگر! وہ نہیں ہیں، ختم ہو گئے وہ دن، صبح ہو گئیں وہ راتیں، اور مٹ گئے وہ لوگ، غدر ۱۸۵۷ء سے برسوں پہلے کا وقت ہے اور زندہ ہیں وہ صورتیں جن کے قدم سرزمین جہان آباد آنکھوں نے لگا رہی دلی، بگڑ بگڑ کر بنی، اور بن بن کر بگڑی مگر پھر اس خاک سے ویسے لوگ نہ اُٹھے یہ عالیشان محلوں، اور پکی محلسراؤں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کے گھر ہیں تو کچے دھابے اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، مگر پیے سپتے، صاف ستھرے، لیونڈر کا تو انہوں نے نام بھی نہیں سنا مگر چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو انکی سادگی مذاق کا پورا پورا پتہ دے رہی ہے۔ انکے دماغ مغربی ہوا کے جھونکوں سے آشنا نہیں ہیں مگر آنکھیں، کبھی کبھی، ایک آدہ صورت ایسی بھی دیکھ لیتی ہیں، جو انکو ششدر و متحیر بنا دیتی ہے، ان کی صورت ظاہری لباس پوشاک وضع و قطع نہ چندان دلچسپ ہے نہ دلکش، قبہ دار ٹوپیاں۔ چنت دار انگرکھے، کمر میں پٹکے، ہاتھ میں عصا، جیب میں لمبے لمبے رومال، مگر، ان کے باطن پر کائنات کا

ہر ذرّہ درود پڑھ رہا ہے، یہ وہ لوگ ہیں پابندی وضع جن کی گھٹی میں پڑی تھی ہمدردی کے دودھ سے پلے، اور خلوص کے آغوش میں بڑھے، اپنے تعلقات پر، قولاً و فعلاً، ایسے پھول برسا گئے، جن کی خوشبو سے آجتک زمانہ مہک رہا ہے۔

یہ بھولی بھالی صورتیں، یہ سیدھے سادھے لوگ، جنھوں نے نمک کو، لون، اور چاقو، کو چکوا کہا، چندر روز کے مہمان ہیں، کان، انکی آواز کو، آنکھیں ان کی صورتوں، اور دل، ان کی، باتوں کو ترسیں گے ملکہ مغرب کی سواری کا غلغلہ بلند ہو چکا، یہ وہ سیمتن ہے جس کے آگے زاہد صد سالہ سجدے کریں گے، اسکی ادائیں متقیوں کے دل بھی لوٹ پوٹ کردیں گی، انکی باتیں سنلو اور صورتیں دیکھ لو، پھر یہ کہاں اور تم کہاں، دیکھنا! دیکھنا! یہ پانچ برس کے دو چھوٹے ہوئے دوست ملے ہیں، سنو، سنو، ان کی باتیں سنو، اور یاد رکھو کہ محبت کا سکہ ان ہی کے دم تک اقلیم انسانیت میں چل رہا ہے، آگیا ہے وہ وقت، کہ مغرب کا دست شفقت اس تمدّن پر پانی پھیر دے۔

ہائیں! خلیفہ بندو؟ ارے بھائی کلیجہ سے تو لگ جا، صورت دیکھے مدتوں ہو گئے، سنبھلے احمد بیگ کیا مرے وہ طبقہ ہی الٹ گیا، میاں بوی دی کالے کوسوں حیدرآباد پہنچے، سمندی کو، چچا امیر بیگ کی نظر کھا گئی، ہائے، بندو کیا کڑیل جوان اٹھا ہے، دھیان آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے، آ بھائی ایک دفعہ اور مل، جی نہیں بھرا، ارے سنتے ہے ایک پانچ ہی برس میں ڈاڑھی بگلہ کا پر ہو گئی، وہ ڈنر قبضے کچھ بھی نہ،

بندو۔ آؤ میاں یوسف آڑے! اجی سے نہیں کہتے کہ میں ہوں آڑے

تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ شہر کے شہر میں ہو اور اتنی خبر نہیں کہ بودی کو مرے تیسرا مہینہ ہونے آیا بیچارے کی ہڈیاں بھی گلکر خاک ہو گئی ہونگی کوئی ایسا ہی نصیبے کا دلی ہوگا جو دکن جاکر جیتا جاگتا پلٹا ہو تین کی سناونیاں تو ہم سن چکے ہیں بودی کا بڑا لڑکا تو تمہیں یاد ہوگا اُس نے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ سر اوٹھایا ہے کہ ماکو ناک چنے چبوا دیئے۔ دو ڈھائی آنے روز فقط چھٹے مٹھونکو چاہیں وہ بیچاری مرکر صبح سے شام تک تین ساڑھے تین آنہ کی مزدوری کرکے اوس کا بھرنا بھرتی ہے۔ پرسوں پیسہ پاس نہیں تھا اسوقت کا جو نکلا ہوا ہے تو اب تک نہیں پلٹا سڑنوں کی طرح روتی پھرتی ہے۔ صبح نماز دم دیکھتا کیا ہوں کہ کنڈی کھٹکھٹا رہی ہے میرا دل بھی دھکڑ دھکڑ کرنے لگا کہ یہ گھڑ دم خدا خیر کرے۔ اسکو گھر میں بٹھا کر جو نکلا ہوں تو یہ وقت ہو گیا۔ پہاڑ گنج۔ تیلی واڑہ۔ صدر باڑہ شہر بھر چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلتا صبح سے نہار منہ ہوں اب کہاں ڈھونڈوں لوٹ کے جاتا ہوں تو خرابی اس بیچاری کو کیا منہ دکھاؤں گا اب یہ سنتا ہوں کہ بدر پور گیا سو بھائی وہاں جا رہا ہوں چھ کوس کی منزل ہے اور جھٹ پٹا ہو گیا۔ چلتے ہاتھ پاؤں ہیں جو کام ہو جائے اچھا پر تو انکو کیڑے بھی نہیں کھائیں گے خدا دیکھتا ہے جو محبت بودی کے جیتے جی اُسکی اولاد سے تھی آج کے دم تک اسمیں فرق نہیں آیا میاں رشتہ نہیں ناطہ نہیں مگر برابر کا یار تھا اسکی بیوی دہاڑوں روئے اور ہم چپکے بیٹھے سیر دیکھیں۔ تم سے ملکر جی خوش ہو گیا اب تو جانے دو اللہ چاہے صبح ہی آؤں گا+

یہ ہیں وہ دل، جو حاضر و غائب ایک، اور ظاہر و باطن یکساں، اِس

جہالت پر علم سو دفعہ تصدق، اور ایسی، بدتہذیبی پر، تہذیب، ہزار بار قربان، مرے ہوئے دوست کی تصویر، جبتک زندہ رہے آنکھ کے سامنے رہے اپنا سکھ چین عیش آرام اس کے بچوں پر نثار کر دیا، کیا لوگ تھے کہ رانڈوں اور یتیموں کو وارثوں کی موت بھلادی مر گئے مگر وضع کو ہاتھ سے نہ دیا جس جتنا ال سے آخر وقت تک نباہ گئے، بیوقوف تھے یا جاہل جیسے بھی تھے اور جو کچھ بھی تھے۔ ایسے تھے، کہ یہ آسمان جو مدتوں ان کے سر پر چھایا رہا، آج حسرت سے انکی قبر و نیر رو رہا ہے، اور یہ زمین جو انکو کلیجہ سے لگائے پڑی ہے، بآواز بلند یہ صدا دے رہی ہے کہ مادرِ گیتی کے پیارو، تمھارے بعد تم جیسی صورتیں نظر نہ آئیں +

بندو اور آرٹ کی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہوگئے زمانہ سرعت کے پروں سے اُڑا چلا جا رہا ہے، اور آناً فاناً نئے نئے انقلاب برپا ہو رہے ہیں مگر بسا غنیمت ہے یہ وقت بھی، کہ شرافت کے جوہر ہندوستانی تمدن میں اسی آب و تاب سے چمک دمک رہے ہیں۔

ملکہ مغرب کا جہاز وسطِ سمندر میں اٹکھیلیاں کرتا چلا آرہا ہے اور مشرق اس شاہانہ جلوس کے انتظار میں چشم براہ ہے، دور کے ڈھول کے سہاونے، بچہ بچہ نئے مہمان کے آنے کی تیاریاں کر رہا ہے، مگر فلک پیر جس نے سیکڑوں قومیں اور بیسیوں ملک تباہ و برباد کر ڈالے، ان کی ناتجربہ کاری پر ٹھٹھے مار رہا ہے اسکی دوربیں نگاہیں تاڑ چکی ہیں، کہ مشرق آج جسکو ہنر سمجھ رہا ہے ایک سو ہی برس کے الٹ پھیر میں مغرب کی صحبت اس ہنر کو عیب اس فخر کو ذلت اور اس وضعداری کو بیہودگی بنا دے گی +

وہی دن ہیں اور وہی لوگ، مگر کیسے ؟ وہ جو محبت کا خاتمہ اپنے ساتھ کر جائیں گے، اور زمانہ جن کا خلوص قیامت تک نہ بھول سکیگا.

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا! کرتہ میں تو گھنڈی تکمہ ہی ہے مگر اس جلتے بھلتے وقت میں کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے سر پر بوجھ ڈھوئے چلے آرہے ہیں، ان کی صورت دیکھ کر ہنسو مت. ان کے گن دیکھو اور پھر کہو کہ یہ کیسی صورتیں ہیں،

غریب تین چار آنہ روز کا مزدور ہے مگر پڑھنے والوں کا کلیجہ کٹنے لگیگا جب یہ سنیں گے کہ اپنی مزدوری چھوڑ کر، یہ گٹھری اُس بیوہ کے جو ہیں جس کے سر پر کوئی وارث نہیں، جو صبح سے بھوکی بیٹھی تھی جو اس تک رہی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مجھے جو لادے تو پیس کر اپنا اور اپنے ننھے ننھے یتیم بچوں کا پیٹ بھر لوں.

ذرا ان کا جواب بھی تو سن لو جب انہوں نے آواز دی ہے لو بہن اپنے جو لے جاؤ تو وہ بھوکی پیاسی جو صبح سے اللہ اللہ کر رہی تھی اٹھکر دروازہ پر آئی اسکی آنکھیں دعائیں دے رہی تھیں مگر جب اس نے زبان سے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے احسان کی کیا بات ہے

"حق ہمسایہ کا جاپہ"

بیچارے مغربی ملکہ آپ نہیں اُس وقت کو گذرے مدتیں ہوگئیں. انیسویں صدی کے دس برس نکل گئے آٹھے اور بڑے میاں جیسی صورتیں کبھی کی چھپ چکیں، آج مغربی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہے. مگر چشم بینا سے دیکھنے والو. انصاف سے کہنا، دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا.

مشرق اپنے جوہر مغرب پر قربان کر چکا اور آج وہ نازک وقت ہے کہ سوسائٹی ان بہتر کی صورتوں کو انسانیت سے خارج بتا رہی ہے لیکن، فانی اور فانی دنیا کا ہر ذرہ یہ صدا دے رہا ہے کہ زمانہ کتنی ہی ترقی کر جائے مگر وہ بھولی بھولی اور پیاری پیاری صورتیں اب آنکھوں کو دیکھنی نصیب نہ ہوں گی۔ راشد الخیری۔

نوحہ

(ماخوذ از نظم انگریزی مطبوعہ دی اسٹوڈنٹ اڈنبرا)

اے دوست دم میں راکھہ کا تو ڈھیر ہوگیا ۔ افسوس قہر ہوگیا اندھیر ہوگیا
رخشندہ تجہہ میں اب شرر زندگی نہیں ۔ وہ آب و تاب اور وہ تابندگی نہیں
سوز درِ دل نے پہونکدیا تجہہ کو لا کلام ۔ یہ رنج کی جگہہ ہے ۔ یہ عبرت کا ہی مقام ۔
بے حس پڑی ہے خاک تری میرے سامنے ۔ چھائی ہے مُردنی رخِ تابندہ پر ترے
اب سرد و گرم دہر کا تجہہ پر اثر نہیں ۔ افسوس میرے حال کی تجہہ کو خبر نہیں ۔
تو مایہ سکونِ دلِ بے قرار تھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ تو ہی مرا غمگسار تھا
نعم البدل بتا کہ کہاں تیرا پاؤں میں ۔ اب ڈہونڈھکر کہاں سے بھلا تجھکو لاؤں میں
آزاد قید خانہ ہستی سے کیا ہوا ۔ تو میرے درد دل کی طرح لاپتا ہوا
لذت پذیر ہمنفسی لب نہیں رہے ۔ جو لطف تجہہ سے دلکو تہے وہ اب نہیں رہے

فرقت میں تیری کسکو کروں دل سے پیار ہائے
انمول و بے بہا تھا تو میرے سگار ہائے

محمد یوسف ال ایس ٹی بی اے

غزل

لطف کی آنکھوں نے کیا دیکھا ۔ ہائے کسی مصرف کا نہ رکھا
آنکھہ ہے اور دیدار کی حسرت ۔ دل ہے اور سودائے تمنّا
آجتک آنکھیں ڈہونڈھ رہی ہیں ۔ ہائے! وہ پیارا پیارا جلوہ
رسم نہ کرنا ٹھیک نہیں ہے ۔ دیکھہ ستا کر کچھہ نہ ملے گا
آہ! ترے اندازِ تغافل ۔ کاش مجھی کو صبر آجاتا

دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے — آنکھ اوٹھا کر دیکھ نہ لینا
شکوۂ غفلت کس سے کیجے — حرفِ شکایت کون سنیگا
زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے — کاش! ترا ارمان نہوتا۔
صبر کبھی آیا ہے نہ آئے — حسبِ عادت بھول نہ جاتا
آہ ہماری ناؤ کی حالت — موجیں حائل طوفاں برپا

آزاد! آپ اور قیدِ علائق
مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولےٰ

حضرت آزاد۔ سہارنپوری

بیاضِ ارشد ۔ مولوی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی وکیل بھوپال کی ابتدائی مشقِ سخن کا مجموعہ جو حضرت قیصر ایڈیٹر الحجاب بھوپال نے تیار کیا ہے

حضرت ارشد کا نام ادبی دنیا میں نیا نہیں ہے ان کے کلام سے اردو کے اکثر مشہور رسالے مستفید ہو رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ بیاض ملک و قوم میں وقعت سے دیکھی جائیگی اور شائقینِ سخن حضرت ارشد کی اس محنت کی دل کھول کر داد دیں گے +

کاغذ لکھائی چھپائی خاصی قیمت درج نہیں غالباً ارشد صاحب سے مل سکتی ہے۔

تعلیم و تربیت

تمدنی مسائل میں تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے جس کے متعلق زبان و قلم نے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے تاہم ہندوستان میں اوس کا اثر جیسا چاہیے ویسا نہیں ہوا۔ حامیان تعلیم جو عبارت ہے والدین یا اون سرپرست طلبا ر جنھیں تعلیم کے باب میں غور و فکر کا حق حاصل ہے اونہیں محسوس کرنا چاہئے کہ اسں باب میں اون سے متعلق طلبار کے اون پر کیا حقوق ہیں اوؔ یہ ریمارک محض اون والدین پر ہے جو اپنے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ علم کے اصلی ذائقہ کا ذوق شناس بنانا چاہتے ہیں۔ جن ماں باپوں کے خیالات یہ ہیں کہ اون کی اولاد ایک اعلیٰ نمونہ اون کے خاندان کے لیئے بنے ۔ اون کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کی تعلیم اور بچوں کے اخلاق عادات کا امتحان لیا کریں بچپن ہی سے بچوں کا نشو و نما اور اون کا اُٹھان اون کی نظر میں رہے۔ اور اون کی کسی غلطی پر گرفت کا موقع اونہیں ڈھونڈھنا نہ پڑے۔ بلکہ خود بخود اپنے سامنے آجائے غالبا کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ والدین اپنے بچوں کے ہر فعل کے ذمہ دار رہیں اور اون کا سچا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کا چال چلن بچپن میں ایسا عمدہ بنا دیں کہ مرتے وقت تک اون کے بچے اوسپر قایم رہیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اون کی صحت کا بھی خیال رکھیں اور ساتھ ہی اون کے دلوں میں بخوبی اسبات کو بٹھا دیویں کہ وہ صرف والدین کی اطاعت کے واسطے ہی نہیں ہیں بلکہ اون پر خاص و عام کے حقوق اور ملک کی

ذمہ داریاں ہی ہیں جنکا سامنا اونکو اپنی آیندہ زندگی میں کرنا پڑے گا۔ ان سب کے بعد بچے خود اس امر کے جوابدہ ہوں گے کہ لاپروائی یا اعتنائی قلب سے وہ اپنے فرائض متعلقہ کو ادا کر رہے ہیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو تین چار سال کی عمر میں ناسمجھ اور ناقابل تعلیم و تربیت سمجھکر ادن کی تعلیم و تربیت کی طرف سے لاپروائی کرتے ہیں۔ مگر یہ بات قابل افسوس ہے کیونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اسبات کا مشاہدہ نہیں کرتے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی تعلیم خود شروع کر دیتا ہے۔ اور ماں باپ کی نظر اور آواز کا لہجہ ہر ایک شئے اوسکو اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔ جو اوس کے آیندہ زندگی پر بہت بڑا اثر پیدا کرتی ہے دیکھو عقلمند جاپانی مائیں اسبات کو محسوس کرتی ہیں اور بچہ پیدا ہوتے ہی اوس کی تعلیم و تربیت شروع کر دیتی ہیں۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کی جاہل مائیں اسبات سے بالکل بے خبر اور لاپروا ہیں۔ اور جب کبھی تعلیم کا ذکر آتا ہی تو کہتی ہیں۔ کہ چشم بد دور ابھی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھ لکھ لیں گے جلدی کیا ہے خدا عمر تو دے۔ اور جب صاحبزادے خدا خدا کر کے آٹھ دس برس کے ہوئے تو میاں جی نوکر ہوئے اور بچہ کی تعلیم بعد ادائے قاعدہ سے شروع ہوئی۔

اسیطرح شروع سے جو چال چلن بچہ کا ہوگیا۔ ہوگیا۔ خواہ اچھا ہو یا برا ہو جس افتاد پہ عہد ہ سے عمدہ صحبت بھی اپنا خاطر خواہ اثر نہیں جما سکتی والدین کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کی قابلیت کو سمجھیں اور دیکھیں کہ اونکو کس مضمون سے زیادہ رغبت ہے۔ اور کس مضمون میں وہ ترقی کرنے کے قابل ہیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ صحبت بھی چال چلن پر بہت بڑا اثر

کرتی ہے۔ اس لیئے اونہیں بُری صحبت سے بچاویں۔ ہم تین چار سال کے عمر تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ماکو قرار دیتے ہیں کیونکہ اس وقت کا چال چلن دیر پا ایسا نقش ہو جاتا ہے کہ بغیر تبدیلی کے ہمیشہ قایم رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ماں بچہ کے جذبات کو اعتدال پر رکھتی ہے اوسکی بھوک کو روکتی ہے اوس کی خواہش کو درست کرتی ہے۔ اور اوس کے دلپر قابو حاصل کرتی ہے اور ایک نہایت عمدہ اورنیک چال چلن والا لڑکا بنا دیتی ہی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام استاد کا ہے اور اس کا جوابدہ استاد کو ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بالکل صحیح نہیں کیونکہ بچہ کی نگہداشت صرف تھوڑے عرصے کے لیے استاد کے ذمہ کر دی جاتی ہے۔ جب لڑکا اسکول جاتا ہے۔ اور جب وہاں نئے لوگوں سے ملتا ہے۔ نئی سوسائٹی میں شریک ہوتا ہے۔ تو والدین کے فرائض کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ والدین کو بچوں کی تعلیم صرف اسکول ماسٹر پر ہی نہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ اور اسکول بھیجکر اپنے تئیں ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھنا چاہیئے۔

اونکو یہہ بھی چاہیئے کہ بچوں کے سامنے اون کے استادوں کو بُرا نہ کہیں۔ بلکہ بچوں کو ہدایت کریں کہ استاد سے اور اپنے ہم جماعتوں سے محبت کریں۔ اور ہر ایک کو اوس کے مرتبہ کے موافق سمجھیں اگر بچہ میں انتظام کی قابلیت ہے تو وہ اسکول کے انتظام کے قایم رکھنے میں استاد کا ہاتھ بٹا دے گا۔ لیکن اگر انتظام کی قابلیت نہیں ہے تو اسکول میں بدانتظامی ہوگی۔ اسوجہ سے یہہ کہا جاتا ہے کہ والدین اور استاد دونوں کو بچوں کی ذہنی اور عمل تعلیم میں اجتماعی

کوشش صرف کرنی چاہیئے بعض والدین اکثر استادوں کی تعلیم و تربیت کی شکایت کرتے ہیں اور ایک معنے کرکے اوستادوں کی ناقابلیت کا پہلو دکھلاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے بچوں کی عملی کاروائیوں کا لحاظ نہیں کرتے جو استاد کی چشم حفاظت سے علحدہ ہوکر طرح طرح کی اخلاقی گستاخیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جن کی نگہداشت کا پورا بار والدین پر اور درصورت اون کے بورڈر ہونے کے نگراں بورڈنگ پر ہے۔ جسکا زہریلا اثر ایک بورڈر سے دوسرے بورڈر تک پہونچنا لازمی ہے۔ خانگی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ لڑکوں کے دلونکو علم کیطرف مائل کرنا چاہیے۔ جو ایک شفیق اور عقلمند ماں کا فریضہ ہے اکثر والدین خصوصاً ماں محبت مادری کے جوش سے بچوں کو گھر میں بٹھالیتی ہیں اون کو ایسا نہ کرنا چاہیئے اور روزانہ اسکول بھیجنا چاہیے جب اسکول میں تعطیل ہوجائے تو بچوں کو اخبارات اور کتابوں کا مطالعہ عام لکچروں میں شریک ہونے دلچسپ مباحثے اور اسیطرح دوسرے طریقوں سے والدین کو چاہیئے کہ اون کے معلومات کا دائرہ وسیع کرنے کی طرف اونہیں راغب کریں اور اون کے دلوں میں مطالعہ کا شوق علم کا اصلی مذاق پیدا کریں۔ اون کو چاہیئے کہ وہ خود بھی علم سے محبت کریں اور اوس میں خوشی محسوس کریں اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو کس طرح اپنے بچوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ کریں گے۔ کیونکہ جب اون کے بچے علم سے بے بہرہ ہوں گے اور اونکو علم سے دلچسپی مذاق نہوگا۔ اوسمیں اونہیں مسرت حاصل نہوگی تو وہ ذلیل سوسائٹی میں پائے جائیں گے جو کہ بُرے کاموں کا مخزن ہے اور بُرے کاموں کی طرف

ضمیرہ

گذشتہ سے پیوستہ

سو پچاس نہیں تو دو ایک صورتیں آج بھی ایسی موجود ہیں جن کی آنکھوں نے ضمیرہ کو دیکھا اور اوس وقت دیکھا جب مرض محبت اور خلوص کی بیماری اسکو شروع ہو چکی تھی پیہم صدمات اور متواتر تفکرات نے برسوں کا بیمار بنا دیا تھا لیکن قدرت کا وہ انعام جو حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے اسوقت بھی دور دور اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

یہ حسن کی دیوی پیکر انسانی میں آسمانی حور جسکی صورت پر نور اور باتوں سے پھول برستے تھے صدمہ فراق کی زیادہ تاب نہ لاسکی برسات کے موسم میں کالی بھنور راتیں سر پر ہوتیں بجلی چمکتی بادل گرجتا اور وہ ضمیرہ جو دن ہاڑی اکیلے کمرہ میں جاتے ڈرتی تن تنہا چھت پر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رات گذار دیتی۔ مور جنگھارتے پپیہا بولتا۔ ٹیڑی الاپتی اور ضمیرہ کا دل مجروح چچازاد بھائی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر صبح کر دیتا۔ آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑیاں لگاتیں کلیجہ ہاتھوں اچھلتا اور خیالات اُن اُن مقامات تک پونہچا دیتے جہاں کبھی امید کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار دکھائی دیتے اور کبھی ان پر اوس پڑ جاتی رات دن تفکرات کے دریا میں غوطہ کھاتی ڈوبتی اور ابھرتی بیٹھتی اور نکلتی۔ چچا کا گھر جلنا نہ تھا۔ جہاں فراق احسن کی زبردست زنجیریں اس کے پاؤں میں تھیں۔ جو دم بھر اکنے کی اجازت نہ دیتیں۔

(۶)

آسمان نے کروٹیں لیں، زمین نے موسم پلٹے! برسات گذر کر گلابی جاڑا آپہونچا تھا۔ کہ ضمیرہ کو واپسی کا حکم پہونچا۔ وہ چہرہ جس پر مردنی چھائی تھی سنتے ہی کھل گیا اور وہ دل جس کی آرزوئیں مر چکی تھیں اوچھل پڑا جسکی انتہائے کامیابی صرف اس بھائی کی صورت دیکھ لینی تھی جو مدتوں ساتھ کھیلا اور جسکو بچھڑے اب برسوں ہوگئے تھے اس کی حالت اسوقت دیکھنے کے قابل تھی جھٹ پٹا وقت ہوگا کہ ضمیرہ کی گاڑی مکان کے پاس پہونچی چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر وہ صورت نظر آئی اس بدنصیب کو کیا معلوم کہ آج سنگدل باپ اسکی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیگا اتری اندر گئی اور بیٹھی ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ باپ کے یہہ الفاظ اس کے کان میں پہونچے صبحکو تمھارا نکاح اسلم سے ہے۔

ہا یہہ پیروں میں سنسنی اور تمام بدن میں یہ سنتے ہی ایک سناٹا آگیا، باپ کا نادر شاہی حکم جس نے زندہ کو مردہ بنا دیا ضمیرہ بدنصیب کی آئندہ زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی کے پچھلے ورق میں کبھی کبھی کامیابی کی طرف امید دکھائی دے جاتا تھا لیکن اسوقت تھوڑی یا بہت جتنی بھی امیدیں تھیں وہ خاک میں مل گئیں آنکھیں نیچی تھیں اور سنگدل باپ کی تجویز پیش نظر۔ گھنٹوں اسیطرح ساکت بیٹھی رہی۔ باپ چلا گیا گھر والے پڑ کر سو گئے تو وہ حسرت نصیب دل جس پر چرکے پہ چرکے لگ رہے تھے قابو میں نہ رہا آنے والی مصیبتوں کا یقین۔ احسن جیسے رفیق کی مفارقت زندگی جیسی نعمت کی بربادی اور باپ جیسے شفیق کی بیدردی۔ تیر تھے کہ کلیجے پر برس رہے تھے۔ گاؤں سے چلی تو یہ امید لے کر چلی۔ گاڑی سے

اتری تو یہ یقین لے کر اتری کہ کان جس کی باتوں کو ترس رہے ہیں آنکھیں اسکی صورت دیکھیں گی آپ جسکی ہمدردی کی محتاج ہے دل اسکی عنایت سے بشاش ہوگا۔ مگر منزل مقصود پر پہونچی تو نہ وہ مدعا تھا نہ غرض۔ نا اُمیدی کا دریا زور شور سے لہریں لے رہا تھا اور مایوسی کے ابر جھوم جھوم کر برس رہے تھے کیسی قیامت خیز رات تھی جس نے بھولی ضمیرہ کو کسی کروٹ چین نہ دیا وہ جانتی تھی کہ صبح کی اذان میری موت کا پیغام لارہی ہے خدا دشمن پر بھی یہ مصیبت نہ ڈالے جو مجھپر آکر پڑی۔ ماں سرپر ہوتی تو اس صدمہ کا سامنا نہ ہوتا ان بیسیوں رشتہ داروں میں جو اباجان کی زندگی میں صدقے اور واری جاتے تھے ایک بھی ایسا نہیں جو اسوقت میرا ساتھ دے اور اس مصیبت سے بچائے اباجان اپنی عقل کے ناخن لیں۔ میں اُس ماں کی بیٹی ہوں جس نے اپنی ضد پر آکر بیس ہزار کی جائداد کو آگ لگادی اور سگے بھائی کی مرتے مرتے صورت نہ دیکھی اسلم کی تو مجال کیا ہے کہ میرا آنچل دیکھ لے اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین پر اس طرح قربان ہوں کہ سننے والے واہ واہ اور دیکھنے والے آہ آہ کریں۔ مگر جب مرنا ہی ٹھیرا تو گمنامی کی موت کیوں مروں اس طرح مروں کہ میری موت دوسروں کے واسطے عبرت اور ماباپوں کے لیے ایک نصیحت ہو۔

اتنا کہکر ضمیرہ نے قلم ہاتھ میں لیکر اسطرح لکھنا شروع کیا،

"اس بدنصیب بیٹی کی طرف سے جواب چند گھنٹوں کی مہمان ہے باپ کو آخری سلام"

اس دنیا میں جس کی بہار مجھے دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بیٹیاں بہت سی ہوئیں اور بھسم ہو کر مریں ہیں اور رہ رہ کر مریں گی ہونگی اور بس بس کر اجڑینگی

فرمانبردار اور نافرمان رحمدل اور کٹر۔ غرض دنیا ہر قسم کی بیٹیوں سے بھری رہی بھری ہے اور بھری رہے گی مگر وہ بیٹی نافرمان نہیں جس نے اف نہ کی۔ تیوری پر بل نہ لائی۔ نگاہ اونچی نہ کی اور ایک نہ دو سات بلکہ آٹھ سال اس گھر میں بسر کر دیے جہاں زندگی کا ہر لمحہ مصیبت تھا جہاں تن ڈھانکنے کو چیتھڑا اور پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نصیب نہ ہوا مصیبتیں جھیلیں دکھ بھگتے ایذائیں سہیں اور آفتیں اٹھائیں سگے چچا کے گھر میں چھ مہینے کے روزے نون کی کنکری سے کھولے مگر یہ آسمان جس کے نیچے بیٹھی ہوں اسکا خالق شاہد ہے اس بات کا کہ یاسی کو سہی۔ روکھی سوکھی جو میسر آئی شکر کیا اور کھالی۔ سامنے ہے وہ اصلی گھر جہاں میں نامراد ملی اور قریب ہے وہ وقت جب دونوں چچا اور چچی ایک سچے حاکم کے سامنے اسبات کے جواب دہ ہوں گے کہ انہوں نے مہمان بھتیجی کو لونڈیوں سے بدتر رکھا +

دیکھتی ہوں سمجھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ ماباپوں کی بیٹیاں فاقے کرتے کرتے مرجاتی ہیں۔ مگر حرف شکایت زبان پر نہیں آتا میرے علم میں بھی ہیں ایسی بدنصیب بچیاں اور مظلوم بیٹیاں کہ کائنات کی ہر شے اور زندگی کا ہر سانس ان کے واسطے مصیبت تھا لیکن دنیا کا ہر ذرہ جو کبھی انکا جانی دشمن تھا آج ان کے صبر و استقلال کی داد دے رہا ہے یہ ساکت ماہتاب اور منتشر تارے چمک چمک کر اور دمک دمک کر اس مصیبت بھری دنیا کی ان بسنے والی روحوں پر ناز کر رہے ہیں جنھوں نے جان دی مگر جوہر شرافت ہاتھ سے نہ دیا۔

میری فرمانبرداری۔ میرے صبر اور میرے استقلال کا یہ بدلا نہ تھا کہ میں

باپ کے ہاتھوں تمام عمر کے واسطے غارت ہو جاؤں اور وہ شفیق و رفیق بھائی جس کے ساتھ زندگی کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں آنکھیں جس سے وعدہ کر چکی ہیں کہ وہ اب کسی غیر مرد پر نہ پڑیں گی اور دل جس سے باواز بلند کہہ چکا ہے کہ وہ اب ضمیرہ کے پاس احسن کی امانت ہے اپنی آنکھ سے دیکھے کہ بدبخت ضمیرہ آج کسی غیر کی دلہن بن رہی ہے

یقیناً زندہ رہنے کا حق اب اس لڑکی کو نہیں ہے جو جوان ہو کر بچپن کے وعدوں کو فراموش کر دے اور اس بھائی کی سچی محبت کو جس نے کبھی خلوص کے سوا کچھ نہ دیکھا اس طرح خاک میں ملا دے۔

آپنے باپ ہونے کا وہ فائدہ اوٹھایا جو نہ اسلام نے دیا تھا نہ قدرت نے اور جس شخص کے خیال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس سے نکاح کی تجویز کی +

یہ زندگی جسکو آپنے برباد کرنا چاہا آپ کی نذر ہے اور یہ جان جو میری نہیں احسن کی تھی اُسپر سے قربان مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا کہ باپ جیسا شفیق میرے خون کا پیاسا ہوا اور وہ تجویز کی جو میری جان لے کر ٹلی +

بچپن ہی تھا کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھا۔ ہشیار ہوئی تو بارہ پتھر باہر گانوں میں پھینکی گئی جوان ہوئی تو شادی کا فیصلہ اس شخص سے ہوا جو تہذیب کا دشمن اور محبت کا قاتل۔

ابا جان آپ دنیا میں خوش رہیں ناشاد و نامراد ضمیرہ آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کو جدا ہوتی ہے آپنے اس دل کو جسمیں سینکڑوں ارمان اور ہزاروں حسرتیں بھری ہوئی تھیں بیدردی سے توڑا۔ اور اوس

بھائی کو جو عمر بھر کا رفیق تھا غیر بنا دیا یہ ہی ہے وہ شخص جسکو آپ نے غیر سمجھا اور جس سے بہتر عزیز میں نے ماں کے بعد نہ دیکھا اور جس کے خلوص پر آج ضمیرہ فدا ہو رہی ہے۔

کچھ دور نہیں ہے وہ وقت جب مظلوم ضمیرہ ایک انصاف والے باپ کے حضور میں دست بستہ کھڑی ہوگی۔ اور دلِ مجروح سنگدل باپ کے مظالم کی فریاد کر رہا ہوگا +

ابا جان وقت نازک ہوگا اور بات سچی حاکم حقیقی اور فیصلہ اٹل۔ دنیا مبارک مگر اس وقت کے واسطے تیار رہیئے جب وہ بادشاہ جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں مظلوموں کی فریاد سنے گا + (باقی) راشد الخیری۔

دربار ایشرہ ثانی۔ جسکی تصویر زیب ورق اول ہے گو ہندوستانی مصوری کا ایک نمونہ ہے لیکن اس لحاظ سے اسکی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جشن تاجپوشی کے متعلق جو خوشیاں لندن میں منائی گئیں یعنے (فسٹیول اوف ایمپائر) اونمیں مختلف ممالک کے قابل قدر چیزوں کے نمونہ بھی تھے ہندوستان کی نادر اشیاء میں سے اس دربار کی نقل کی گئی ــ جو نہ صرف کامیاب ہی ہوئی بلکہ بے حد مقبول و پسند کی گئی۔ یہ جلوس ۹۔ جون کو آراستہ کیا گیا اور اس خوش اسلوبی سے انجام پایا کہ تمام یورپ نے اس کی داد دی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

وہ دن گئے کہ اپنا اقبال تاج سر تھا
تھی گھر میں اپنے دولت ہمدوش کروفر تھا

منزل پہ جا رہے ہیں نزدیک دور والے
وہ قافلہ ہے پیچھے جو سب کا راہبر تھا

یہ انقلابِ عالم رکھتا ہے کیا تماشے
وہ خاک پر قدم ہے جو پہلے تخت پر تھا

سسلی لبِ سمندر لہروں سے کہہ رہی ہے
وہ کیا ہوئے کہ جن کو اہلِ جہاں سے ڈر تھا

حسرت برس رہی ہے دلّی کی سرزمین پر
یہ وہ جگہ ہے جس میں اسلام تاجور تھا

وہ کونسی تھی بستی جس میں نہ ہم تھے ساکن
لنکا میں اپنا خیمہ بربر میں اپنا گھر تھا

ہندوستاں کو ہم نے اک گلستاں بنایا
بنجر زمیں تھی جس کی جو وحشیوں کا گھر تھا

تہذیب ہم سے سیکھی دنیا کے وحشیوں نے
ورنہ تمام عالم تہذیب سے بے خبر تھا

اب رہ گیا ہے مٹنا مثلِ شرار اپنا
کس کو سنائیں جا کر ہم حال زار اپنا

(نزار ہوشیارپوری)

قدرت کی دو بولتی ہوئی تصویریں

دو شریکِ رنج و راحت! دو شریکِ زندگی
بزمِ ہستی کیلئے ہیں باعثِ تابندگی

ہے انہیں دونوں سے پاکیزہ خیالی کا وجود
ہے انہیں کے دم سے دنیا میں محبت کی نمود

ہیں مجسم جذبۂ مہر و وفا کی پُتلیاں
کونسی ایسی کشش اِن پیکروں میں ہے نہاں

ان کی روحیں متحد ہیں اُن کے جذبات ایک ہیں
ان کے مقصد ایک ہیں اِن کے خیالات ایک ہیں

اِن کے سینوں میں بھرا ہے سوز و سازِ حُسن و عشق
جانتے ہیں ان کے دل راز و نیازِ حسن و عشق

اِن کی کیفیاتِ قلبی میں ہے روز افزوں سرور
دم بدم ہے ایک مسرت خیز شورش کا وفور

لمحے لمحے میں انہیں ملتا ہے اک لُطفِ جدید
رات اِن کی شبِ برات اور دن ہے انکا روزِ عید

ان کی امیدیں زمانے میں ہیں بر آئی ہوئی
آرزوئیں کامیابی پر ہیں اترائی ہوئی

ان سے پوچھے کوئی دنیا میں مسرت کے مزے
اس جہاں میں ہی انہیں حاصل ہیں جنت کے مزے

کسقدر آپس میں دلداری کا اِنکو پاس ہے
اِنکو الفت کی نزاکت کا بہت احساس ہے

بہرِ اغراض و مقاصد کیا توافق اِنمیں ہے
کسقدر دلچسپ روحانی تعلق اِن میں ہے

ان کی دنیا ہے نہایت خوشنما و دلپذیر
جسکی نورانی شعاعوں سے جہاں ہے عکس گیر

ہو کے باہم مونس و غمخوار و ہمدرد و شفیق
منزلِ ہستی کو طے کرتے ہیں یہ دونوں رفیق

پیروِ حکمِ ازل قانونِ قدرت کے مطیع
چونکہ ہیں یہ! اسلئے ہے مرتبہ انکا رفیع

حاملِ نقش و نگارِ آفرینش ہیں یہی
رونق افزائے بہارِ آفرینش ہیں یہی

ہے انہیں دونوں سے اے ارشد عروجِ کائنات
"اشرف المخلوق" کہتے ہیں جسے ہے انکی ذات

ارشد تھانوی

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کیواسطے عِصمت ایک نعمت ہے جسمیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے کواری لڑکیوں کے واسطے عِصمت سی بہتر سہیلی عِصمت سے بہتر شفیق رفیق عِصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عِصمت اُن کو بتائے گا کہ کوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے. ماں. باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت. بڑوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت انکا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے. ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہیں. غرض ان کی آیندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچاکر پُر لطف و باطمینان بسر کروانیکے واسطے عِصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں.

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری. گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عِصمت ہے عِصمت اُنکو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل و غش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے. جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُنکی ذمہ داریاں اُن پر کیا ہیں. کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے. اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عِصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے. روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے. خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے. غرض عِصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا.

ٹائٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجۂ اعلیٰ کا کاغذ. ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانیوالا فرصت میں کہانیاں سنانیوالا. مذہب کی وقعت بتانیوالا عِصمت سی بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا. عِصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ۹ سال میں ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول ملتی ہیں. سالانہ قیمت (للعہ)

منیجر عِصمت و تمدن

دہلی

جلد ۱ اگست سنہ ۱۹۱۱ء نمبر ۵

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

[illegible] تمدن پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا [illegible] قیمت فی پرچہ [illegible]

تمدّن

یہ ۷۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخری تاریخوں میں اُن منتخب اہلِ قلم حضرات کے مضامین سے مزیّن ہوکر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کیواسطے مایۂ ناز ہیں

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہونچانا ہے۔

تمدن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصّب اور پالٹکس سے علیحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہوسکتا کہ **تمدن** اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہونگے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں +

تمدن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دوم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اوّل عہ ر قسم دوم عہ۔ نمونہ کا پرچہ (۴ر)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا۔
ابوالنعیم مولوی سیّد تصدیق احمد صاحب۔ منشی محمد حسین خانصاحب منیر انوالی۔ مولوی نیاز محمد خاں صاحب فتحپوری۔ سیّد رضا حیدر صاحب رضوی آگرہ۔ میر مہدی علی صاحب شہید دکن میرزا اسردار بیگ صاحب نگینہ۔ مولوی محمد ادریس صاحب جائسی۔ منشی محمد محسن صاحب رٹول۔ پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی۔ مولوی شمس الاسلام صاحب (علیگ) منشی محمد عبد الرزاق صاحب بسمل دکن۔ محمد صالح صاحب بنگلور۔ محمد شفیع صاحب کسولی۔ مولوی محمد لطیف صاحب بی۔ اے۔ سلطانپور۔ منشی مظفر خانصاحب پھلور۔ منشی حامد حسین صاحب قریشی پور قاضی۔

فہرست مضامین رسالہ عصمت بابت ماہ اگست ۱۹۱۱ء



شمس العلماء خان بہادر مولانا محمد ذکاء اللہ مرحوم

Block by the courtesy of
"The Adeeb," Allahabad.

Indian Press, Allahabad.

تمدّن

مولوی ذکاءُ اللہ مرحوم

از شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ ڈی آر ایل

پوری بارہ سال ہونے آئے (یعنی جب شمس العلما ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب نے مذہبی خدمات کیطرف رجوع کیا) کہ آنکھیں اور کان علامہ موصوف کی تحریر و تقریر کو ترس گئے۔ کوئی ممکن کوشش ایسی نہ تھی جو قوم نے اس عرصہ میں نہ کی ہو۔ مگر افسوس کہ کامیابی نہوئی اور یہ نقصان اردو لٹریچر کو ایسا پونہچا کہ اب اسکی تلافی نظر نہیں آتی ایسی حالت میں اسوقت یہ مختصر مضمون بھی غنیمت ہے اور تمدن نہایت ادب سے شمس العلما کا اس مضمون کے واسطے شکریہ ادا کرتا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین تمدن یہ سنکر بہت خوش ہوں گے کہ عنقریب ایک اور مضمون علامہ موصوف کا تمدن میں شائع ہوگا +

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بعد میںنے تو مسلمانوں کو کسی بات پر اس عموم کے ساتھ متفق ہوتے دیکھا نہیں جیسا وہ آجکل اپنی یونیورسٹی کے بنانے پر تلے ہوئے ہیں اسی تقریب میں بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی۔ الہ آباد۔ پنجاب۔ ایک چھوڑ۔ پانچ پانچ سرکاری یونیورسٹیاں ہوتے ہوئے تعلیم کی گاڑی میں مسلم یونیورسٹی کے پانچویں پہیے کی کیا ضرورت ہے اور چھٹی مسلم یونیورسٹی کس قسم کے

عالم پیدا کرے گی جو پانچ یونیورسٹیاں آجتک پیدا نہیں کر سکیں طرفداران مسلم یونیورسٹی اس سوال کے جواب بھی دیتے ہیں۔ مگر چونکہ خالی خولی جواب ہوتے ہیں۔ سائل کی تشفی نہیں ہوتی۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ ہوتے تو میں انہیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجہ تکمیل کو پہونچکر وما ذالک علی اللہ العزیز ان جیسے عالم پیدا کرے گی۔ کریم النفس۔ وسیع الاخلاق۔ منکسر المزاج۔ روشن دماغ۔ متنوع المعلومات کثیر التصانیف۔ خیر خواہ عامۂ خلائق۔ فیاض طبع۔ برٹش گورنمنٹ کے قدرشناس۔ ارادتمند۔ راسخ الاعتقاد۔ صلح کل۔ مرنجِ دمرنجان۔

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا۔ جبکہ وہ دہلی کالج یا دہلی نجیر کی فارسی جماعت میں تھے اور میں عربی میں۔ باایں‌ہمہ ہم ریاضیات میں ہم سبق تھے۔ ماسٹر رام چندر مرحوم کے شاگرد۔ مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت کو ریاضیات کے ساتھ خدا داد مناسبت تھی اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش رہتے تھے اور اسیوجہہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے اور چونکہ ماسٹر صاحب نے بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہمنشینی کے شبہے سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب کی طرف سے متہم بھی کرتے تہے لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پرانا ملاقاتی ہوں ان کے معاصر جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں ایک میں گراں جاں کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں لیکن تا بکے میں اب بھی گواہی دیتا ہوں اور مر کر بھی خدا کے حضور میں گواہی دونگا۔ کہ جہاں تک آدمی کو آدمی کے بُطون کا علم ہو سکتا ہے

میرے علم میں مولوی ذکاءاللہ پکے موحد تھے ایک ایک خدا کے بجمیع صفاۃ الکمالیۃ قائل اور ایسا بالغ النظر آدمی جیسے مولوی ذکاءاللہ تھے سائنس کے معموں کو حل کرنے والے ہرگز منکر خدائے واحد ہو نہیں سکتا خیر یہ معاملہ تو بینہٗ و بین اللہ ہے۔ میں مولوی ذکاءاللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا وہ یہ تھی کہ حسد انکو چھو تک نہیں گیا تھا ورنہ کالجوں اور اسکولوں میں امتحان اور کھیلوں کے ذریعہ سے تنافس پیدا کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر فی اغلب الاحوال حسد کی صورت پکڑ لیتا ہے دنیاوی عروج کے اعتبار سے مولوی ذکاءاللہ نہ تو حکومتہ کے کسی منصب جلیل پر پہونچے اور نہ انہوں نے کچھ ایسی دولت ہی جمع کی اس حرمان کا سبب یہ نہ تھا۔ کہ ان کو اسکی قابلیت ہی نہ تھی بلکہ اصلی اور واقعی سبب یہ تھا کہ انہوں نے علمی دھنوں کے آگے دنیاوی عروج کی کچھ پرواہی نہ کی اور کبھی تو اسیقدر کہ کسی کو دنیاوی عروج پر پہونچتے ہوئے سنا اور خوش ہوگئے۔ وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے انہوں نے ساری عمر جو عمر طبعی سے تجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی اور پھر بھی نفس واپسیں تک ان کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ اور وہ ہل من مزید ہی پکارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے وہ علم کو علم ہی کے لیے حاصل کرتے تھے یعنی علم ہی ان کا مقصود بالذات تھا نہ اُن فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں اور جن کے لیے سب پڑھنے والے پڑھتے ہیں الا ماشاءاللہ جہاں تک فارسی کو تعلق تھا۔ مولوی ذکاءاللہ کی کالج کی تعلیم صرف برائے نام تعلیم تھی۔ بدتر از جہل جس نے ہندوستان کو تباہ کیا تھا۔

مولوی ذکاراللہ مدرسہ میں تو فارسی پڑھتے تھے۔ جہاں اور جس غرض سے ان دستوں کے رواج نے اِن کو داخل کرایا تھا۔ مگر ماسٹر رام چند کی صحبت اُن کے دل و دماغ میں ایک اور مفید تعلیم کا بیج بو رہی تھی جس نے آخر کار مولوی ذکاراللہ کو مولوی ذکاراللہ بنایا۔ انہوں نے مدرسے سے نکل نوکری کی حالت میں اور نوکری بھی سر رشتہ تعلیم کی نوکری از خود انگریزی کا شوق کیا اور اپنے مطالعہ کے زور سے بے مدد استاد اسکو اس درجہ تک پہونچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے ہچکچاتے تھے مگر ان کی ہر طرح کی معلومات جو اونہوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھی اتنی وسیع تھی کہ بی۔اے اور ایم اے کو نصیب نہیں ہوتی۔ مولوی ذکاراللہ حکیموں کی طرح بے فیض نہ تھے کہ ان کو اتفاق سے کوئی نئی حکمی دوا معلوم ہی ہوگئی تو دوسروں کو بتانے میں دریغ کیا کرتے ہیں۔ مولوی ذکاراللہ نے جو کچھ پکایا تصنیفات۔ تالیفات۔ ملفوظات اور تراجم کے ذریعہ سے اپنے سب ہم وطنوں کو چکھایا۔ مولوی ذکاراللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب کے لکھنے کیلیے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاراللہ کی ایک اور ادا جسمیں وہ منفرد تھے ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انہوں نے انگریزی کے اتنے تبحر پر بال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے گویا تھوتھے مگر انہوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں اوڑھی انگریزی جوتی تک نہیں پہنی۔ میں جاڑے کے دنوں میں ان کو بوڑھے بنئے کی طرح کاروئی دار پاے جامہ

پہنے دیکھتا اور پہنا کرتا۔

غرض مولوی ذکار اللہ کی وضع ظاہر بطرز ماندو بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ان کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو ہما مذ وہ بھی یقیناً مسلمان تھے مگر ان کا دامن عقیدت لوث تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے سب سے خلوص کے ساتھ ملتے اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتو دم سے تھی مولوی ذکار اللہ اور سکرات کی سی بیقراری پادری[۱] صاحب کو بھی بہ ظاہر دونوں میں کسی ایک کی کوئی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی۔ مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا اور ان کی باہمی محبت الحب للہ کی قسم سے تھی مودہ اہل صفا چہ درتو چہ در تو بود

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر آدھے درجن پادری اینڈریوز جیسے انگریز اور آدھے درجن مولوی ذکار اللہ جیسے مسلمان ہوں تو وہ وقت جلد آجائیگا کہ مسلمان اور انگریز دونو اپنی اپنی جگہہ سے کہنے لگیں گے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

---

[۱] پادری اینڈریوز صاحب ۱۲

قطعہ

(جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھا)

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے — عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل — دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکر حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے — تیرا انداز تملق بھی سراپا اعجاز
کبھی ایراں کے لیے ہو جو دعا کا جلسہ — عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز
ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے — فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز
در حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود — پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے — پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن — اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں — چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے — تری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی — تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز
غم صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں — پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغ پرواز
عاقبت منزل ما وادی خاموشان است — حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز
سن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا — شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر — ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

ضمیرہ

یہانتک لکھکر ضمیرہ کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور فانی دنیا سے رخصت ہو کر اس احکم الحاکمین کے روبرو حاضر ہونے کے خیال میں جو اسوقت اسکی حالت زار کو دیکھ رہا تھا وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اسنے ایک حسرت بھری نظر آسمان پر ڈالی تارے کھل رہے تھے مگران کی چمک دمک پھیکی پڑ چکی تھی۔ صبح صادق کا سہانا وقت تھا برابر کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور ضمیرہ کلمہ پڑھکر اٹھی غسل کیا نماز فجر ادا کرنے کے بعد سجدہ میں گری۔ اور کہنے لگی دلوں کے حال جاننے والے معبود یہ تیری گنہگار بندی ضمیرہ چند لمحہ بعد تیرے حضور میں شرمسار حاضر ہوتی ہے اپنی خدائی کا صدقہ جوار رحمت میں جگہ دے اور اُس بے ماں کی بچی پر جو چودہ برس دنیا کی مصیبتیں جھیلکر ماں کی شفقت بھری نظر کو ترستی پھڑکتی دنیا سے چلی رحم کیجیو، الہ العالمین تیری شان بخشی کو سزاوار موت کی سختی آسان ہو اور سکرات کی نوبت نہ آئے اپنے فضل و کرم سے میرے گناہ پر پردہ ڈال اور اُس ماں سے ملا دے جس نے خون جگر پلا کر پالا۔ اور حسرت سے تکتی ہوئی رخصت ہوگئی۔ تیری دنیا لازوال نعمتوں سے بھری ہے مگر ضمیرہ کے واسطے سب سے بڑی نعمت اسکی ماں کا دیدار ہے جس کی دھندلی سی تصویر اسوقت دکھائی دے رہی ہے ازلی اور ابدی راج والے شہنشاہ تیری سلطنت لازوال۔ تیری حکومت غیر فانی ضمیرہ کی روح بدن سے نکلتے ہی اس ماں کے آغوش میں پونہچا دے جس کے کلیجے سے لگے ہوئے مدتیں ہوگئیں۔

بے وارثوں کے وارث اور بے والیوں کے والی تنہا ضمیر جس کے سر سے ماکا سایہ اُٹھہ چکا اور جسکا اب دنیا میں کوئی رفیق نہیں تیرے سپرد ہے، غفور الرحیم یہ معصوم ماکی امانت تہی جو آج تیری حفاظت میں دیتی ہوں اپنی قدرت کاملہ سے اس کی پرورش کر، الٰہی اضمیر اس فانی دنیا میں پھلے پھولے مرحومہ ماکی نشانی موجود رہے اور بدنصیب بہن کی قبر پر فاتحہ پڑہنے والا قائم۔

یہ دعا مانگ کر ضمیرہ سجدے سے اٹھی ایک شیشی نکالی اور پلنگ پر نیچے آئی ضمیر نیچے پڑا سوتا تھا اس کے برابر بیٹھی اور لپٹ گئی بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور گلے سے لگاکر اتار دی کہ بجلی بند ہو گئی مچھلی کی طرح تڑپی اور ضمیر کے منہہ پر [illegible] منہہ رکھکر کہا!

نیند کے متوالے بھائی ہشیار ہو، اُٹھہ اور اس بہن سے مل لے جو اب ہمیشہ کی نیند سوتی ہے۔

یہ کہکر ضمیرہ نے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور فرط محبت میں یہ کہکر چیخ ماری۔ پیارے ضمیر خدا حافظ۔

صبح ہوچکی تہی برات کی تیاریاں ہو رہی تہیں لوگ کچھہ آ گئے تہے کچھہ آ رہے تہے شہسوار مشرق کے ساتھہ ہی ساتھہ نوشہ مردانہ میں داخل ہوا اور ضمیرہ کے والد بزرگوار زنانہ میں آئے۔ باپ کی صورت دیکھکر ضمیرہ ترک ادب کے لحاظ سے اٹھنا چاہتی تہی۔ مگر نہ اُٹھہ سکی بمنت و زاری قصوروں کی معافی مانگی اور بآواز بلند کہا۔

ابا جان! بدنصیب ضمیرہ بے مرضی کے نکاح پر قربان ہوگئی۔

گھر والے دوڑ پڑے دیکھا تو کچھہ نہ تھا۔　　　راشد الخیری

"اسلام اور عورت"

بنی نوع انسان اسلام کی تمدنی اصلاحوں کے جسقدر زیر بار احسان ہیں محتاج بیان نہیں غیر اقوام اور غیر مذاہب تک کو اسبات کا اقرار ہے کہ تمدن کو ترقی و تکمیل کے انتہائی مدارج پر پہونچانے والے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اسیری، ایرانی، مصری، یونانی اور رومی تمدن اپنے اپنے وقت میں اس زمانہ کی حالت کے مطابق بیشک اپنی نظیر آپ تھے مگر اب وہ سب گرد روزگار ہیں صرف اُن کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ لیکن جو عظیم الشان تمدن پیغمبر عرب نے قائم کیا وہ آج تیرہ سو برس بعد بھی اُسی طرح کامل اور عدیم المثال ہے کہ اُس کے سامنے نہ صرف نینوی، بابل، اتھنس ممفس، وتھبیس، صدور وغیرہ کے گزشتہ تمدن ہی ہیچ ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے دوسرے تمام شائستہ اور ترقی یافتہ اقوام و ممالک بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انسان کی حالت روز بروز بدلتی رہتی ہے لہٰذا اس کی روز افزوں ضرورتوں پر کسی قانون معاشرت کا اس درجہ حاوی ہونا کہ سینکڑوں برس کے بعد بھی اُسی طرح ناممکن التبدیل ثابت ہو کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زمانہ ہجرت سے اس وقت تک دنیا میں جتنے نظامات قایم ہوئے اُنمیں سے کیسکو اگر یہ عجیب و غریب خصوصیت حاصل ہوئی تو وہ محض پیغمبر اسلام کا قایم کیا ہوا تمدن ہے جس نے نہ صرف ہند و ایران و یونان و روم کے قدیم تمدنوں پر ہی فوقیت حاصل کی ہی بلکہ تیرہ سو برس کی طویل مدت میں بھی دنیا کی کوئی قوم ایسا کامل، جامع، عالمگیر اور ناممکن التبدیل تمدن قایم کرنے میں باوجود دماغی ترقیات اور مختلف

تغیرات کے اُس کی گرد کو بھی نہ پہونچ سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس سے بہتر نظام تمدن خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ اس عالی شان تمدن کی عظمت اور اہمیت اُس وقت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے جب ہم اِس کے بعض اصول کا دنیا کی دوسری متمدن اقوام کے ترقی یافتہ نظامات کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ اور سب باتوں کو چھوڑکر اگر ہم صرف عورتوں ہی کو لیں اور دیکھیں کہ حضرت پیغمبر اسلام کے قایم کردہ تمدن نے اُن کی حالت پر کیا اثر کیا تو بڑی آسانی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے اصول کس قدر انسانی فطرت سے مبنی اور کمال کے انتہائی حد پر پہونچے ہوئے ہیں جس کی بدولت اُسکو غیر معمولی استحکام حاصل ہے۔ دنیا کے مختلف تمدنوں کا باہمی مقابلہ کرنے کے لیے عورتوں کی حالت کا اندازہ کرنے سے بہتر کوئی شکل نہیں۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ عورتیں تمدن کی بنیاد ہیں اور جس تمدن کی بنیاد سب سے اچھی ہو پھر اُس تمدن کے سب سے اعلیٰ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تہذیب کو جانچنا منظور ہو تو سب سے پہلے اُس کی عورتوں کی حالت کا اندازہ کرو اور یہ دیکھو کہ وہ قوم عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ پس جب ہم اِس معیار سے دنیا کی کل اقوام اور اُن کے قانون معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق عطا کر رکھے ہیں، جو آزادی دی ہے اور جو درجہ قایم کیا ہے اُس کی نظیر دنیا کی کسی قوم اور کسی ملک میں نہیں ملتی۔ زمانہ قدیم کے متقننوں کے احکام تو وہ ہیں جن کی رو سے اشرف المخلوقات کا بہترین نصف حصہ اپنے تمام فطری حقوق سے محروم، انواع و اقسام کے مظالم کا تختہ مشق

اور مردوں کی ذلیل غلامی میں گرفتار کر دیا گیا ہے۔ ادیان سلف اور مصلحان سابقہ میں سے کسی نے عورتوں کے حقوق کی حمایت اور ان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرنے کی طرف مطلق توجہ نہیں کی بلکہ اور ان کی ذلت و خواری میں اضافہ ہی کیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں عورتیں انسانوں اور حیوانوں کے درمیاں ایک قسم کی مخلوق سمجھی جاتی تھیں۔ لونڈیوں سے بھی بدتر حیثیت رکھتی تھیں۔ ان پر مردوں کی جابرانہ حکومت قایم تھی اور ان کا مصرف محض ترقی نسل اور مردوں کی ذلیل غلامی تھا۔ ہندو، یونانی اور رومی قانون نے عورتوں کو ان کی مستقل شخصیات سے ہمیشہ محروم رکھا۔ یونانی جن کی ترقی و تہذیب کا ایک زمانہ ثنا خواں ہے عورتوں کو ایک کم درجہ کی ذلیل مخلوق اور مردوں کی خدمت گزار سمجھتے تھے۔ محض ایک بچہ پیدا کرنے کی کل سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی۔ ان کی بے قدری و ذلت کی یہ انتہا تھی کہ اگر کسی عورت کے ہاں ناقص الاعضا بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت کو مار ڈالتے تھے۔ اسپارٹا میں وہ عورت جس سے کسی قوی سپاہی کے پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی زندہ نہیں رکھی جاتی تھی۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا کہ ایک شخص دوسرے سے چند روز کے لیے اس کی بیوی عاریتاً لے لیتا۔ شوہر تو اپنی بیوی کی جان تک کا مالک ہوتا لیکن اس بیچاری کو حق وراثت تو کیا کسی قسم کا حق ہی حاصل نہ تھا۔ قیدیوں کی طرح عورتوں کے اپنے گھروں میں بند رہنے اور ضرورت کے سوا باہر قدم نہ رکھنے کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ رومیوں میں عورتوں کی حالت اس سے بہتر نہ تھی۔ ان کا قانون بھی عورتوں کو تمام ان کے

پیدائشی حقوق سے محروم کرتا تھا وہ ایک حقیر، ذلیل اور ادنی مخلوق تصور کی جاتی تھیں۔ شوہر کے سوا کوئی ان کے افعال کا فیصلہ کرنیوالا نہ تھا۔ یونانی اور رومی قانون کی رو سے لڑکیاں اپنے باپ کی رضامندی کے بغیر شادی کرنے کی مجاز نہ تھیں۔ اس کے ارتکاب پر باپ کو حق تھا کہ وہ اپنی بے باک لڑکی کو قتل کر ڈالے۔ شادی بیاہ کی کوئی مہذب شکل نہ تھی۔ بالکل خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا تھا۔ باپ اپنی لڑکیوں کو ان کے خواستگاروں کے ہاتھ بیچتے تھے اور شوہر اپنے لیے بیویاں خریدتے تھے۔ بعض اوقات شوہر اگر ان کا جی چاہے اپنی بیویوں کو چند روز کے بعد دوسروں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے تھے۔

ہندو مقننوں نے بھی عورتوں کے ساتھ سختی کرنے میں کوتاہی نہیں کی قدیم ہندوستان کے زبردست مقنن منو کا حکم ناطق ہے کہ "عورت صغیر سنی میں باپ کی مطیع رہے، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی اور اگر بیٹے نہوں تو اپنے اقربا کی۔ کیونکہ کوئی عورت ہرگز اس لایق نہیں کہ خود مختار طور پر زندگی بسر کر سکے"۔ ہندوؤں کے مذہبی قانون کی رو سے عورتیں اپنی مستقل شخصیت سے اس درجہ محروم ہیں کہ ان کو عبادت تک کرنے کی ممانعت ہے۔ حکم ہے کہ عورت کو مذہبی عبادتوں کے بجا لانے اور روزہ وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ اپنے شوہروں کی دل سے خدمت گزاری کریں تو وہ جنت میں داخل ہو جائیں گی۔ ایک اور حکم ہے کہ "جو عورت روزہ رکھے اور ریاضت کرے وہ جہنم میں داخل ہوگی اور اس کے شوہر کی عمر کم ہو جائے گی"۔ ایک اور حکم ہے۔ کہ "اگر کسی عورت کو تیرتھ

وجاتے کا شوق ہو تو اسکو چاہیئے کہ اپنے شوہر کے پاؤں دھو کر پی لے کیونکہ اس کے لیئے اس کا شوہر وشنو اور شنکر سے بھی زیادہ بزرگ اور افضل ہے" اِن احکام کے نافذ کرنے والوں نے عورتوں کی یہہ تعریف کی ہے کہ "تقدیر، طوفاں، موت، جہنم، زہر، زہریلے سانپ، اِن میں سے کوئی اِس قدر خراب نہیں ہے جتنی عورت

زر دشت کے مذہب کا قانون بھی عورتوں کے متعلق قریب قریب ایسا ہی ہے۔ اس کی رو سے تو خانگی تعلقات میں کسی بات کا لحاظ ہی نہیں۔ تمام عورتیں خواہ وہ کسی عمر کسی رتبہ اور کسی رشتہ کی ہوں مردوں کی نفسانی خواہشوں کے لیے وقف قرار دی گئی ہیں۔ ماں بیٹے کے لیے بیٹی باپ کے لیے اور بہن بھائی کے لیے ویسی ہی مباح ہے جیسی بالکل غیر عورتیں۔ بلکہ بہن کے ساتھ نکاح تو بہت افضل خیال کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو ان کے مذہب نے کسقدر بے وقعت سمجھا۔ یہودی اور عیسائی مذاہب کے احکام نے بھی عورتوں کے حقوق کی کوئی نگہداشت نہیں کی۔

یہودی پیشوایان مذہب نے عورت کو تمام انسانی عیوب کا بانی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ مردوں کی برائی عورتوں کی اچھائی سے بدرجہا بہتر ہے۔ موسوی مذہب نے نکاح کا کوئی ایسا شایستہ اصول نہیں قرار دیا جس سے زوجیت کے حقوق و فرائض میں مساوات پیدا ہوتی اور حسن معاشرت کی ترقی ہوتی بلکہ اسی خرید و فروخت کے قاعدے کو جاری رکھا جس سے عورتوں کے استقلال بالذات سے محروم ہونے پر اور بھی مہر لگ جاتی تھی۔ چنانچہ ہوسیع نبی نے اپنی بیوی پندرہ روپلے اور ڈیڑھ حمر جَو

خریدی تھی" (پیدائش ۲۴ و ۱۲- اصول ۱۸- و ۲۵) بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہ ہونے سے جو شخص جتنی بیویاں چاہتا اپنے گھر میں بھر لیتا اور جب جی چاہتا ان کو نکال باہر کرتا۔ شریعت موسوی میں کثرت ازدواج اور طلاق کی کوئی حد ہی نہیں۔ فقہائے یہود کا یہ حکم تھا کہ ادنیٰ سی خطا پر بھی عورت کو طلاق دیدینی چاہیئے "اگر کسیکو اپنی عورت بری معلوم ہو تو اس کو نکال ڈالے" (استثنات ۲۴ و ۱) زلی عقیبہ کہتا ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی بیوی سے خوبصورت پا دے تو اپنی عورت کو نکال دے۔ معلم ہلل کا قول ہے کہ اگر کسی کی عورت اپنے شوہر کا کھانا بہت نمک ڈال کے خراب پکا دے یا اُسے زیادہ بھون دے تو وہ عورت طلاق دیدی جائے۔ بالمختصر یہ کہ یہودی مذہب نے عورتوں کی کوئی قدر اور ان کے تلف شدہ حقوق کیطرف کوئی توجہ کی

عیسائی مذہب نے بھی بالکل اسی کی تقلید کی۔ عیسائی مقتدیان دین نے عورتوں کو جہنم کا دروازہ اور تمام انسانی برائیوں کا اصلی سرچشمہ قرار دیا اور نہایت شد و مد کے ساتھ تلقین کی کہ عورت کو ہمیشہ اس خیال سے شرمانا چاہیئے کہ وہ عورت ہے۔ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ "عورت موت سے زیادہ تلخ ہے" اور "عورت مرد کی محکوم و غلام ہے" اور "جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنے کو عورت سے بچائیگا" عیسائی پیشوایان مذہب نے عورتوں کے ساتھ نفرت اور حقارت کرنے کی یہاں تک کوشش کی کہ اپنی مقدس کتاب کی تعلیم کے خلاف رہبانیت کو ایجاد کیا اور شدت کے ساتھ اس کے دلدادہ بن گئے۔ ان خیالات نے مذہب عیسوی کے معتقدوں پر ایسا اثر کیا کہ ۵۸۶ء میں بمقام ماکن (فرانس) ایک خاص مجلس اس غرض سے

بیے منعقد کرنی پڑی کہ وہ عورتوں میں کسی زندہ روح کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے۔اس مجلس کے تصفیہ سے بھی پوری تشفی نہ ہوسکی اور سولھویں صدی عیسوی تک برابر اس بات پر مباحثہ ہوتا رہا کہ عورت نوع انسان میں داخل ہے کہ نہیں ۔ کرائسٹم نے علمائے مسیحی کی رائے عورتوں کے متعلق اِن الفاظ میں بیان کی ہے کہ عورت ایک ایسی بلا ہے جس سے گریز ممکن نہیں ہے اور ایک قدرتی مغوی اور ایک مرغوب آفت اور ایک خانگی فتنہ اور ایک مہلک سحر اور ایک رنگین بلا ہے۔" مشہور ہے کہ شارل مین شہنشاہ فرانس جو حقیقت میں تمام یورپ کا مالک تھا اور جس نے علاوہ ملک گیری کے علوم و مذہب کی ترقی میں بڑی کوشش کی تھی اور معاشرتی اور مذہبی قوانین کے مجموعے شائع کیے تھے ایک دن اپنی بہن کے ساتھ مباحثہ میں اس پر حملہ کر بیٹھا، اس کے بال پکڑ لیے، خوب مارا پیٹا، لاتیں اور گھونسے لگائے اور اپنے لوہے کے دستانے سے اس کے تین دانت توڑ ڈالے۔ ایک ایسے مصلح تمدن و معاشرت، علم پرور عظیم الشان بادشاہ کا اپنی بہن کے ساتھ یہ وحشیانہ برتاؤ ایسا ہے کہ اس سے بدتر سلوک خیال میں بھی نہیں آتا۔ دین، حکومت اور قانون عیسوی نے عورتوں پر وہ مظالم کیے ہیں کہ ان کے ذکر تک سے تکلیف ہوتی ہے۔ قسطنطین اعظم کے زمانہ میں شوہر خود اپنی بیوی کو قتل کرسکتا تھا۔ اور اس کا یہ فعل کوئی جرم نہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک طول طویل زمانہ تک مذہب عیسوی نے عورتوں کو جلانا قتل کرنا۔ اور سخت ترین عذاب دینا صرف جائز ہی نہیں کیا تھا بلکہ مقدس پوپ تشدد کے ساتھ اس بارے میں فرمان جاری کرتے تھے اور فرانس، جرمن،

انگلستان اور اسکاٹلنڈ وغیرہ یورپ کے ممالک میں ہر سال لاکھوں عورتیں جادوگری کے محض لغو الزام اور بیہودہ اتہام میں نہایت ہی سنگدلی وبے رحمی کے ساتھ زندہ جلائی جاتی تھیں۔ ازمنہ متوسطہ کی تاریخیں رحمدل مقدس پادریوں کے ان ظالمانہ اور وحشیانہ کارناموں سے بھری پڑی ہیں ✦

غرض اور اس قسم کے خیالات اور قوانین نے جن کا ساری دنیا پر قبضہ تھا اور جو مدتہائے دراز تک نشو ونما پاکر ایسے راسخ ہوگئے تھے کہ آج بھی ان کے آثار دنیا کے اکثر حصوں میں باقی ہیں اور اکثر امور کا قلع قمع تو آجتک نہ ہوسکا۔ یہ حالت تھی جبکہ:-

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت ۔ بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحیٰ نے کی وہ ودیعت ۔ چلے آتے تھے جسکی دیتے بشارت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

حضرت پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والثنا کی پیدایش کے وقت تمام عالم کے مذاہب وقوانین وغیرہ نے عورتوں کے حقوق کی پامالی میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ عورتوں کی نسبت بالکل بے اصل خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو کمزور، ناقص العقل اور ادنیٰ درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ وہ مردوں کی خدمت گزار غلام اور ذرائع خواہش نفسانی تصور ہوتی تھیں۔ اسیطرح عرب میں بھی عورتوں کی نہایت پست و ذلیل حالت تھی۔ یہودیوں اور ایرانیوں کے قبیح رسوم باہم خلط ملط ہوکر عجیب وغریب صورت میں رائج تھے۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا ایک

بہت بڑی بدنصیبی خیال کی جاتی تھی۔ دخترکشی کی رسم بدعام تھی۔ جہالت کے غلبہ سے لڑکیوں کا رکھنا سخت ذلت و اہانت سمجھا جاتا تھا کمبخت بے رحم والدین لڑکیوں کو یا تو ہوتے ہی مارڈالتے تھے یا پال پوس کے زندہ دفن کر دیتے تھے یا پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیتے تھے یا دریا میں غرق کر دیتے تھے یا اپنے ہاتھ سے اپنے لختِ جگر کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ کثیر الازدواجی کی رسم بڑے زور شور کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ بیٹوں کو باپ کی عورتوں سے نکاح کر لینے میں پس و پیش نہ ہوتا تھا جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کے لڑکے اپنی سگی ماؤں کو چھوڑ کر اپنی سوتیلی ماؤں کو اپنی بیویوں کے گلے میں بلا تامل شریک کر لیتے۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ کسی روز تمام لڑکے اور وہ عورتیں جمع ہوتیں ان میں سے جو کوئی عورت سے پہلے اس پر چادر ڈال دیتا وہی اس عورت کا شوہر قرار پاتا۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اس کی سب بیٹیوں کا جبراً وارث ہوجاتا اور ان سے نکاح کر لیتا۔ اوس زمانہ میں ایک شخص دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کر سکتا تھا اور نہایت قریبی رشتہ کی عورتوں سے شادی کرنا بالکل جائز تھا یعنے پھوپھیوں، خالاؤں، بہنوں اور بیٹیوں وغیرہ سے وہ لوگ بلا تکلف شادیاں کر لیتے تھے۔ عورت و مرد کا تعلق یا تو بیع و شرا کے ذریعہ ہوتا یا اس طرح کہ کوئی عورت اپنے مکان پر جھنڈیاں نصب کر دیتی اور جو شخص چاہتا اُس کے مکان پر بے تکلف چلا جاتا۔ اگر کوئی عورت اُمید سے ہو جاتی تو وضع حمل کے وقت اُن تمام آدمیوں کو جو اُس کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے جمع کیا جاتا اور قیافہ شناس اُنہیں سے جس شخص کو اولاد کے ساتھ مشابہ

پاتا اوسی کو اوس کا باپ قرار دیتا اور بچہ کی پرورش اوسی کے ذمہ ہوتی۔ جسطرح کثرت ازدواج کا عربوں میں رواج تھا اسی طرح طلاق کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ ہر مرد اپنی عورت کو بلا کسی سبب کے فوراً طلاق دے سکتا تھا اور جب چاہتا اوس سے دوبارہ شادی کر سکتا۔ اگر کوئی شخص ہزار دفعہ کسی عورت کو طلاق دے اور ہزار دفعہ اس سے نکاح کرے تو کوئی عیب کی بات نہ تھی عورتوں کو وراثت میں کچھ حصہ نہ ملتا۔ تنہا مرد ہی جائداد کے مالک ہوتے تھے۔ عورتیں جائداد کا ایک جزو سمجھی جاتی تھیں اور جائداد کی طرح باپ سے بیٹے پر منتقل ہوتی تھیں غرض اسیطرح کے صدہا قبیح رسوم اوس ملک اور اوس قوم میں رائج تھے جسمیں حضرت سرور کائنات صلعم پیدا ہوئے اور جہاں آپ نے آنکھیں کھولیں لیکن کسقدر حیرت و استعجاب کی بات ہے کہ اوس بے پناہ و بے یار و مددگار اُمّی یتیم نے جس کے دنیا میں قدم رکھنے کے پہلے ہی سے باپ کا انتقال ہو چکا تہا اور چھ سال کی نہایت کمسنی میں ماں کا پر شفقت سایہ بھی اُٹھ گیا ہے جس نے نہ کسی کالج یا دار العلوم میں کبھی تعلیم پائی، نہ کسی فلسفہ و حکمت کے عالم کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا، نہ علما و فضلا کی صحبت اُٹھائی، نہ سقراط و بقراط و فلاطون کے مسائل سنے بلکہ جو ہمیشہ بد اخلاق، وحشی اور ناتربیت یافتہ اونٹ چرانیوالوں میں جو بت پرستی، باہمی جنگ و جدال، ظلم و ستم، بے رحمی و سنگدلی اور چوری و آوارگی کے سوا کوئی کام نہ رکھتے تھے گھرا رہا، اپنی قوم اور اپنے ملک بلکہ تمام دنیا اور دنیا کے تمام مذاہب کے برخلاف عورتوں کی ذلیل

حالت کی ایسی اصلاح کی، ان کے پامال شدہ حقوق کو قایم کرکے ان کو حیات انسانی بخشی اور حسن معاشرت کے وہ وہ احکام بتلائے اور ایسے عظیم الشان لاثانی اصول قایم کیے کہ تمام دنیا کے بڑے بڑے حکما، فضلار، فلاسفر اور حکمت و اخلاق کے عالم دنگ ہو گئے۔ چنانچہ اُن لوگوں کو جو شریعت اسلامی پر عبور رکھتے ہیں اور پیغمبر عرب کی تعلیم سے واقف ہیں اس بات کا اقرار ہے کہ عورتوں کی آزادی، ان کی عزت و منزلت اور ان کی حق رسی مذہب اسلام کا ایک ایسا عظیم الشان مخصوص اصول ہے کہ اس کی بنا پر وہ دوسرے تمام ادیان و مصلحان کے مقابلہ میں جس قدر فخر و ناز کرے بجا ہے۔ کیونکہ اس نے تیرہ سو برس اول سے عورتوں کو وہ حقوق عطا کر رکھے ہیں کہ جو یورپ کی عورتوں کو باایں ہمہ اصلاح و تہذیب اتنک نہیں حاصل ہو سکے بقول شمس العلما مولانا شبلی "عورت جو نوع انسانی کا نصف حصہ ہے اس کے حقوق کی نسبت دنیا کے مختلف حصوں میں سیکڑوں ہزاروں قانون بنے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت تک اس فرقہ نے اپنے حقوق کی داد نہ پائی جبتک اسلام دنیا پر سایہ فگن نہ ہوا" یہ کچھ پیروان اسلام ہی کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ غیر اقوام کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لی بان نے اپنی مشہور کتاب "تمدن عرب" میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور لکھا ہے :-

"اسلام نے عورتوں کی حالت کی بہت اصلاح کی ہے اور یہی مذہب ہے جس نے ایسا کیا۔ بہت آسانی سے ثابت

"ہو سکتا ہے کہ کل اور مذاہب میں اور کل اور اقوام میں جو عرب سے پہلے تھیں عورتوں کی حالت بہت ہی ابتر تھی"

مس مل پٹرک نے ایک جگہ کہا ہے کہ:۔

"آج سے بارہ برس پیشتر اسلامی شرع نے جو حقوق عورتوں کو دیے تھے ہمارے مقنن آج تک بھی ان کو نہیں دینا چاہتے"

اِس آزادی و ترقی کے زمانہ میں وہ ملک جو آزادی کا سب سے بڑا مدعی ہے یعنی انگلستان عورتوں کے بعض حقوق کی نسبت ابھی تک غور و بحث کر رہا ہے۔ شادی کے بعد انگلستان میں عورتوں کی ذات ہی قائم نہیں رہتی۔ ان کی شخصیت میں نقص آجاتا ہے اور وہ اپنے شوہروں میں فنا ہو جاتی ہیں۔ قانون ان کو بالکل مردوں کی خود رائی کے تابع کر دیتا ہے ان کو اپنے نام سے کوئی معاہدہ کرنے یا ذاتی جائداد علیحدہ رکھنے کا ہرگز حق نہیں بلکہ شادی کے پہلے ان کی جو کچھ جائداد ہوتی ہے شادی کے بعد وہ سب شوہر کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس بیچاری کو تو اس پر کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور شوہر جس طرح چاہے اُسے صرف کر سکتا ہے۔ غرض بہت سے امور ایسے ہیں جن سے عورتوں کی سراسر حق تلفی ہوتی ہے اور ان کی حریت و منزلت میں فرق آتا ہے۔ لیکن شریعت اسلامی نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے ہیں اور کامل حُریت عطا کی ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو کسی بات میں مردوں سے کم نہیں رکھا۔ عورت و مرد کی روحانی، تمدنی اور قانونی،

مساوات کی تلقین کی اور مردوں کو عورتوں کے ساتھ نہایت لطف و مہربانی سے پیش آنے اور ان سے عزت و احترام کا برتاؤ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ عورتوں پر جو انواع و اقسام کی عقوبتیں ہوتی تھیں ان کو دور کیا۔ مردوں کی ناجائز حکومت سے نجات دلا کر ان کے انسانی حقوق کی بنیاد ڈالی اور ان کی مستقل شخصیات کو قایم کیا۔

قرآن شریف میں عورت و مرد کی مساوات کو کسقدر بہترین تشبیہ میں بیان فرمایا ہے کہ "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" یعنے عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا (سورۃ البقر ۲۔ آیت ۱۸۲) عورتوں اور مردوں کے حقوق میں کسی قسم کا فرق نہ ہونے اور دونوں کے ہم رتبہ و ہمسر ہونے کی تلقین اس سے زیادہ مؤثر الفاظ میں اور کیا ہو سکتی ہے کہ جیسے مردوں کا حق عورتوں پر ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر ہے (سورۃ البقر ۲۔ آیت ۲۲۸)۔ اور "مردوں نے جیسی کمائی کی ہو ان کو ان کا حصّہ اور عورتوں نے جیسی کمائی کی ہو ان کو ان کا حصّہ" (سورۃ النساء آیت ۳۶)

اور "بیشک مسلمان مرد اور عورتیں ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، فرمان بردار مرد اور فرمان بردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، خاکسار مرد اور خاکسار عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی . . . کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، خدا نے ان

سب کے لیے مغفرت گناہ اور اجر عظیم تیار کیا ہے" (سورۃ الاحزاب ۳۳ آیت ۳۵)۔ اور "یہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی ہے کہ اوس نے تمہارے لیئے تمہارے ہی جنس کی بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم کو اون کی طرف رغبت کرنے سے راحت ملے۔ خدا نے تم دونوں میں پیار و اخلاص پیدا کیا ہے (سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۲۰)۔ عورتوں کے حقوق کو اس طرح مشخص کرنے کے بعد ان کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق تاکیدی احکام نافذ فرمائے کہ "عورتوں کے ساتھ بھلائی سے سلوک کرو" (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۲۳) اور "عورتیں اپنے حقوق پر تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں" (سورۃ النساء آیت ۲۵)"

مردوں کے دست تظلم سے رہائی بخشنے اور عورتوں کے حقوق قائم کرنے کے بعد حضرت پیغمبر اسلام نے نہایت مدبرانہ اصول کے ساتھ دوسری شرمناک حیوانی رسوم کا ایسا انسداد فرمایا کہ ان وحشیانہ افعال کے مرتکبین خود اپنی حرکتوں سے متنفر ہو گئے دختر کشی کا خونخوار دستور جو دوسری اقوام کیطرح ایک ایک عرب کے رگ و پے میں سرایت کیئے ہوئے تھا۔ اور جو اس سنگدل قوم کے لیے بمنزلہ طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا اس رحمۃ للعالمین کی دلوں کو مسخر کرنے والی تعلیم کی بدولت نام کو باقی نہ رہا۔ نکاح کے ایسے اعلیٰ اصول اور بہترین قواعد مرتب فرمائے کہ اس سے حسن معاشرت اور تدبیر منزل کی بیحد ترقی ہوئی۔ عورت و مرد جو خود خالق حقیقی کے ارشاد "ھن لباس لکم و انتم لباس لھن" (وہ تمہارے

دامن کی جگہ اور تم ان کی چولی کی جگہ ہو) کی رو سے ایک دوسرے کے محتاج الیہ ہیں ان کے باہمی تعلقات کو نہایت درجہ مستحکم اور پائدار کیا۔ نکاح کو ایک ایسا عہد موثق اور عقد دائمی قرار دیا کہ اس میں نفس پرستی کا شائبہ تک باقی نہ رہے اور جس سے عورت کی وقعت اور منزلت میں کوئی فرق نہ آنے پائے محصنین غیر مسافحین (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۲۴) سے نکاح اسلامی کی اصلی علت بہت اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ عورتوں کو اپنی مرضی کے خلاف نکاح کرنے پر مجبور نہیں رکھا بلکہ ان کے اختیار اور رضامندی پر نکاح کو منحصر کیا۔ زرمہر جو بطور قیمت کے باپ کو ملتا تھا اسکی ممانعت کی اور خود عورت کو اسکا مستحق قرار دیا۔ کثیر الازدواجی کی قدیم رسم کو بڑی حکمت اور مصلحت کے ساتھ توڑا۔ چنانچہ قرآن مجید میں " فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع " یعنے اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کرلو۔ (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۳) سے کثرت ازدواج کے بیشمار عدد کو اولًا تو بہت کچھ گھٹا دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی " فان خفتم ان لاتعدلوا فواحدۃ " یعنے پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ کئی بیبیوں میں برابری کے ساتھ برتاؤ نہ کرسکو گے تو اس صورت میں ایک ہی بی بی کرنا (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۳) میں ایک بہت سخت اور دشوار قید لگا دی اور پھر " ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم " یعنے اور تم اپنی طرف سے بتیرا چاہو لیکن یہ تو تم سے ہو نہیں سکے گا کہ کئی کئی بیبیوں میں پوری پوری برابری کرسکو۔

(سورۃ النساء-آیت ۱۲۸) کہکر نہایت لطیف پیرایہ میں وقت واحد میں ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی قطعاً ممانعت فرمادی۔ باپ کی بیواؤں اور قریبی رشتہ کی عورتوں سے نکاح کرلینے کے خلاف فطرت دستور کو بدترین گناہ قرار دیا۔ طلاق کے نہایت باقاعدہ احکام مرتب فرماکر اسکو نہایت سخت ناگزیر حالت میں جبکہ ازدواج کی اصلی مصلحت اور علت غائی ناپید ہورہی ہو۔ اور سوائے اِس کے کوئی چارہ نہو جائز کیا اور اس کو دنیا کی تمام چیزوں میں بدترین چیز کہکر اس کے مذموم ہونے اور اس سے حتی المقدور محترز رہنے کی تلقین فرمائی۔ بیواؤں کو متوفی شوہر کی جائداد اور میراث سمجھ کر ان پر قابض ہو بیٹھنے کے رواج کو سختی کے ساتھ موقوف کیا۔ اور تاکید کی کہ "مسلمانوں! تم کو روا نہیں کہ عورتوں کو میراث میت سمجھکر زبردستی ان پر قبضہ کرلو" (سورۃ النساء-آیت ۲۳) عورتوں کی وراثت قائم کی اور ترکہ میں ان کو مردوں کا حصہ دار قرار دیا اور ہدایت کی کہ "ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں تھوڑا ہو یا بہت مردوں کا حصہ ہے اور ایسا ہی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں عورتوں کا بھی حصہ ہے اور یہ ہمارا ٹھیرایا ہوا ہے۔" (سورۃ النساء-آیت ۷) کمسن بے یار و مددگار یتیم لڑکیوں کو اپنی ولایت میں لیکر ان کے مال و اسباب پر قابض ہونے کی نیت سے اِن کے ساتھ شادی کرنے کو جس کا کثرت سے رواج تھا منع کیا سخت شدید احکام نافذ کرکے عورتوں کی تذلیل کے خیالات کو مردوں کے دلوں سے دور کیا۔ مردوں کو عورتوں کی توہین کرنیکی

مسترحم اور دادخواہ مگر ساتھ ہی ساتھ شرار پاش جگردوز مستہزی اور بے امان نگاہیں جو کچھ نقاب کے پیچھے ہی سے برہم کن متانت ہوتی ہیں، وہاں آپ پر ہر طرف سے پڑتی ہیں۔ پورٹ سعید میں اسقدر نہیں۔ ان کے لیے قاہرہ جائیے اور اسکا پورا زور، کامل ہجوم دیکھنا ہو تو ذرا اور آگے بڑھیے، ذرا اور آگے اور استنبول پہونچیے پورٹ سعید بھی اور بندرگاہوں کی طرح جو محض بندرگاہ ہوں خصوصیات رکھتا ہے علمی چرچے کم اور تجارتی مشغولیتیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ مصر میں لباس میں رنگا رنگی کم اور یکسانیت زیادہ نظر آتی ہے یہ خصوصیت خدا نے ہندوستان ہی کو عطا فرمائی ہے کہ جتنے آدمی اتنے ہی لباس کے فیشن۔

پورٹ سعید کو ہم نے "فی امان اللہ" کہا اور کم سے کم ایک شخص نے تو ہمیں بھی پورٹ سعید میں "مع السلامۃ" کہہ کے رخصت کیا، اور ہم اسٹیشن پہونچے اسٹیشن پر؟ نہیں "محطہ" پر؛ اور قلی، نہیں "شیّال" نے، ہمارا اسباب نہیں عفش، بک، نہیں تخلیص کرایا۔ اسٹیشن پر نہایت پاکیزہ خط نسخ میں نوٹس بورڈوں پر لکھا ہوا تھا۔

"ناظر المحطہ"۔ "للستات" "التخلیص" نیچے "اسٹیشن ماسٹر" "فار لیڈیز" "بکنگ" لکھا ہوا

بادیۃ المصر اور بادیۃ السوداں میں ایک سانڈنی سوار کو جس کی زبان پیاس کے مارے تالوسے لگ گئی ہو، کوئی اوس اور کوئی پیار ٹھنڈے پانی کا وہ جان نہ بخشا ہوگا جو ان الفاظ نے مجھے بخشی، اور میں نے ان الفاظ کو پی کر اپنی جان کو خوب ہی خوب طراوت پہونچائی ٹرین آئی، اور اسپر ایک گاڑی پر لکھا ہوا تھا "للحریم" اف! صرف عورتوں کے لیے" دیکھتے دیکھتے طبیعت اسقدر اکتا گئی تھی کہ "للحریم" کا لطف کوئی

مجھسے پوچھے۔

ٹرین پر ہم سوار ہو گئے۔ صبح کا وقت تھا، ٹرین نے حرکت کی، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آکر مجھے لگنے لگی۔ یہ پیچھے کر دیا مصر خیز د، نہی تین بجے کے قریب ہم قاہرہ پہونچے۔ یہ میں آپ کے سمجھنے کے لیے قاہرہ کہتا ہوں، ورنہ مجھے کہنا چاہئے ہم مصر پہونچے، کیوں کہ اہل مصر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔

مصر القاہرہ کا اسٹیشن عالی شان ہے اور غالبًا اس قدر والا دودمان ہے کہ ہم جیسے کس مپرس، غریب الوطن آدمیوں کی خبر لینا اسکی شان کے خلاف ہے۔ اُس انبوہ میں، ہماری اور ہمارے اسباب کی خوب درگت بنی۔ قلیوں نے، معاف کیجئے گا سپاہیوں نے، شیطانوں نے، جو دام چاہے ہم سے مانگے اور جہاں ہم نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی، اور ہاتھ کے اشاروں اور سر کے ہلانے کے ذریعے کچھ اختلاف کیا، اور جھٹ انھوں نے ہمارا اسباب زمین پر پھینک دیا اور کہا لیجاؤ اپنا اسباب" یہ کمبخت اسباب بھی کیا کیا خوشامد کراتا ہے۔ ہمیں فوراً معذرت کرنی پڑی اور انکی موہنہ مانگی مزدوری (دو روپیہ) دینی پڑی۔ خوش قسمتی سے بہت جلد ایک ترجمان نے ہمیں اپنی حراست میں لے لیا؛ اور ہم اس نصیحت پر عمل کر کے کہ بہت سے لیٹروں سے نجات پانے کے لیے اپنے تئیں ایک قوی اور با اثر لیٹرے کے ہاتھ میں سونپ دو، ہم نے اپنے تئیں ترجمان صاحب کو تسلیم کر دیا۔

مصر کیا عجیب شہر ہے۔ تھوڑی دیر میں اس گہما گہمی میں اپنے تئیں اور اپنے خیالات کو یکجا نہ کر سکا۔ میں دراصل ایک چھوٹے سے قصبہ کا رہنے والا ہوں، اور اب بھی ایک چھوٹے شہر میں بس منتر و بانہ

زندگی بسر کرتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہوگی یا یہ کہ مدنیت مجھ میں پورے طور پر سرایت نہیں کر گئی ہیں بڑے شہروں کی شان و شوکت، امتزاج ثروت و فلاکت سے گھبرا اٹھتا ہوں۔ جب کبھی بمبئی یا کلکتہ گیا، یہی حالت ہوئی مصر پہونچا تو اس سے بدتر اگر قسمت کبھی لندن لے گئی تو کیا ہوگا۔ خیر میں کپڑے بدل اور تھوڑی سی دیر آرام کرکے بازار مصر کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ برقی ٹراموائے، بیچ بازار میں سے اس تیزی سے گذر رہی تھیں گویا ریل جا رہی ہے، پر گھوڑا گاڑیاں اور آمنی بسیں۔ اس کثرت سے ادہر ادہر جا رہی تھیں، کہ سڑک کی اک جانب سے دوسری جانب جانا سخت دشوار تھا۔

omnibus ×

اسپر آدمیوں کا اک دریا تھا کہ امڈا آتا تھا۔

"سجاد حیدر"

امام ابو حامد محمد الغزالی فرماتے ہیں جس صفت سے انسان انسان ہوسکتا ہے وہ ایک استعداد علوم نظریہ کے قبول کرنے اور پوشیدہ صنعتوں کی تدبیر پیدا کرنے کی جسکا نام عقل ہے جو لوگ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو کام میں لائے وہ صفات انسانی کے مقاصد اعلیٰ سے متمتع ہوئے، جنہوں نے اسکا استعمال جائز نہ کیا اور جو کچھ منکشف ہو چکا اسی کو غنیمت سمجھا وہ ادبار میں جا پڑے کیونکہ کسی شے پر بہرہ ور رہنے سے استغنا پیدا ہوتا ہے اور استغنا قوت عملیہ کو معطل کر دیتا ہے چونکہ یہ قوتیں انسان میں فطری ہیں اور کشف حقائق کا مادہ انسان کی سرشت میں رکھا گیا ہے اس لیے ہر انسان کا طبعاً میل خاطر اسکی طرف ہے اور اسی کے لحاظ سے بعض اقوام و ملل کی تقسیم بھی کی گئی ہے

کسی دل گرفتہ کی سیرِ چمن

جوشش وارفتگی اک روز حد سے بڑھ گیا — میرے دریائے توحش میں تلاطم تھا بپا
گریہِ بیتابیاں میں "خوف تھا احباب کو — "ایکدن دیوانہ ہم پائینگے اس بے تاب کو"
کہتے ہیں کچھ ہم سے اپنے رنج کی تصریح کر — غم بھلا مردِ خدا۔ کچھ شغل کر تفریح کر

مینے یہ مانا کہ وہ میدانِ وفا کے مرد ہیں
آہ! لیکن کب وہ لذت آشنائے درد ہیں

آزما دیکھا ہر صورت دلِ بے صبر کو — کام میں لایا تسلی کو۔ جفا کو جبر کو
ہاں مگر تعمیل پندِ دوست میں بہبود ہے — غمزدہ کو کوشش تفریح گو بے سود ہے
آ۔ دلِ ناداں! تجھے بہلائیں چلکر باغ میں — مست پریشاں کچھ ہو لیکن مچل کر باغ میں

کیا یہی ہے گلستاں جنت نشاں تفریح گاہ؟ — دے رہی ہے یا مرے دل کی طرح دھوکا نگاہ؟
دیکھتے ہی سبزہ گلزار کو یاد آ گئی — اپنوں کی بیگانگی۔ تقدیر کی خوابیدگی
اُف! صبا بھی ہے پریشاں خاطر و آوارہ گرد — نکلی اسکی خانہ بردوشی پہ دل سے آہ سرد
دیدہ پُر آب ہے یا یہ چمن میں حوض ہے — اشک حسرت ہیں کہ شبنم ہے مقام خوض ہے
لالہ کا داغ جگر عکسِ دلِ پر داغ ہے — پہلوئے صد چاک ہے یا گل ہے؟ یہ کیسا باغ ہے
کس لئے ہے آہ پرخوں بستر تو اے حنا! — تجھکو حسرت ہے خونِ گشتہ کی کیا بھائی ادا
جھومتا ہے کس لئے غصہ سے سروِ گلستاں — اسنے کیا اہلِ وطن کی دیکھ لیں بے مہریاں؟
ساکت و صامت کھڑا اک گوشہ میں شمشاد ہے — کون کہتا ہے کہ یہ پابندِ گل آزاد ہے
نرگسِ بیمار کو دیکھا تو حیرانی بڑھی — سنبل پُرپیچ سے دل کی پریشانی بڑھی

یا الٰہی اِن درختوں کی یہ شاخیں سرنگوں یا کسی ناشاد کا ہی بخت بد اختر نگوں؟
کس کے غم میں دردِ دروں میں نوجوانانِ چمن وقفِ فریاد و فغاں ہیں نغمہ سنجانِ چمن
ہے زبان پر آہ خوارے کے جاری یہ سخن لوٹ جا او بیخبر! ہے غم فزا سیرِ چمن
آگریں صیاد جور پیشہ بیداد و وحشی میں ترا ہمدرد ہوں او عندلیب نالہ کش!

دردمندوں کی قضا ہے یہ فضائے بوستاں ہیں انہیں تیغ دودم یہ برگ ہائے بوستاں
دمبدم پڑھنے لگا جب دردِ دل سوزِ جگر یادش آمد آہ! گفتارِ من شورِ بدہ سر
" ہو سکے تو مطلب دل اسکا برلا چارہ جو"
نعمتیں دنیا کی سب ہیچ ہیں دل گیر کو"

ز - خ - ش

اسوۂ حسنہ - الموسوم بہ **زندہ اور کامل نبی** - وہ لیکچر جو مولوی خواجہ کمال الدین صاحب بی اے - وکیل لاہور نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڈھ میں دیا اور جسمیں رسالت مآب صلعم کی مقدس زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں -
حق الامر یہ ہی کہ صداقت اسلام کا بہترین ثبوت خود آنحضرت صلعم کی زندگی ہی جسکی طرف کلام ربانی نے یہ اشارہ کیا ہی کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" لیکن اسوقت بہت بڑی ضرورت یہ ہی کہ اب سرورِ کائنات کے واقعات زندگی اسطرح قلمبند کئے جائیں جو مغربی دنیا کے سامنے پیش کئے جاسکیں یہ لیکچر جیسا کہ خود خواجہ صاحب تحریر فرماتے ہیں اس ضرورت کا پیش خیمہ ہے اور اس قابل ہے کہ تعلیمیافتہ مسلمان اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں -
ہماری یہ ہی دعا ہی کہ خدا وہ وقت جلد لائے جب خواجہ صاحب اس مقصد کی تکمیل فرمائیں اور ان کے قلم سے رسالت مآب صلعم کی مقدس زندگی کے وہ حالات لکھے جائیں جو ہم مغرب کے سامنے بھی فخریہ پیش کرسکیں **قیمت** ۸ر غالباً خواجہ صاحب سے ملسکتا ہے -

سکہ جات سلاطین گجرات

(۱) سلطنت گجرات

گجرات کو سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۵ء تا ۱۳۱۵ء) نے تیرہویں صدی میں فتح کیا۔ اس کے بعد کچھ کم سو برس تخت دہلی کے ماتحت رہا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں یہاں کے حاکم مفرح خاں نے بغاوت کی جس کی سرکوبی کے لیئے بادشاہ نے ظفر خاں کو روانہ کیا۔ ظفر خاں نے جب باغیوں کا استیصال کر دیا تو ۱۲۹۵ء میں اوسے یہاں کی صوبہ داری مل گئی جس کے بعد دو برس تک بادشاہ مطیع و فرمانبردار رہا۔ پھر سلطنت دہلی کی کمزوری سے فائدہ اوٹھا کر دوسرے صوبہ داروں کیطرح ۱۳۹۶ء میں اس نے بھی خودسری اختیار کی اور گجرات کا خودمختار حاکم بن بیٹھا۔

قوم راجپوت کے ایک ذی ثروت شخص سدھارن نے محمد تغلق کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تو بادشاہ نے اوسے اپنے اہل دربار میں شامل کر لیا جس کے بعد اوس نے روز بروز ترقی کرنی شروع کی، یہاں تک کہ وجیہ الملک کا خطاب پاکر امیر الامراء کے درجہ تک پہونچ گیا۔ ظفر خاں اسی کا بیٹا تھا

ظفر خاں نے جو بعد میں سلطان مظفر کے لقب سے مشہور ہوا گجرات پر چودہ برس حکومت کی اور اپنے زمانہ میں اطراف و جوانب کے بہت سے علاقے فتح کر لیئے۔ سہہ میں کچھ عرصہ تک مالوہ پر بھی قابض رہا۔ اس کے جانشین احمد شاہ نے جو تاریخ گجرات میں ایک بڑا اولوالعزم بادشاہ گذرا ہے سلطنت کو

خوب وسعت دی۔ اور شہر احمد آباد کی بنیاد ڈال کر اُسے اپنا دار السلطنت بنایا احمد شاہ کے پوتے سلطان محمود نے نہ صرف اپنی آبائی معرکہ آرائیوں کو جاری رکھا بلکہ بحیرہ قزاقوں کی سرکوبی اور پرتگیزوں کے استیصال کے لیے جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑہ بھی تیار کرایا۔ بہادر شاہ کے زمانہ تک گجرات کی سلطنت خوب عروج پر رہی۔ اِس نے مالوہ فتح کر کے مارواڑ کے بعض علاقے بھی لے لیے۔ ڈیو سے پرتگیزوں کو نکلوا کر ان کی کوٹھی کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے مرنے پر سلطنت کمزور ہونے لگی۔ گرد و نواح کی حکومتوں نے اپنی مخالفانہ کارروائیوں سے اس کی طاقت کو گھٹانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے گجرات کو فتح کر لیا۔

گجرات کی سلطنت ۱۳۹۶ء سے ۱۵۷۲ء تک تقریباً اسی برس قائم رہی اور اس عرصہ میں یکے بعد دیگرے، چودہ بادشاہ برسرِ حکومت ہوئے، جن کے نام اور سنین جلوس نیچے درج ہیں

(۲) سلاطین گجرات

وجیہ الملک

(۱) مظفر اوّل (ظفر خاں)
سنہ ۱۳۹۰ء - سنہ ۱۴۱۰ء

تاتار خاں

(۲) احمد شاہ
سنہ ۱۴۱۰ء - سنہ ۱۴۴۳ء

(۳) محمد شاہ
سنہ ۱۴۴۳ء - سنہ ۱۴۵۱ء

(۵) داؤد شاہ
سنہ ۱۴۵۸ء - سنہ ۱۴۵۸ء

(۴) احمد شاہ دوم
سنہ ۱۴۵۱ء - سنہ ۱۴۵۸ء

(۶) محمود شاہ
سنہ ۱۴۵۸ء - سنہ ۱۵۱۱ء

(۷) مظفر شاہ دوم
سنہ ۱۵۱۱ء - سنہ ۱۵۲۵ء

(۸) سکندر شاہ
سنہ ۱۵۲۵ء - سنہ

(۹) محمود شاہ دوم
سنہ ۱۵۲۵ء - سنہ ۱۵۲۶ء

لطیف خاں

(۱۰) بہادر شاہ
سنہ ۱۵۲۶ء - سنہ ۱۵۳۶ء

دختر
زوجہ عادل خاں والی خاندیس

(۱۱) میراں محمد شاہ
سنہ ۱۵۳۶ء - سنہ ۱۵۳۶ء

(۱۲) محمود شاہ سوم
سنہ ۱۵۳۶ء - سنہ ۱۵۵۳ء

(۱۳) احمد شاہ سوم
سنہ ۱۵۵۳ء - سنہ ۱۵۶۱ء

(۱۴) مظفر شاہ سوم
سنہ ۱۵۶۱ء - سنہ ۱۵۷۲ء

(۳) سکّہ جات شاہان گجرات

مورخین نے لکھا ہے کہ شاہان گجرات میں سب سے پہلے ظفر خاں نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرایا۔ مگر ڈاکٹر ٹیلر نے اپنے اوس مضمون میں جسکو اونہوں نے بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ جلد ۲۰ نمبر ۵۶ میں سکہ جات احمد آباد کے متعلق شائع کرایا تھا۔ اوس میں مورخین کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے اونکی رائے ہیں احمد شاہ اول سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے گجرات میں اپنا سکہ جاری کیا۔ اون کے اس بیان کی تائید اس سے بہی ہوتی ہے کہ شاہان گجرات کے اب تک جسقدر سکہ جات دستیاب ہوئے ہیں اون میں سب سے قدیم احمد شاہ کا سکہ ہے۔ پہر اس کے بعد سلطنت گجرات کے خاتمہ تک تمام بڑے بڑے بادشاہوں کے سکے ملتے ہیں۔

ان سکہ جات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان گجرات کے دار الضرب مختلف مقامات پر تھے۔ احمد شاہ اول کا سکہ احمد نگر میں مضروب ہوا تھا۔ پہر احمد شاہ دوم تک دار الضرب اسی مقام پر رہا۔ محمود شاہ اول کے زمانہ میں محمد آباد (چانپانیر) میں منتقل کردیا گیا۔ اور مصطفےٰ آباد میں بھی بادشاہ نے ایک نیا دار الضرب کہولا۔ اس کے بعد مظفر شاہ دوم کے زمانہ میں بعض سکے خان پور میں تیار ہونے۔ پہر یہ تمام کارخانے سلطنت گجرات کی تباہی تک برابر قایم رہے۔

(۴) تفصیل سکّہ جات

قسم	دارالضرب	تاریخ	رُخ اوّل	رُخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
(۲) سلطان احمد شاہ اوّل — سنہ ۸۱۳ھ - سنہ ۸۴۶ھ / سنہ ۱۴۱۰ء - سنہ ۱۴۴۳ء				
پیسہ	احمدنگر	۸۴۳	السُّلطان الاعظم ناصر الدنیا و الدین ۸۴۳	السُّلطان احمد شاہ شہر ھمایون
(۳) سلطان محمد شاہ۔ اوّل — سنہ ۸۴۶ھ - سنہ ۸۵۵ھ / سنہ ۱۴۴۳ء - سنہ ۱۴۵۱ء				
پیسہ	.	.	شاہ باد غیاث الدین محمد سکہ سلطان ۸۵	ماہ باد مُہر تاگردون قرص بدارالضرب
پیسہ	.	۸۴۶	السلطان الاعظم غیاث الدنیا و والدین	ابوالمجاھد محمد شاہ السُّلطان ۸۴۶
(۴) سلطان احمد شاہ دوم — سنہ ۸۵۵ھ - سنہ ۸۶۲ھ / سنہ ۱۴۵۱ء - سنہ ۱۴۵۸ء				

قسم	دار الضرب	تاریخ	رُخ اوّل	رخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
پیسہ	۰	۸۵۰۰	قطب الدنیا والدین ابو المظفر	السلطان احمد شاہ ۸۵ ......
پیسہ	—	۸۶۲	قطب الدنیا والدین احمد شاہ السلطان	خلیفة المومنین امیر خلدت الخلافة (۲ ب ۵)

(۶) سلطان محمود شاہ اوّل

سنہ ۸۶۳ھ تا سنہ ۹۱۷ھ . سنہ ۱۴۵۸ء تا سنہ ۱۵۱۱ء

قسم	دار الضرب	تاریخ	رُخ اوّل	رخ دوم
روپیہ	محمد آباد	۹۶	السّلطان الاعظم ابو الفتح ناصر الدنیا والدین	السلطان محمود شاہ شہر مکرم محمّد آباد ۹۶
روپیہ	محمد آباد عرف چانپانیر	۹۰۳	السلطان الاعظم ابو الفتح ناصر الدنیا والدین	شاہ محمود السُلطان (حاشیہ: ضرب شهر مکرم [illegible] عرف چانپانیر [illegible])
پیسہ	مصطفے آباد	۸۸۳	السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ۸۸۳ ابو الفتح	السلطان محمود شاہ شہر اعظم مصطفے (آباد)

قسم	دارالضرب	تاریخ	رخ اول	رخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
			(۹) سلطان مظفر شاہ دوم سنہ ۹۱۷ھ سے ۹۳۲ھ	سنہ ۱۵۱۱ء سے ۱۵۲۵ء
اشرفی	-	۹۲۴	المؤید بتائید الرحمن شمس الدنیا والدین ابو النصر	السلطان شاہ شاہ مظفر بن محمود
روپیہ	چانپور	۹۲۶	المؤید بتائید الرحمن شمس الدنیا والدین ابو النصر	السلطان مظفر شاہ ضرب چانپور ۹۲۶
			(۱۰) سلطان بہادر شاہ سنہ ۹۳۲ھ سے ۹۴۳ھ	سنہ ۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۶ء
پیسہ	-	۹۳۸	قطب الدنیا والدین ابو الفضل ۹۳۸	بہادر شاہ بن مظفر شاہ السلطان
			(۱۲) سلطان محمود شاہ سوم سنہ ۹۴۴ھ سے ۹۶۱ھ	سنہ ۱۵۳۷ء سے ۱۵۵۳ء
			الواثق باللہ المنان الفتح ناصر الدنیا والدین ابو	السلطان شاہ شاہ محمود بن لطیف ۹۴۷

قسم	دار الضرب	تاریخ	رخ اوّل	رخ دوم
۱	۲	۳	۴	۵
(۱۳) سلطان احمد شاہ سوم سنہ ۹۶۱ھ - سنہ ۹۶۹ھ . سنہ ۱۵۵۳ء - سنہ ۱۵۶۱ء				
			المعتصم باللہ الرحمن ابو المجاھد غیاث الدنیا والدین	السلطان شاہ شاہ عھد ۹۶۱ احمد بن محمد
(۱۴) سلطان مظفر شاہ سوم سنہ ۹۶۹ھ - سنہ ۹۸۰ھ . سنہ ۱۵۶۱ء - سنہ ۱۵۷۲ء				
			بتائید شمس	السلطان مظفر شاہ خلد اللہ ملکہ
			شمس الدنیا والدین ابو المجاھد	مظفر شاہ السلطان

حکیم سید شمس اللہ قادری

حیات بعد ممات

فوق الانسان کا مسکن کہاں ہے؟

یہ تو ہمیں معلوم ہوگیا کہ اجزائے قوامی جن کے وصل و اتصال سے انسان عالم ہستی میں آتا ہے، یا جن کے امتزاج سے مجموعہ انسانی ترکیب پاتا ہے ایک فقط روح ایک ایسی چیز ہے جو فنا کی دست برد سے بچی رہتی ہے۔ جسم کے تحلیل ہونے کے بعد، لاالفت کی شمع گل ہو جانے کے بعد، روح مادی بندشوں کو توڑ کر جنہوں نے اوسے دنیاوی علائق کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا چلی جاتی ہے، تاکہ پیار و محبت، حس و مس، تصور و خیال دور ہو، اور آزاد رہے اُس وجود میں جسکو خداوند تعالیٰ نے انسان سے برتر و برگزیدہ قوائے مدرکہ عطا فرمائے ہیں۔ اور جو فوق الانسان کہلاتا ہے، مگر اس خلق نو کا مسکن کہاں ہے؟

تمام راز نیچر کے طلبا اس امر سے بخوبی باخبر ہیں کہ ہمارے صفحہ ارض پر ذی حیات مخلوق اس افراط و بہتات سے پھیلی ہوئی ہے کہ ہماری ایک نگاہ، ہمارا ایک قدم، ہزارہا ذی روح وجود سے ٹکرائے بغیر نہیں اوٹھ سکتا۔ کرۂ ارض لاالفت کا ایک نہایت عظیم الشان خزانہ ہے۔ گھاس کی ایک جُتّی متّی پتی لیجئے اسے دیکھئے چھوٹے چھوٹے بیسوں کیڑے اس سے چپٹے ہوئے ہوں گے۔ لیکن آپکی نگاہ اس معائنہ کے لیے کافی نہیں، خوردبین کو اپنی مدد میں لائے اور پھر خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھئے اِس آلہ کی مدد سے آپ پر یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ گھاس کی ایک پتی متحرک آبادی کا مسکن ہے، جہاں بے شمار کیڑے پیدا ہوتے ہیں جو دن دونے

رات چوگنے ہوئے چلے جاتے ہیں اور نہایت تعجب انگیز سرعت کے ساتھ اس غیر محسوس مملکت میں ترکیب بھی پاتے ہیں۔

اس گھاس کی پتی سے آپ تمام روئے زمین کی نباتات کے متعلق نتیجہ نکال سکتے ہیں پانی جو زمین کی سطح پر بہتا ہے، یہ بھی بے شمار ولاتعداد وجود ترکیبی کا مسکن ہے قطع نظر نباتات وحیوانات، ندی اور نالوں کے، جنمیں جاندار جراثیم ننگی آنکھ کو نظر آتے ہیں، اگر آپ کسی کنڈ یا جوہڑ میں سے ایک چلّو بھر پانی لیں اور اوسکو خوردبین سے دیکھیں تو آپکو یہ چلّو کیڑروں کروڑوں سے پُر نظر آئیگا جو اسقدر ننھے ننھے ہوتے ہیں کہ جنکو بغیر آلہ کی مدد کے دیکھنا محال ہے، بہرحال وہ متحرک ہیں، اور نظام فطرت میں اپنی اپنی معین جگہ پر برسرکار ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک چلّو پانی کسقدر گھنا جراثیم سے آباد ہے۔ علاوہ پانی کے اُن جانوروں کے جو ظاہر ہیں، ہزارہا قسم کی مچھلیاں اور غلاف دار نباتی وحیوانی خاصیت والے کیڑے پائے جاتے ہیں۔ پانی کی ننھی ننھی بوٹیاں جو بغیر دوربین کے دکھائی نہیں دیتیں، اسقدر کثرت سے پانی میں موجود ہیں کہ جسکی انتہا نہیں۔ اِس چلّو بھر پانی سے آپ استنباط کر سکتے ہیں کہ تمام روئے زمین پر جو پانی پھیلا ہوا ہے، جس نے کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصّہ کو گھیر رکھا ہے، اسمیں جاندار مخلوق کسقدر ہوگی؟

سمندر کے پانی میں جو بے شمار زندہ مخلوق موجود رہتی ہے، اِسکو بخوبی سمجھنے کے لیے ہم ایک واقعیت کا اعادہ کرتے ہیں، جسکو ماہرین علم طبقات الارض خوب جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ عمارتوں میں جو قسم قسم کے پتھر کام میں آتے ہیں اور تمام وہ کنکریلی زمین جس سے کھریا مٹی کی چٹانیں اور سمندر کے کنارے بنے ہوئے ہیں، یہ تمام سیپیاں اور گھونگے ہیں، جو امتداد زمانہ میں گھس گھسکر منجمد ہوگئے ہیں اور جو نہایت قدیم ازمنہ میں سمندروں کی تہ میں جمے تھے۔

اس نوع کی تمام جمادات سیپیوں اور گھونگوں کے مجموعہ سے عالم ترکیب میں آئی
جب قدیم زمانہ میں جاندار مخلوق اسقدر کثرت سے پانی میں پھیلی ہوئی تھی تو ضروری
ہے کہ اب بھی اتنی ہی ہوا در اسی ایک طریق پر ہو، چونکہ قانون قدرت جو ابتدائے
آفرینش میں صفحہ ہستی پر مسلط تھا، وہی اب ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔
زمین اور پانی کی طرح ہوا بھی ذی روح کائنات کا مسکن ہے، اور نہایت عظیم الشان
مسکن ہے، ہم کو ہوائی طبقہ میں معدودے چند ذی روح مخلوق نظر آتی ہے لیکن
ایک متبحر عالم کی نگاہ تصور ظاہر اشیاء کے پار ہوتی ہے، اسکو ہوائی لکھو کھا
جانوروں کا وجود معلوم ہے۔ ظاہر بین لوگوں کو ہوا بالکل صاف و شفاف
معلوم ہوتی ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہوا اسقدر روشنی سے منور نہیں ہوتی،
جو ننھے ننھے ذروں کو ہماری نگاہ کے سامنے انکی اصلی صورت میں پیش
کرسکے۔ اس کیفیت کا تجربہ معمولی ہے، جو ہم کمرے کے دروازے بند کرکے
ذرا سی جھری رکھ کے مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ سورج کی کرن کے ذریعہ سے یا
چھوٹے سے روشن دان میں سے ہوکر ہوا کمرے میں پڑتی ہے، اور اندھیرے
میں صاف روشن نظر آتی ہے۔ اس کرن کی سلسبیل یا تار میں جس کے ارد
گرد اندھیرا گھپ ہوتا ہے، بہت ہی ننھے ننھے نازک ذرے ہوا کی حرکت
کے ساتھ اترتے چڑھتے چکر کاٹتے نظر آتے ہیں۔ اس شعاع سے آپ تمام
گرد و پیش بلکہ عالم کی ہوا کی ماہیت کا اندازہ کرسکتے ہیں، چنانچہ تمام روئے
عالم پر ہوا خاک کے ذروں سے پُر ہے۔

آپ کو معلوم ہے یہ تمام ذرے کس چیز کے بنے ہوئے ہیں! آپکو
یہ پڑھکر تعجب ہوگا کہ یہ تمام جاندار مخلوق ہے انہیں خوردبین سے نظر آنے
والی مائیکراسکوپک۔ نباتات کے جراثیم ہوتے ہیں جنھیں کرٹپوگیمیا کہتے ہیں

اور ننھے ننھے کیڑوں کے انڈے ہوتے ہیں، آپ سے آپ پیدا ہونے والے حشرات یا خود رو نباتات جن کے وجود کے متعلق فرانس اور ممالک یورپ کے فضلا میں نہایت گرمی سے بحث مباحثے ہو رہے ہیں، تمام انہی جراثیم سے جو ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں عالم وجود میں آتے ہیں۔ جب یہ جراثیم ہوائی پانی میں گر جاتے ہیں یا زمین پر اتر آتے ہیں تو ان سے مختلف النوع کیڑے اور جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسی قسم کی مخلوق کو ہم آپ سے پیدا ہونے والے کیڑے یا سبزۂ خود رو سے تعبیر کرتے ہیں یعنے ایک ایسی کائنات جو بغیر جرم کے، ایک ایسی پود جو بغیر سبب کے پیدا ہوتی ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ہر ذی روح وجود کے والدین ہوتے ہیں جن کی سائنس اور عقل سلیم تصدیق کرتی ہے۔

اس قسم کے کیڑے اور پودے جو اپنے سے بڑے حیوانات و نباتات سے اپنی زندگی قایم رہنے کے لیے غذا بہم پہنچاتے ہیں، ان کو پیراسائٹس یا مفت خور کیڑے کہتے ہیں۔ ہر ایک دودھ پلانے والے جانور کے پیراسائٹس ہوتے ہیں۔ انسان کے پیراسائٹ جوں۔ پسّو۔ کھٹمل ہوتے ہیں۔ اسی طرح عالم نباتات کے پیراسائٹس ہوتے ہیں۔ بلوط کے درخت پر ایک قسم کی بناس پتی اور اور کرٹوگمیا دبغیر پھول کے پودے) لپٹے ہوئے ہوتے ہیں، اور لطف یہ کہ تنوں پر تو بیل لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور جڑوں پر خاص قسم کے کرٹوگمیا پائے جاتے ہیں جیسے ٹرفل وغیرہ اس آئین قدرت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایک ذی روح وجود دنیا میں آیا اور دوسرے نے اس بات پر پیوند لگایا یا ڈیرے ڈالدیئے لیکن اسپر بھی مستزاد پیراسائٹس کے بھی پیراسائٹس ہوتے ہیں اور یہ اسقدر ننھے ننھے ہوتے ہیں کہ صرف خوردبین کے ذریعہ سے نظر آتے ہیں۔ بلوط کے درخت کی بناس پتی کی ایک پتی لیجئے اور اسکو خوردبین سے دیکھئے اور

ایک اسپو یا لیکھ کا بھی امتحان کیجیئے تو آپ استعجاب کے ساتھ شان قدرت کا نظارہ کریں گے کہ ان پیراسائٹس اور پیراسائٹس پلتے ہوئے ہیں جو ان پر اپنا پیٹ پالتے ہیں بڑے درختوں سے غذائی مادہ دکھائی دینے والے پیراسائٹس کے پیٹ میں جاتا ہے اور ان سے غیر نظر آنے والی مخلوق ملتی ہے۔ غرض مظہر کائنات کا عالم گونا گوں ہے۔ ایک ذراسی جگہ میں جاندار مخلوق پر مخلوق جمع ہے اور ایک دوسرے کے نشو ونما میں مدد پہنچاتی ہے اس واقعیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ خدائے جلّ وعلا نے کسقدر حیرت افزا بنات اور فسراط سے سمک سے سماک تک ذی حیات مخلوق کو آباد کر رکھا ہے

پس دیدہ ور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کرۂ ارض کی سطح، شیریں سمندر دریا، اور طبقہ ہوائی میں ان گنت جاندار مخلوق سکونت پذیر ہے زندہ جانیں زمین اور پانی و ہوا میں بھری پڑی ہیں۔ ہمارے کرۂ ارض میں جانیں نہی اور بڑی، ٹھوس ٹھوس کے بھر دی گئی ہیں۔

لیکن قدرت کا دور دورہ زمین پانی اور ہوا ہی پر نہیں ہے، ہوائی طبقہ کے اوپر اور ایک طبقہ ہے جسکو ماہرین علم طبیعیات اور ہیئت داں جانتے ہیں اور جسکو وہ پلینیٹری ایتھر کہتے ہیں۔

ہوا جو ہمارے کرہ کے چوطرف چھائی ہوئی ہے یا زمین پر خول کے مانند چڑھی ہوئی ہے وہ خلا میں اسکی گردش کے ساتھ آتی ہے جبکہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور یہ بہت اونچی نہیں ہے۔ ہوا کا دائرہ ہوائی تیس یا چالیس فرسنگ سے زیادہ نہیں ہے (ایک فرسنگ = ۳ میل) جسقدر آپ اونچے چڑھتے جائیں گے ہوا زیادہ لطیف ہوتی جائے گی تین یا چار فرسنگ پر ہوا اسقدر لطیف ہو جاتی ہے کہ اسمیں انسان سانس نہیں لے سکتا

ہوائی کرہ پر انسان ۶۔یا، ۷ میل سے زیادہ نہیں چڑھ سکتا۔کیونکہ اس بلندی پر ہوا کی کثافت اس درجہ کم ہو جاتی ہے کہ وہ دم لینے کے مطلب کی نہیں رہتی اور نہ جسم کے اندرونی دباؤ کو بیرونی اثر سے برابر تلا رکھتی ہے۔اس بلندی کے بعد ہوا اور بھی کم ہوتی جاتی ہے انتہا یہہ ہوتی ہے کہ کرہ ہوائی ختم ہو جاتا ہے اور پھر ہوا کا مطلق نام و نشان نہیں رہتا اس نقطہ سے وہ خیالی مقام شروع ہو جاتا ہے جسے ہیئت داں یا ماہرین علم طبعیات ایتھر کہتے ہیں۔

ایتھر ایک لطیف مادہ یا گیس ہے جو اس ہوا کے مشابہ ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایتھر بے انتہا لطیف جوہر ہے پلینٹری ایتھر کا وجود لا کلام بات ہے اسوجہہ سے کہ جب ہیئت داں اجرام فلکیہ کی رفتار کا شمار کرتے ہیں تو اس مقام سے گذرنے کی کشمکش اور مزاحمت کو بھی حساب میں لگا لیتے ہیں جیسا کہ وہ ان اجسام کی رفتار کی مزاحمت کو شمار میں لیتے ہیں جو ہمارے کرہ ہوائی سے ہو کر گذرتے ہیں۔لہذا ایتھر وہ سیّال مادہ ہے جو طبقۂ باد کے بعد آتا ہے یہ صرف ہماری زمین کے چاروں طرف ہی نہیں پھیلا ہوا ہے۔بلکہ اور تمام سیاروں کے چاروں طرف بھی ہے اور یہ وہیں تک محدود نہیں ہر جگہ موجود ہے سیاروں کے درمیانی فاصلہ میں بھی یہی حکومت پذیر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سیارے اور ان کے گرد کے چھوٹے چھوٹے اجسام جو نظام شمسی کو ترتیب دیتے ہیں یہ تمام ایتھر میں ہی گردش کرتے ہیں دم دار تارے بھی اپنے بعد المشرقین مسافتوں میں ایتھر سے ہو کر گذرتے ہیں

جاہل شخصوں کا خیال ہے کہ کرہ ہوائی جو ہمارے کرہ ارض کے چوطرف پھیلا ہوا ہے اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہے اور محض خلا ہے لیکن عالم نیچر میں خلا کہیں بھی نہیں خالی جگہ میں کچھ نہ کچھ موجود ہے خواہ زمین ہو یا پانی ہوا ہو یا پلینٹری ایتھر

یہ سچ ہے کہ جان کرہ ارض۔ پانی دھوا میں بھی ہوئی پھیلی ہوئی ہے۔ اور اسمیں شک کو مطلق گنجائش نہیں۔ اب رہا یہ کہ آیا ایتھر یا سیال مادہ کا طبقہ جو کرۂ باد کے اوپر ہے اور جس نے خالی جگہ کو پر کر رکھا ہے۔ یہ بھی ذی حیات مخلوق سے آباد ہے یا یہ ایک ایسا سوال ہے جو شاید کسی عالم متبحر نے اپنے دل سے نہ پوچھا ہوگا، ہماری رائے میں سخت تعجب کی بات ہے کہ لاالف جو پانی اور ہوا میں بھری ہوئی ہے، اس سیال مادہ میں مطلق نہ ہو جو ہوا کے بالکل مشابہ ہے۔ ہر بات یہی ظاہر کرتی ہے کہ طبقہ ایتھر میں مخلوق آباد ہے اور ضرور آباد ہے، لیکن وہ مخلوق کیسی ہے جو اسمیں آباد ہے؟ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ اسمیں وہ مافوق الانسان آباد ہیں جنکو ہم از سر نو زندہ خیال کرتے ہیں اور جو مکارم اخلاق میں درجۂ کمال رکھتے ہیں +

یلینٹری ایتھر کے کیمیائی اجزا معلوم نہیں کیا ہیں۔ مظاہر ہیئت نے اسکی موجودگی کا پتہ تو بتا دیا ہے لیکن اس کے مرکبات پر روشنی نہیں ڈال سکی۔ ہم خیال کرتے ہیں یہ کہنے میں کچھ ہرج نہیں کہ ایتھر کے اجزائے ترکیبی میں آکسیجن نہیں ہے، حقیقت میں کرہ ہوائی کی ہوا کا اصلی عنصر آکسیجن ہی ہے۔ چونکہ جوں جوں ہم کرہ ہوائی میں اونچے ہوتے ہیں ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے اور ہم مشکل سے سانس لیتے ہیں۔ اسلئے اغلب تھا کہ سانس لینے میں دقت ایک ایسے گیس کی قربت کے باعث ہوتی ہے جس میں ہم سانس لینے سے عاری ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کرۂ باد کے اونچے طبقوں میں جان کا زندہ رہنا محال ہے جب کوئی شخص غبارہ میں اڑتا ہے تو اسکی کیفیت ایسی مچھلی کی سی ہو جاتی ہے جسکا آدھا دھڑ پانی میں ہو اور آدھا ہوا میں۔ ایسی حالت میں مچھلی کا سانس رک جاتا ہے، تڑپنے لگ جاتی ہے اور جان پر بن جاتی ہے۔ بعینہ انسان کا یہ حال ہوتا ہے، جب وہ کرہ ہوائی سے طبقہ ایتھر کے قریب لگتا ہے

اسلیئے ہم بے تامل کہنے کو آمادہ ہیں کہ فی الواقعی پلینٹری ایتھر میں آکسیجن بالکل نہیں ہے یہ بات بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ پلینٹری ایتھر ہائیڈروجن گیس سے مرکب ہے جو اتم درجہ ہلکی ہے اور دباؤ کی عدم موجودگی کے باعث بے انتہا لطیف ہے اس لیے ہم یہ امر منظور کرنے کیلئے آمادہ ہیں کہ ایتھر جسمیں تمام ستارے گردش کرتے ہیں وہ بلاشبہ ہائیڈروجن گیس ہے۔ فضلائے یورپ کی کامل طریق الشمس کے متعلق جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آفتاب عالمتاب دہکتی ہوئی ہائیڈروجن میں گھرا ہوا ہے۔

ہمارے طبقہ ہوائی کے پرے، چرخ نیلی فام کے اوپر جو جگہ ہے اسکا ہر قوم کی زبان میں جنت نام ہے۔ اس لیے ہم بھی اپنے فوق الانسان کا مسکن جنت ہی کو جسے تمام دنیا مانتی ہے قرار دیں گے۔ کیونکہ یہ تسلیم کرنے سے ہم تمام دنیا کے مستند عقیدہ سے متفق ہوتے ہیں اور ہماری طبیعت کو اتنان داطمینان حاصل ہوتا ہے بہشت کا خیال نسل انسانی کی ہزارہا پشتوں کی دانائی کا نتیجہ ہے اور ایسی روایت جو ہر ملک، ہر قوم میں روز ازل سے عام تام ہو اور جس نے کبھی مخالفت کی باد سموم نہ کھائی ہو۔ سائنس کی نہایت زبردست تصدیق کا وزن رکھتی ہے۔

اِس کلام اور اس روایت کے مطابق جو قدیم الایام سے چلی آتی ہے، اور دنیا کے بڑے بڑے موجودہ مذاہب عیسائی مسلمان، بدھ جنت کو خدا کے پیارے بندوں کا گھر تصور کرتے ہیں۔

پس ہمیں معلوم ہوا کہ سائنس مذہب اور روایت اس باب میں یکزبان ہیں اور یہ فی الواقع سائنس کا ایک ایسا انکشاف تھا، جو مقدس مسیح کی زبان سے شہید بادشاہ کے بیٹے نکلا، جبکہ اسے سولی پر چڑھا گیا۔ سید شوکت۔ دہلوی

نامۂ حسین علیہ السلام

حبیب ابن مظاہر کے نام

تہا یہ مرقوم پس از حمد و تحیات و سلام　　　خط مرے دوست حبیب ابن مظاہر کے ہی نام

اے شفیق آپنے بھیجا تھا جو مجھکو پیغام　　　یعنی کوفہ میں کروں چند دنوں آکے قیام

چھوڑ کر اپنا وطن سبط پیمبر آیا　　　حسب تحریر معہ خویش و برادر آیا

اُس سفر میں مجھے ہر چند بہت کچھہ ہیں خطر　　　پر نہیں دوست کی مرضی سے کسی حال مفر

ساتھہ ہیں اہل حرم سخت بہت ہے یہ سفر　　　چھوٹے بچوں کو وہاں چھوڑ کے آتا کس پر

مطمئن دل ہے کہ احباب کے گھر آیا ہوں　　　حد کا اصرار ہوا جب تو ادہر آیا ہوں

مجھکو آنا نہ کسی طرح ادہر تھا منظور　　　پائے مکتوب تواتر تو ہوا ہوں مجبور

بعض اسطرح کی باتیں تہیں خطوں میں مسطور　　　جنکی تعمیل بہر حال ہوئی مجھہ کو ضرور

دوست بچپن کے ہو دلسے مرے ہمراہ ہو تم　　　کیا لکھوں اس سے زیادہ کہ خود آگاہ ہو تم

دی ہے آپکی احبا کو کئی بار خبر　　　بعض کے پاس روانہ کئے قاصد یکسر

مگر اس بات کا ابتک نہوا کوئی اثر　　　نہ جواب آیا کوئی ۔اور نہ وہ خود آئے نظر

اب ہیں بیعت کے بھی منکر یہ سُنا جاتا ہے　　　اسمیں گھاتا ہے انہیں کا مرا کیا جاتا ہے

تمکو دیکھا نہیں مدت سے بہت ہوں مشتاق　　　پاس آیا ہوں تو اتنی بھی جدائی ہے شاق

یا اخی اب جسے ملا ہے مجھے سرحد عراق　　　دمبدم دلمیں فزوں ہونے لگا درد فراق

اب توقف بہت اے دوست نہ فرماؤ تم

ماحصل یہ ہے کہ ممکن ہو تو جلد آؤ تم

میرزا ناشاد
عظیم آبادی

ایک دوسرے بھائی کا خط بہن کے نام

مسئلہ حقوق نسواں اس قدر پیچیدہ ہو گیا ہے کہ اس کا آسانی سے جلد سلجھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اسی ضمن میں پردہ کی بحث ہے۔ جسپر سلطان حیدر صاحب جوش (علیگ) نے اپریل کے تمدّن میں ایک خط لکھا اور جس کا جواب پروفیسر مشتاق احمد صاحب زاہدی نے جولائی میں دیا۔ اور اب مولوی شمس الاسلام صاحب تحریر فرما رہے ہیں۔

رسالوں میں کم اور اخبار و نمیں زیادہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی مضمون اگر وہ ایڈیٹر کی رائے کے موافق نہیں ہے بہت مشکل سے شائع ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نے یہ پہلے ہی اعلان کر دیا تہا کہ کوئی مضموں صرف اسوجہ سے کہ تمدّن کی رائے وہ نہیں ہے رد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تینوں مضمونوں کو نہایت خوشی درج کیا لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ جون کے رسالہ میں جو مضمون مولوی اشرف حسین صاحب کا "تمدّن" کے عنوان سے شائع ہوا اور اوس میں جو سوال قایم کئے گئے ہیں اگر اوپر کافی بحث کیجائے تو یقیناً سوسائٹی کے واسطے بہت مفید ثابت ہو گی۔

علی گڈھ ۸۔ جون ۱۹۱۱ء

پیاری بہن خدا تمہیں خوش رکھے محبت نامہ وصول ہوا۔ آپا سہیلی کے ہاں جانا اور اون کے بہائی (سلطان حیدر) صاحب کا خط پڑھنا سنا۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی خط ہے جو تمدن کے پہلے پرچہ میں

چھپا تھا۔ اگر وہ کھلی چھٹی میری نظر سے نہ گذری ہوتی تو تمہیں یہ مسئلہ سمجھانے میں قصہ بہت طولانی ہوجاتا۔ اور پھر بھی مجھے اندیشہ تھا کہ تمہاری دلجمعی نہ ہوتی۔ کیوں؟ کہ ممکن ہے تمہارے دلمیں سوال کچھ ہوتا اور میں بحث کسی اور پہلو پر کرتا۔

تمہارے بھولے پن پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ آتا تو سمجھو کہ وہ نہ منجانب اللہ کوئی حکم ناطق ہے اور نہ سوسائٹی کی طرف سے قول فیصل۔ پھر ان دو بولوں پر ایمان لے آنا یا جنم قید کا فتوی اسنکر ہراساں ہونا کیا معنے؟ ہر شخص اپنی اپنی رائے رکھتا ہے اور جب کسی بحث کا ایک پہلو اختیار کرکے اوس کی خوبیاں بیان کرنے پر آتا ہے تو لازمی طور پر دوسری طرف اوسے اتنے ہی عیب ہی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ نہ کوئی خوبی (سوائے اوس ذات واحد کے) بے عیب ہے۔ اور نہ کوئی عیب خوبی سے خالی ہے۔ الاّ ابلیس!

یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ مذہب کو (خاصکر کے) معرض بحث میں نہیں لائے ورنہ ایک اور دقت ہوتی۔ کیوں؟ کہ میں پہلے ہی "مسلمانی ودکتاب" کا قائل نہ تہا۔ میرے نزدیک رسم اور مذہب جُدا جُدا نہیں بلکہ سوشل قوانین ہی کے مجموعے کا نام مذہب ہے۔ اور رسم ورواج بجائے خود مذہب کا حکم رکھتے ہیں۔ اپنے ہی ہاں دیکھ لو کہ کیسی کیسی بدعتیں۔ اوہام پرستیاں اور ضعیف الاعتقادیاں جزو مذہب سمجھی جانے لگیں۔ جو لوگ اون کے پابند ہیں جا ہو کہ اپنے دلمیں غور کریں اوسے اون کے جواز کی تاویلیں گھڑنے کی فکر میں رہتے ہیں برخلاف اس کے بعض باتوں کی مذہب تو خوب دل کھول کے اجازت دیتا ہے مگر ہمارے ہاں چونکہ اونکا رواج نہیں اسلیے وہ جواز ہی بڑی بُری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کثرت ازدواج یا خلار وطلاق کے مسئلہ کو لو۔ نکاح کیا ہے؟
ایک سوشل معاہدہ ہی تو ہے اگر وہ عہد وپیمان پورے نہ ہوں اور آرام اور فائدہ
کی جگہ تکلیف ونقصان پہونچے تو بادی النظر میں وہ تعلقات کتنے ہی مضبوط
ڈورے سے بندھے معلوم دیں مگر میں تو اوس عہد کو اور اوس عہد کے ساتھ
اِس رشتہ کو بھی ٹوٹا ہوا سمجھتا ہوں۔ مگر ہمارے رسم ورواج کی بدولت صورت
واقعہ یہ ہے کہ طلاقاً تو طلاقاً زنِ بیوہ کو لوگ اِس قہر کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ
ستی ہوجانا اوس زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

حقیقت میں رسم ورواج قومی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ جس جہالت کے
زمانہ میں لوگوں اپنے واقعات زندگی یا تواریخ ملکی قلمبند کرنے کا شوق یا
سلیقہ تک نہ تھا تو اوس زمانہ کے حالات آخر کس طرح منکشف ہوئے؟۔
اونہیں کی زبان زد روایات یا حکایات نے اون کے تمدن پر روشنی ڈالی اور طرز
تمدن نے اون کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا۔ اسے تو تم بھی اسطرح آزما سکتی ہو کہ ایک
ہی کہانی کو دو مختلف حیثیت کے آدمیوں سے سنو۔ اون کی اوقات اور
انتہائے خیال بالکل صاف معلوم ہوجائیگی کہ ع فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اب اوسیطرح اِس "پردہ سسٹم" کی ماہیت پر غور کرو! بات یہاں تک تو
ٹھیک ہے کہ "جس چیز نے ہم کو ابتک بہت سے ناپاک اثرات سے محفوظ رکھا وہ
پردہ ہے"۔ مگر اسپر تمہاری سہیلی کے بھائی صاحب کو جو "فخر" ہے اور رہے گا
اوس کا میں قائل نہیں ع آنچہ فخر تست آں ننگِ منست۔

ہمارے ہاں کا پردہ دراصل پیوند ہے جامۂ کہنہ کا۔ آج اوسے اگر
اوٹھا دیں تو سارے عیب کھل جاتے ہیں۔ کیوں؟ کہ پردہ اوٹھانے کیلئے جن
لوازمات کی ضرورت ہے وہ اول سرے سے ندارد ہیں۔ ہم میں نہ تعلیم ہے نہ تہذیب

نہ ثروت ہے نہ لباس ہے۔

جبتک تعلیم عام نہو ہر زن و مرد کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہو نہ اون کے اخلاق و آداب ٹھیک ہوسکتے ہیں او رنہ چال وچلن ہی درست رہ سکتے ہیں کہ ع بے علم نتواں خدا را شناخت۔ گھر سے باہر ہی نکلے تو کیا تو دنیا کو سمجھیں گے اور کیونکر عجائبات دنیا سے متمتع ہونگے؟ ایک تو جہالت جسکا لازمی نتیجہ بے تمیزی بد تہذیبی اوپر سے مفلسی۔ بقول حالیؔ نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانیوالی۔ آرام و آسائش کے اسباب تعیش کے ساماں۔ نفاست کا خیال۔ مذاق کی خوبی۔ بات چیت کا سلیقہ۔ اوٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ۔ غرض دنیا بھر کی خوبیاں مفقود ہیں۔ زندگی کے اعلیٰ نمونے چراغ لیکر بھی ڈہونڈھیے تو مشکل سے ملیں گے اور ادنی مثالیں گلی گلی۔ کوچہ کوچہ۔ بلکہ گھر گھر اور چپہ چپہ پر آنکھیں بند کرکے دیکھ لیجئے۔

میں تو پھر یہی کہونگا کہ پردہ در اصل دہوکے کی ٹٹی ہے۔ یا یہ کہو کہ دوسرے دیکھنے والوں کی آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے لیکن بہن! تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ہزار ڈھکو لاکھ چھپاؤ مگر خط کا مضموں بھانپ جاتے ہیں لفافہ دیکھکر تم نے شاید تمدن کا وہ پرچہ نہیں دیکھا ورنہ مس اور مسز الیسٹ (مضمون) پڑھکر دانتوں میں اونگلی دے لیتیں ؎

قابل رحم ہے اوس شخص کی رسوائی بھی پردہ پردہ ہی میں کمبخت جو رسوا ہوجائے

اور ایمان کی پوچھو تو جو دیکھئے تھوڑا ہے پستی اور نکبت کی بھی آخر حد ہوتی ہے گھروں کو دیکھئے تو مرغی کے ڈربے معلوم ہوتے ہیں سامان پر نظر کیجئے تو کباڑی کی دوکان میں شاید رونق ہو مگر یہاں نہیں۔ بسر اوقات کو دیکھئے تو جانوروں سے بدتر لباس ہے تو ایسا ہی بدوضع بد قطع۔ دیکھئے تو اس گمان کو سوء ظن پر ہی محمول کرسکتے تھے لیکن "زنانہ حسن و لباس" دیکھکر تو پورا پورا یقین ہوگیا

کہ اس سے زیادہ لچر-پوچ پوشاک دنیا بھر میں نہیں ؛ بھلا کون بامذاق شخص دیکھ سکے گا کہ بیگم صاحبہ بھاری بھاری پائچے سنبھالے سمدھن بنی بازار میں چلی جا رہی ہیں یا اٹرا پاجامہ پہنکر چھاجن بجاتی سیر کو نکلی ہیں اور لوگ مشتاق ہیں کہ اب پیچھے پیچھے کوئی آرام دان اور ساز و سامان لیئے " اللہ کی امان ! اعلیٰ اعلیٰ مراتب ! " کہتا ہوا آتا ہو گا۔

اب تو تم پردہ کی حقیقت سمجھیں ؟ کہ اپنا گھٹنہ کھولئے اور آپ ہی لاجوں مریئے ، جو صاحب اس " پردہ سسٹم " پر ناز کریں وہ ہیں نہیں اسی میں سے ؟ کہ مجھے تو اُبالی ہی بھاتی ہے ،

قوم کے لیئے مایۂ ناز اور موجب افتخار ، کوئی چیز ہوسکتی ہے تو قومی کیرکٹر یا قوم کو اگر شرف ہوسکتا ہے تو بس اپنے عادات و اطوار قوت اخلاق ، تہذیب ، وشائستگی عام لیاقت ، اعلیٰ طرز تمدن اور عمدہ طریق معاشرت سے ، اور جب یہی نہیں تو فخر کی جگہ ، شرم کا مقام ہے !

خیر یہ تو وجوہات تھے اس رواج کے ، اب اسکی اصلیت بھی سن لو یہ تو کون کہے گا کہ پردہ فطری شے ہے ، اور جب یہ نہیں تو کوئی چیز ، قانون قدرت کے خلاف کہاں تک رائج رہ سکتی ہے ، یہ بھی ہمارے کردار کی سزا اور شامت اعمال سمجھو ، ورنہ جو قومیں ، خواہ ایشیائی ہوں یا فرنگی ، جہاں ترقی کے میدان میں آئیں اس رسم کو پس پشت چھوڑا۔ اور سچ بھی یونہی ہے کہ اگر سارا جہان ، اسی سختی کے ساتھ اس کا پابند ہو جائے تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ دنیا کے کل کاروبار نہیں تو گھر کے گھر یا کم از کم اکثر گھروں کے دھندے ضرور بند ہو جائیں ۔ ماما ئیں ۔ اصیلیں ، کام پیشہ عورتیں مزدورنیاں یا کسانیاں ، جو اپنے گھر والوں کا ہاتھ بٹاتی ، یا خود اپنی ہی محنت مزدوری کی

توماشاء اللہ بڑھ چڑھ کر کہیں کے کہیں پہونچ جاتے ہیں اور لڑکیاں ٹھہر ٹھہر کر وہیں کی وہیں رہ جاتی ہیں، قویٰ پر نظر کیجئے تو مرد صاحب تو ساٹھے اور پاٹھے مشہور ہیں مگر عورتیں بیسی اد کبیسی کہلاتی ہیں عقل کی یہ حالت کہ ناقص العقل، بالمثل ہیں، باورچی خانہ سے پرے، پرے خیال کی پرواز ہی نہیں توانائی کو لیجئے، تو وہی خدا کی بندی جو بچپن میں بعض اوقات لڑکوں سے بڑھکر قدم مارتی تھی، اب اس درجہ کو پہنچ گئی کہ ہل کر پانی پینے میں بھی تکلیف ہوتاہے، دو قدم چلیں ہی تو جگہ جگہ گری پڑتی ہیں۔ وہ پیاری سٹھو تمہیں یاد ہے۔ کہ جب نیا نیا لیا ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ پنجرے کی تیلیاں توڑ ڈالے گا یا پنجرے سمیت اڑ جائے گا، مگر کچھ مدت کے بعد جو کھڑکی کھولی تو بند رہتے رہتے بازو رہ گئے تھے، قوت پرواز کیسی کہ طاقتِ رفتار ہی نہیں رہی سہ

خوش حال ان کا، وہ جو گلستاں میں مر گئے　　حسرت نصیب ہم ترے زنداں میں مر گئے

میں تمھاری سہیلی کے بھائی صاحب سے پوچھوں گا کہ حضرت! یہ سلوک آخر کس حد تک روا ہے؟ اور جو کچھ اس گروہ کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے وہ اپنے دل میں ہاتھ رکھ کر یا پتھر رکھ کے؟ تن آسانی کی بھی حد ہونی چاہئے غضب خدا آپ تو کثرت بھی کرتے ہیں اور کھیلنے بھی جاتے ہیں۔ کلب کے ممبر بھی ہیں، گھر پر بھی بیٹھک بنا رکھی ہے۔ صبح سے شام تک یاروں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ شارٹ پارٹیاں بھی ہوتی ہیں اور سیر و شکار بھی۔ مگر یہ، تمھارے دامِ غفلت کے اسیر پرندے جو قفس میں، منقار زیرپر پڑے ہوئے ہیں، ان کی خوشی ان کی دلبستگی کا کہاں تک خیال ہے اُن کی باتوں سے تو میں یہ ہی سمجھتا ہوں کہ بقول نامہ نگار اخبار ڈیلی کرانکل "

وہ دنیوی خوشیوں سے بالکل اسی طرح محروم کر دی گئی ہیں جس طرح گرجا کی ننیں اور اُن جانوروں سے جو شوقیہ پنجروں میں قید کیے جاتے ہیں، کچھ ہی زیادہ وقعت رکھتی ہیں قربان ایسی الفت کے ؎

خوش نوائی نے رکھا ہمکو اسیر اے صیاد ہم سے اچھے رہے صدقہ میں اُترنے والے

میں حیران ہوں کہ جب خدا اور رسول کے نزدیک اُن کا ایک رتبہ ہاتھ پیروں کے لحاظ سے کچھ ایسا فرق نہیں، خداداد ذہانت میں مردوں سے کم نہیں، خلقی حیا۔ اور ایمان اُن میں موجود ہے تو اب کیا کسر رہی جو قوم کو پردہ اُٹھا دینے کے لیے تیار نہ کیا جائے، اچھے اور بُرے نمونے مردوں میں بھی ہوتے ہیں اور عورتوں میں بھی ہوں گے، بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ اگر ان میں تعلیم و تربیت اور تلقین و صحبت اچھی ملے تو عجب نہیں کہ جس طرح شریف مردوں کو، عورت کی عزت آبرو کا پاس ہوتا ہے۔ اسی طرح پڑھی لکھی تربیت یافتہ عورتوں کو نیک دل مردوں کا لحاظ ہو۔ اور جس طرح مرد اُن کی حفاظت کرتے ہیں، ایسی عورتیں بھی مردوں کے اخلاق کا خیال رکھنے لگیں، غرض سب سے بڑی بات سٹینڈرڈ آف موریلٹی (معیار تہذیب و اخلاق) کا بڑھانا ہے۔ اگر ہمارے اطوار درست ہوں، ہمارے اخلاق مضبوط ہوں۔ ہر زن و مرد اپنی ذمہ داری کو سمجھے تو پردہ میں ایسی کونسی خوبی ہے، جس کے لیے خواہ مخواہ ہی تنگ کیا جائے، جس طرح عصمت میں فرق آنا، ایک ان مٹ داغ سمجھا جاتا ہے اگر مرد اپنے دل میں غور کریں اور دوسرے کی بے آبروئی کے درپے ہونا ناقابل تلافی جرم اور ناقابل معافی گناہ سمجھ لیا جائے تو پھر کیا مجتّت رہی۔

رہی تعلقات کی کشیدگی، تو میں اُوپر لکھ آیا ہوں کہ جہانتک میں نے غور کیا عورت ہر طرح مساوات کی حق دار اور ہر لحاظ سے برابری کی جائز دعوے دار ہے۔ جتنی بیوی کی دلجوئی اور خوشنودی خاوند کو ملحوظ ہوگی اتنی ہی توقع وہ بیوی سے کرسکتا ہے! یہ نہیں ہوگا کہ جب وہ ماں باپوں کی فرماں برداری سے ہلکی ہوئیں تو اب میاں کی خدمت گذاری ہونے لگی مجھے تو مساوات کا مقتضا اور اس ترقی کا منتہا یہی معلوم ہوتا ہے ایک دن عورت مرد کی قید سے قطعی آزاد ہوجائے گی اور سچ ہے کہ حق بات کا مٹانا کارے دارد۔ اگر دعوے میں کچھ بھی جان ہے تو ایک نہ ایک دن ڈگری ملکر رہے گی۔ تعلقات کی کشیدگی کا خوف محض عارضی ہے، جب ہر طرح کی آزادی ہوگی تو نہ خلاف مرضی تعلقات ہوں گے، نہ تعلقات میں کشیدگی کی نوبت آئے گی۔ یہ باتیں تو جب ہی تک ہیں، جبتک ایک دوسرے کے حقوق اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ اپنی اپنی ذمہ داری کو نہیں پہچانتا ایک طرف تو عورتیں، صبر شکر کیئے، دبی دبائی بیٹھی ہیں اور دوسری طرف مرد صاحب ہیں کہ اپنی حکومت کے زعم میں آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں

خیر یہ تو باتیں تہ کی ہیں، ان کا حاصل ہونا فدا دیر طلب ہے اور شاید اسی خیال سے، اس خط کا مضمون، بجائے دلاسے کے تمہارا قلق اور بڑھا دے گا مگر اب تو تم مجھے معاف کردو کہ، وقت کوتاہ و قصہ طولانی ہاں بشرط فرصت میں اُن نکات پر بھی بحث کروں گا کہ فی الحال ہمیں اپنی بہنوں کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔ والسلام

تمہارا بھائی
محمد شمس الاسلام (علیگ)

عصمت

جہاں یہ مسلّم ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بہی خواہان قوم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ
خواتین کے مطالعہ کو ساتھ ہی عصمت ایک نعمت ہے جس میں نئی اور پرانی دونوں قسم کی [illegible]
ہی کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق مربی عصمت سے
بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت ان کو بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح
گذارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے
محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لیے انہیں
کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے سسرال
رشتہ داروں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں غرض ان کی آئندہ زندگی کو
تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و اطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ ملنا ناممکن ہے
بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں جو دقتیں
جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت ان کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے محل خرچ
خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کیے
ہیں ان کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل کر جب بڑے ہونے
والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے
عصمت بتائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف
کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو
سچ مچ کی بیگم بنائیگا۔

ٹائٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل۔ درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر خیالی بزم دل
بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانے والا۔ مذہب کی وقعت بتانے والا عصمت [illegible]
اور دیکھا ہوگا عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ہر مہینے ۱۲ صفحے کا رسالہ [illegible]
کے مول موتی ہیں۔ سالانہ قیمت (... روپے)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

جلد (۲) ستمبر ۱۹۱۱ء عدد (۹)

تمدّن

معاشرتی۔ تمدّنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا

مخزن

اڈیٹر شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۲۹

قیمت سالانہ قسم اول ۳ روپے قسم دوم ۲ روپے۔ قیمت فی پرچہ ۴ آنہ

ملنے کا پتہ: کتبہ احتراق [illegible] دہلی

تمدّن

یہ ۴۲ صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہی جو اسوقت ملک و قوم کے واسطے مایہ ناز ہیں

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پونچانا ہے۔

تمدّن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ تعصب اور پالٹکس سے علیحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز ردنہیں ہوسکتا کہ تمدّن اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدّن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں +

تمدّن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دویم باتصویر شائع ہوگا قیمت قسم اول ہے؍ قسم دوم ۸؍۔ نمونہ کا پرچہ (۴؍)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا

بنت نذر الباقر صاحبہ کوہاٹ۔ ایم لطیف الدین صاحب بمبئی۔ منشی مظفر خاں صاحب پہلور۔ بابو محمد شفیع صاحب کسولی۔ میر مہدی علی صاحب۔ شہید حیدرآباد دکن۔ منشی عبدالرزاق صاحب بسمل حیدرآباد دکن۔ منشی محمد محسن صاحب وٹرنری اسسٹنٹ۔ مولوی تصدیق احمد صاحب بھوپال۔ منشی سرور بیگ مرزا صاحب جھنگ۔ مولوی رضا حسین صاحب رضوی۔ منشی محمد حفیظ صاحب شاہ گنج۔ مسز منشی عزیز الدین صاحب کوئٹہ



مولانا راسخ دہلوی

تمدّن

ویسٹ منسٹر ایبی

عالم اسباب میں کوئی چیز خواہ وہ کسی قسم کی ہو جب انسان کی نظر سے گذرتی ہے تو وہ اوس کے حسن و قبح پر نظر ڈالتا اور اپنے ادراک کے موافق اوسکی نسبت اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور یہ کچھ نہیں دیکھتا کہ یہ چیز اسقدر تعریف یا مذمت کی مستحق بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چیز کی حقیقت کو جب دس پانچ آدمی بیان کرتے ہیں تو اون کے بیانوں میں اتحاد نہیں پایا جاتا انسانونکی صورتیں جسطرح مختلف ہیں اوسیطرح اونکی طبیعتوں میں بھی اختلاف ہے۔ اگر ایک شخص کسی چیز کی نسبت اچھی رائے رکھتا ہو تو یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ دوسرا شخص بھی اسکا ہمخیال ہو۔ اگر کہیں ایسا ہو بھی تو اوسکو فطرت کی کشش سمجھنا چاہیئے انسان جیسا مختلف الخیال ہے ویسا ہی سہو و نسیان سے بھی مرکب۔ ایک ایسی چیز کے جدا ہونے پر جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ عزیز تھی چند روز بعد اسطرح صبر کر لیتا ہے گویا اس سے وہ اسطرح ہی نہ تھا اسکی یہ فراموشی کیا ہے اوس شے کے فنا ہونے کی دلیل ہے۔ اسی اصول سے عالم کو حادث قرار دیا گیا ہے کہ ہر شے جو یہاں موجود ہے فانی ہے۔ ہم سے پہلے کیسے کیسے نامور لوگ پیدا ہوئے لیکن آج اونکا نشان تک صفحۂ ہستی پر موجود نہیں البتہ کہیں کہیں اون کے ایسے آثار و علامات نظر آجاتے ہیں کہ کچھ مدت تک اون کی اونکی یاد دنیا میں باقی ہے مگر بعض تو ایسے بے نام و نشان ہوئے اور اونکی ذاتی اور صفاتی یادگاریں ایسی مٹ گئی ہیں گویا کبھی تھیں ہی نہیں کہیں کہیں کچھ نشانات موجود تو ہیں لیکن اون سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون تھے اور دنیا میں کیا کیا کام کر گئے ✣

غرض دنیا ایک اچھی خاصی عبرت گاہ ہے جہاں عبرت ٹپک رہی ہے چنانچہ ہم "وسٹ منسٹر ایبے" کو لیتے ہیں جس میں زمانہ کے تلوّن۔ دنیا کی بے ثباتی اور عبرت و نصیحت کی بہترین مثالیں موجود ہیں +

انگلستان کی قدیم ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ایبے" کی عمر بہت دراز ہے اور اسکی بنیاد قایم ہوئے ہزار سال سے بھی زیادہ زمانہ گذر چکا ہے ابتدا میں اسکی حیثیت ایک چھوٹی سی خانقاہ سے زیادہ نہ تھی جسکو سینٹ المعظم "ڈنسٹن" کے زمانہ میں چند راہبوں نے بنایا تھا۔

چونکہ دریائے ٹیمز کو جس کے کنارے اب کثرت آبادی کیوجہ سے محدود ہو گئے ہیں قدیم زمانہ میں پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر دور دور تک کی خبر لے اس لیے جب دریا کو تلاطم ہوتا اور موجیں بلند ہو کر پہاڑوں سے ہمسری کا دعوی کرتیں تو ریت مٹی۔ کنکر پتھر۔ وغیرہ "ویسٹ منسٹر" میں جمع ہو ہو کر ایک ایسا انبار لگتا جاتا تھا جو تھوڑے ہی زمانہ میں ایک اچھا خاصہ ٹیلہ بن گیا جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس ٹیلہ کے استحکام میں ترقی ہوتی گئی حتٰی کہ اس ریت و مٹی کے تودے نے جزیرہ کی صورت اختیار کر لی اور تھارنی "آئلینڈ" کے نام سے مشہور ہو گیا +

تھارنی آئیلنڈ کے منظر کی خوبی کچھ وہی لوگ بخوبی معلوم کر سکتے ہیں جنھوں نے ندیوں یا تالابوں میں اس قسم کے خوشنما جزیرے دیکھے ہوں آس پاس دور دور تک شفاف پانی کی وسیع سطح پر جو سورج کے نورانی عکس سے منعکس ہو ہو کر چاندی کے پتر کیطرح چمکتی تھی کشتیاں۔ جہاز بجرے وغیرہ بکثرت تیرتے نظر آتے تھے اور اون کے رنگ برنگ کے جھنڈے اور پھریرے ہوا میں لہرا لہرا کر کچھ عجیب دلفریب اور دلاویز سماں پیدا کرتے تھے۔

غرضکہ کچھ تو منظر کی دلفریبی اور کچھ جزیرہ کی تنہائی بخش جگہ نے جو آبادی سے فاصلہ پر واقع ہونیکی وجہ سے دنیوی شور و شغب سے پاک تھی ان تارک الدنیا راہبوں کو مجبور کیا کہ وہ یہاں خلوت گزیں ہو کر ریاضت کے لیے ایک چھوٹی سی خانقاہ کی بنا ڈالیں +

آہ! اس مشہور اور مبارک خانقاہ کا بنیادی پتھر رکھتے وقت اونہیں کیا خبر تھی کہ

کہ کسیوقت میں یہ چہوٹی سی خانقاہ کلیسائے اعظم بن جائیگی اور جہاں اونہوں نے اوسوقت ایک معمولی عبادت گاہ کی بناڈالی تہی وہ ایک ایسی وسیع الشان اور عالی منزلت عمارت کا بنیادی پتہر ثابت ہوگی جسکی زمین میں علاوہ شاہان انگلستان کے ایسے ایسے کاملین علوم و فنون مدفون ہوں گے جن کا ستارۂ فیض نصف النہار پر چمک کر دنیا کو اپنی شعاعوں سے منور کر دیگا الحاصل اسی مختصر خانقاہ کو "ایبے" کی تعمیر کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے +

جب شاہ ایڈورڈ[۱] دی کانفسر نے جو فطرتاً پرہیزگار و متقی تہا ان تارک الدنیا راہبوں کو آزادی و بیفکری کے ساتہ خوبصورت و عافیت بخش جزیرہ میں زندگی بسر کرتے دیکہا تو اوس کے فطری زہد و تقویٰ نے اوسے اسبات پر مجبور کیا کہ وہ بھی انہیں راہبوں کے قریب اپنا محل تعمیر کرائے۔ چنانچہ بہت جلد اسکی تکمیل ہوگئی اور نہ صرف اوس نے اپنے ہی لیے ایک عالیشان محل بنوایا بلکہ اسی چہوٹی سی خانقاہ کے متصل راہبوں کے لیے ایک نہایت عالیشان کلیسا بھی بنوادیا جو ۲۸ دسمبر ۱۰۶۵ء کو عبادت گاہ کے لیے وقف ہوا لیکن افسوس! اِس کے چند ہی روز بعد ۵ جنوری ۱۰۶۶ء کو اِس بادشاہ کا انتقال ہوگیا اور یہ اسی کلیسا کے صحن میں دفن کیا گیا۔ ایڈورڈ کی زاہدانہ زندگی نے اوسکو جیتے جی ایک مقدس راہب مشہور کر دیا تہا۔ مرنے کے بعد تو وہ ایک باعظمت ولی خیال کیا جانے لگا اور ہمیشہ اوسکی قبر پر زائرین کا ہجوم رہنے لگا۔

المختصر "ایبے" کا پہلا بانی "ایڈورڈ" تہا اس کے بعد ہی بعض بادشاہ اسکی تعمیر میں کچہ نہ کچہ اضافہ کرتے گئے۔

"ایبے" کا بیشتر حصّہ جسکو اب ہم موجودہ حالت میں دیکہتے ہیں ہنری سوم کا بنایا ہوا ہے جس نے ایڈورڈ کے تعمیر کردہ کلیسا کے شرقی حصّہ کو ڈہا کر دوبارہ تعمیر کرایا اور ایڈورڈ کی لاش کو وہاں سے ایک دوسرے خوبصورت مقبرے میں منتقل کر دیا۔ اوسکا ارادہ تہا کہ کل کلیسا کو منہدم

[۱] انگلستان کا بادشاہ گزرا ہے اس کے کانفسر (تصدیق کرنے والا) کے لقب سے مشہور ہونیکی وجہ یہ ہے کہ وہ دین مسیحی کا بڑا راسخ الاعتقاد خادم تہا +

کری لیکن یہہ خواہش اوس کے بیٹے ایڈورڈ اول۔ رچرڈ دوم ہنری پنجم اور چند اسقفوں کے ذریعہ سے شدہ شدہ تکمیل کو پہونچی۔ نیز اوس چیپل سے جو ایبے کے مشرقی حصہ میں واقع ہی اور اوس قصیدہ سے جو پتھر میں کندہ ہی ثابت ہی کہ ہنری ہفتم بھی اسکی تعمیر میں حصہ لینے سے محروم نہیں رہا۔ اور غربی دروازوں کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہی کہ وہ ۱۷۴۰ء تک بھی تکمیل نہیں پاسکے تھے غرض موجودہ کلیسا ایک عہد یا ایک بادشاہ کی بنائی ہوئی عمارت نہیں ہی بلکہ اوسکی مختلف طرز تعمیر ثابت کرتی ہی کہ وہ مختلف عہدوں اور مختلف بادشاہوں کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچی ہی

ولیم فاتح کے زمانے تک ایبے میں کسی بادشاہ کی تاجپوشی نہیں ہوئی لیکن چونکہ ولیم فاتح ایڈورڈ کانفسر کا حقیقی اور جائز وارث مانا جاتا تھا اس لیے اوسکی تاجپوشی کی رسم کا ایڈورڈ ہی کی پہلو میں ادا کیا جانا مناسب سمجھا گیا اور اس لحاظ سے ولیم ہی وہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے ایبے میں تاج شاہی سے اپنے فرق کو زینت بخشی پہر تو اوس کے بعد جتنے بادشاہ گذرے اونکی تاجپوشی کی رسم یہیں ادا ہونے لگی۔ اسی غرض سے کانفسر کے چیپل میں تاجپوشی کی دو کرسیاں رکہی ہیں جنمیں سے ایک تو خاص ولیم و میری اور دوسری شاہ ایڈورڈ اول کے لیے بنائی گئی تہی۔

چونکہ کانفسر زہد و تقوی اور ریاضت میں ایک باخدا راہب کیطرح مقدس خیال کیا جاتا تہا اس لیے اوس کے بعد کے اکثر شاہان انگلستان اوس کے چیپل میں دفن ہونا اپنے لیے ذریعہ نجات اور ایک عظمت عظمی خیال کرتے تھے چنانچہ اسی خیال سے ہنری سوم نے اوسکی لاش کو ایک دوسرے خوشنما مقبرہ میں منتقل کرکے اوس کی قبر پر ایک بڑا گرجا بنا دیا۔ اور خود بھی اوسی میں دفن ہوا۔

ایڈورڈ اول معہ ملکہ الینور۔ ایڈورڈ سوم معہ ملکہ فلپانا و تہامس آف وڈاسٹاک رچرڈ معہ ملکہ آنی اور ہنری پنجم معہ ملکہ کیا تہراین اسی گرجا میں مدفون ہیں۔ ہنری ششم نے بہی یہیں اپنی قبر کیلیے جگہ منتخب کی تہی گو سرنوشتہ تقدیر کے تقاضے سے

سینٹ جارج کے چیپل میں دفن ہوا جو "ونڈسر" میں واقع ہے +

ہنری ہفتم کے مقبرے میں خود ہنری اور اسکی ملکہ الزبتھ کے علاوہ ایڈورڈ ششم۔ جیمس اول معہ ملکہ آنی۔ چارلس دوم آنی ہائیڈ ملکہ جیمس دوم ولیم سوم اور میری ملکہ آنی جارج دوم معہ ملکہ کیرولائن اور اور بہت سے شہزادے اور شہزادیاں مدفون ہیں نیز اسی مقبرے میں ایک زمانے تک کرامول براڈشا۔ اور بلیک کی لاشیں بھی دفن رہیں لیکن جب چارلس دوم۵ نے تخت حکومت پر قدم رکھا تو حمیت و تعصب سے ان سب کی لاشیں وہاں سے نکلوا دیں

اب ہم طوالت کے خیال سے صرف مشہور شعراء کا ذکر کرتے ہیں جو عموماً عبرت کے ساتھ پڑھے جانے کے قابل ہے۔

ایبے کا نقشہ قریب قریب ایک صلیب کی شکل سے ملتا جلتا ہے جس کے جنوبی بازو کے جنوبی و شرقی حصہ کو شاعروں کی دفن گاہ ہونیکا فخر حاصل ہے اور اس عمارت کے بقیہ حصہ میں دوسرے مشہور معروف علماء و فضلا وغیرہ مدفون ہیں۔ زایرین کو ہر جگہ پر ہر قدم پر ایسے ایک نہ ایک شخص کی یادگار ملتی ہے جو اپنی قلم کے ذریعے شہرت دائمی حاصل کر چکا ہے اس حصہ میں تمام یادگاریں ایسی نہیں ہیں کہ جن میں اہل یادگار کی لاشیں بھی مدفون ہوں بلکہ اکثر ایسی بھی ہیں کہ جن کے کتبہ پر ہم نامور شاعر کا نام دیکھتے ہیں لیکن اوسمیں اوسکی لاش نہیں ہے۔ چنانچہ شکسپیر۔ اسٹراٹ فورڈ میں ملٹن لندن میں۔ برنس پرس میں۔ لانگ فیلو امریکہ میں اور بن جانسن ایبے کے دوسرے حصہ میں دفن ہیں لیکن ان سب کی یادگاریں شعراء کی صف میں موجود ہیں۔

سب سے پہلے جس شاعر کو شعراء کے سلسلہ میں جگہ ملی وہ "چاسر" تھا گویا یہ کہنا چاہئے کہ "چاسر" اس سلسلہ کا بادشاہ ہے اور دوسرے تمام شعرا اس کے زیر حکومت روحانی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ چاسر کی یادگار کے قریب لانگ فیلو کا نصف پیکر

۵ چارلس اول کے زمانہ میں جو خونریزی خانہ جنگی ہوئی تھی اوس کے بانی مبانی یہی لوگ تھے ۱۲

کہڑا ہے اور اسی کے قریب ڈرائیڈن - بومانٹ کاؤلی اور ڈرتین، آرام کر رہے ہیں ڈرتین کا کتبہ جو نہایت موثر الفاظ میں کندہ ہے یہ ہے:-

"اے سنگ مرمر کی یادگار - انگلینڈ کو یاد دلا کہ وہ اور اوسکی آیندہ نسلیں اوس"
"ناموڑ ڈرتین کی کس قدر زیر بار احسان ہیں جسکی مقدس اور متبرک خاک کو"
"ہم نے تیری حمایت میں سپرد کر دیا ہے"
" اوس کی یادگار کو زمانہ کے امتداد سے بچاتی رہ اور اوسکی کہانی کو لوگوں کے"
" حافظہ میں تازہ رکہہ۔ اور خدا کرے کہ تو اوسکی عظمت و شان کی ایک ایسی یادگار ثابت ہو"
" جب اوسکی لاش خاک ہو جائیگی تو یاد رکہہ کہ اوسکا نام جو صفحہ ہستی سے مٹنے"
" والا نہیں ہی تیرے لیے ایک ایسی یادگار ثابت ہوگا"

"ڈرتین کی یادگار کے قریب ہی ایک دوسرے بڑے شاعر کی یادگار ہے جس پر"
" جلی حروف میں "آہ! یگانہ روزگار - بین جانسن" - کندہ ہے"
"چاسر کے بازو اسپنسر مدفون ہی جسکا حسب ذیل کتبہ بھی پڑہنے کے قابل ہی"
" یہاں چاسر کے قریب اسپنسر لیٹا ہوا ہے، جو مضمون آفرینی میں"
" ثانی چاسر تھا اور اب بھی قبر میں اسیکے پہلو بہ پہلو آرام کر رہا ہی"

اسپنسر کا کتبہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں ملک الشعرا تھا اور اوسکی تصانیف اوسکی خداداد نکتہ سنجی کی پوری پوری شہادت دیتے ہیں تبلر ملٹن - اور گرے کی یادگاریں اس کے بعد آتی ہیں بہت سے نامور فضلا کی قبروں کو طے کر کے جنکو قریب قریب اب زمانہ بہول گیا ہی "گرانول شارپ" کی قبر کے پاس آتے ہیں جس کی ان تہک کوششوں نے اخیر میں یہ ثابت کر دیا تہا کہ:-

" انگلستان میں غلام غلام نہیں رہ سکتے اونکو سرزمین برطانیہ کی ہوا لگی کہ "
" اسیوقت آزاد ہو گئے اور اونہوں نے ہماری ملک میں قدم رکہا کہ اوسیوقت "

"اون کے گلوں سے طوق وزنجیر گر پڑے"

ایسکی ذیل میں ہمکو کیا تبل۔ ساؤدی کالرج شکسپیر برنس تہامسن اور "گے" وغیرہ کی یادگاریں ملتی ہیں "گے" کے پڑوس میں گولڈ اسمتھ سو رہا ہے جسکا لاطینی خوبصورت کتبہ جو ڈاکٹر جانسن کی قابلیت کا نتیجہ ہے یہ الفاظ ظاہر کرتا ہے:۔

"بمشکل کوئی صنف باقی رہ گئی ہوگی جس میں اوس نے قلم نہ اوٹھایا ہو اور"
"جو کچھ اوس نے لکھا خوب لکھا۔"

"اوس کی یادگار کو اوس کے دوست اور ساتھی خلوص و محبت۔ اور"
"ناظرین ادب و تعظیم کے ساتھ بوسہ دیتے ہیں"۔

گولڈ اسمتھ کی موت کے دس ہی سال بعد ڈاکٹر جانسن کے دن اخیر ہوگئے اور وہ اوسی کے قریب دفن ہوا۔ اڈیسن، ڈکنس، تہاکری، میکالے اور ہینڈل، ایک دوسرے کے قریب لیٹے ہوئے ہیں اڈیسن کی قبر پر یہ کتبہ کندہ ہے:۔

"ان حجروں میں جہاں کہ نامور لوگ دفن ہیں اوس وقت سے جب سے کہ اون کی بنیاد"
"پڑی ہی کوئی ایسا نیک اوصاف مہمان نہیں لایا گیا اوس نزہت گاہ میں"
"جہاں خوشی لازوال ہی ایسی خوبصورت روح نہیں پہونچائی گئی"
"افسوس! وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا! ہمیشہ کے لیے ہماری الوداع"
"قبول کرو اور اطمینان سے اپنے عزیز "مانٹ گیو" کے بازو آرام کرتا رہ"۔

ان سب کے بعد زمانہ حال میں جو شاعر شعرا کی صف میں داخل ہوا ہے وہ نازک خیال اور فطری شاعر "ٹنی سن" ہے جسکا کتبہ خود اوس کے لفظوں میں اسطرح کندہ ہے:۔

"اوس کی روح پر ایک سلطنت کا ماتم برپا ہے، اور ایک زبردست"
"قوم اوسکی موت پر نوحہ پڑھ رہی ہے"۔

سید اللہ بخش ادیب۔ مہدوی

غرۂ شوال

یا

ہلال عید

غرۂ شوال اے نورِ نگاہ روزہ دار
آکہ تھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریر پیامِ عید ہے
یعنی تیری شام صبح عیش کی تمہید ہے
سرگذشت ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
اے مہ نو ہم کو تجھ سے الفت دیرینہ ہے
جس علم کے سایہ میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم
دشمنوں کے خون میں رنگیں قبا ہوتے تھے ہم
زندگی تیری جبیں بوسی اسی رایت کی ہے
حسن روز افزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے
آشنا پرور ہے قوم اپنی وفا آئین ترا
ہے محبت خیز یہ پیراہن سیمیں ترا
وسعتِ ہستی میں گو فرقت تجھے منظور ہے
اے فلک مسکن افق گردی ترا دستور ہے

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ اور انکی برق رفتاری بھی دیکھ
راہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھکو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ انکی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارش سنگ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے انکی خودداری بھی دیکھ
جسکو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
رہ گئی اپنی کہن دامی سے ہم محروم صید
اس چمن میں اپنی قسمت کی نگوں ساری بھی دیکھ
مکر کے پھندہ میں شہباز مراکش آگیا
امت عیسے کا آئین جہانداری بھی دیکھ
ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ کر خاموش رہ
شورش امروز میں محو سرود دوش رہ

اقبال

فریڈرک دوم

(جس نے عربوں کے طرز پر سب سے پہلے یورپ میں یونیورسٹی قایم کی)

اسوقت جبکہ سر آغا خان مسلم یونیورسٹی کے لیے بے انتہا کوشش کر رہے ہیں اور اوس کے خوش آیند خیالات سے قوم میں ایک سرور طاری ہے ہمارے اکثر اخبارات اور لکچرار مسلم یونیورسٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یونیورسٹی کا طریقہ یورپ نے مسلمانوں سے حاصل کیا لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مسلمانوں سے اخذ کر کے یورپ میں سب سے پہلے یونیورسٹی سسٹم کس نے جاری کیا اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اوس شخص کے تذکرہ سے اردو داں پبلک کو مطلع کریں جو یورپ اور اسلام میں اس علمی عمارت کا واسطہ تھا۔

یہ مسلم ہے کہ آج یورپ کا تمام تر تمدّن عربوں سے ماخوذ ہے جیسا کہ خود اکثر منصف مزاج یورپینوں کو اسکا اقرار ہے کیونکہ ازمنہ مظلمہ اور وسطی کی جہالت کی تاریکی کو جس چیز نے دور کیا وہ درحقیقت قرطبہ اور غرناطہ کی وہ علمی روشنی تھی جو یورپ میں پہونچکر تمام عالم پر چھا گئی۔

سب سے پہلے جس شخص نے اِس روشنی کو یورپ میں پھیلایا وہ شارلمین شہنشاہ جرمن تھا جو ہارون رشید کا معاصر تھا جس نے اپنے دربار میں علما و فضلا و شعرا کا ایک اچھا خاصہ مجمع قایم کر لیا تھا۔ اُس کے دربار میں آٹھویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا شاعر (الکوین) موجود تھا۔ جو عبرانی، ولاطینی اور عربی زبان جاننے کے علاوہ فلسفہ او طبعیات کا خاص طور پر ماہر تھا۔ اُس کے بعد اسکا پوتا شارل جو یورپ کیطرف سے فرانس کا بادشاہ تھا اس کام کے لیے مستعد ہوا۔ اور اس نے

تہیہ کر لیا۔ کہ اس نویں صدی میں اپنے دادا کے پرانے کارنامے کو از سر نو زندہ کرے۔ چنانچہ اس کام کے لیے انگلستان کے بڑے عالم جون ارینا کو جو عربی، یونانی، اور عبرانی کے علاوہ فلسفہ اور طب کا ایک جید عالم تھا طلب کرکے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ لیکن افسوس کہ پوپ کی جابرانہ حکومت نے اس کے تمام دلولوں کا قلع قمع کر دیا۔ اور اس کی کل امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کنیسہ کیطرف سے اوس پر عجیب عجیب اتہامات لگائے گئے اور اوس پر کفر کا فتویٰ شائع کیا گیا۔ اس لیے وہ اپنی تمام آرزوؤں کو قبر میں اپنے ساتھ نہایت ہی حسرت و یاس سے لیگیا شارل گو مر گیا لیکن وہ عربی کتابوں کے تراجم کے ذریعہ سے آزادی کی ایسی روح یورپ میں پھونک گیا تھا جو پوپ کی کوشش سے نہ مٹی آخر سسلی میں فریڈرک کے وجود نے اس اثر کو اور زیادہ دیرپا اور مستحکم کر دیا۔

فریڈرک ثانی دنیائے تاریخ کا ایک بڑا اولوالعزم بادشاہ گذرا ہے۔ جس نے کہ یورپ کے علمی اور اجتماعی حالت میں ایک بڑا انقلاب پیدا کیا ہے۔ فریڈرک ثانی ملک اٹلی میں انکونا کے قریب مقام جانسی میں ۲۶۔ دسمبر سنہ ۱۱۹۴ء کو پیدا ہوا۔ سنہ ۱۲۵۰ء میں وفات پائی۔ سنہ ۱۱۹۶ء میں ولیعہد منتخب کیا گیا تخت سسلی (صقلیہ) کی اصلی وارث فریڈرک کی ماں کونسٹانس تھی لیکن کونسٹانس کے بدلے باپ کے مرنے پر فریڈریک نے تخت سسلی پر قدم رکھا۔

فریڈرک بچپن ہی سے نہایت ہی چست و ہوشیار ہوا۔ اوسکو علوم و فنون کیطرف ایک خاص رغبت تھی اوس زمانہ میں بالرم پایہ تخت سسلی مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا جنمیں بیشتر اہل علم اور اطبا موجود تھے اور اکثر فریڈرک کے مصاحبوں میں داخل تھے ان ارباب علم کی صحبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اوس کی علمی پیاس بجائے بجھنے کے اور تیز ہو گئی، اور اس نے جابجا ملک میں درسگاہیں قائم کیں

جن میں زیادہ تر عرب اور یہود پروفیسر ہوتے تھے ان درسگاہوں میں سے دو درسگاہیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں پہلی ناپولی کی درسگاہ اور دوسری سطرنو کا طبی مدرسہ۔ ان دونوں مدرسوں کے ذکر سے پہلے ہم سسلی اور عربوں سے عام تعلقات بیان کرتے ہیں،

اندلس کے عربوں کا اثر شروع شروع فرانس کے جنوبی حصہ پر پڑا۔ زوال اندلس کے بعد اکثر عرب جنوبی فرانس میں ہجرت کر گئے تھے جن کے ساتھ ساتھ علوم شائستگی، تمدن بھی جنوب فرانس میں پھیل گیا، تالیفات وتصنیفات کا رواج ہو گیا علوم وفنون کو ترقی ہوئی۔

عربوں کی اس ہجرت کا اثر گو تمام فرانس پر پڑا۔ لیکن مونٹپیلیہ کی یونیورسٹی اس سے زیادہ متاثر ہوئی کیونکہ اوسمیں فرانسیسیوں نے ایک طبی مدرسہ بھی قائم کیا تھا جسمیں ان مہاجرین عرب ویہود سے زیادہ مدد لی گئی انہوں نے اوسمیں علوم وفنون کی ترقی میں بے انتہا حصّہ لیا۔ گو تمام یورپ میں اِس درسگاہ کی شہرت ہوگئی اور وہ اسوقت تمام اطراف ونواح کا علمی روشنی اور آزادی کے اعتبار سے مرکز بن رہا تھا لیکن طرفداران پوپ ان باتوں سے کسی طرح سے راضی نہ تھے۔

سسلی کا بھی یہی حال ہوا۔ سسلی اندلس سے بالکل ملحق ہے اس لیے وہاں اندلس کے مسلمانوں کا بڑا اثر تھا کچھہ دنوں کے بعد عربوں نے اِس جزیرہ کو فتح بھی کر لیا اس لیے سسلی میں عربی رنگ بالکل غالب آگیا۔ اور یہہ اسقدر گہرا رنگ جما تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھہ سے نکلنے پر بھی نہ مٹا۔

اس کے بعد فریڈرک کا دور آیا اس کے عہد میں (یعنی تیرہوں صدی کے شروع میں) باشندگان سسلی ایک معجون مرکب تھے جن میں عرب

یونان - رومان - یہود - جرمن - نورمان - سب مختلط تھے - جو یونانی - لاطینی عبرانی - عربی - جرمنی - فرانسیسی وغیرہ بلاتکلف بولتے تھے - گویہ مختلف الاجناس قومیں تھیں لیکن پھر بھی ہر ادا سے اون میں عربیت کا رنگ نمایاں طور پر نظر آتا تھا خصوصاً طرز تعمیر میں عربی رنگ بے انتہا غالب تھا - اور مینارے گبند، برجیاں - عربی طرز کی خصوصیت کو ظاہر کر رہی تہیں -

سسلی میں مسلمانوں کی مفتوحی اور نورمانیوں کی فتح کے بعد بھی علم کا وہی چرچا رہا - تقریباً تمام اساتذہ اور پروفیسر وہی عرب یا یہود تھے جو اندلس کے مدارس کے تعلیمیافتہ تھے - خصوصاً طبی مدارس میں تو تمام انہیں لوگوں کا قبضہ تھا - کیونکہ نورمانی جو فاتح تھے بہت تھوڑی تعداد میں تھے اس لیے تقریباً تمام عہدے کل مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہے -

بادشاہان وقت اور اُمرا اون کو ہر بات میں ترجیح دیتے تھے - اور ذمہ داری کے تمام عہدے انہیں کے سپرد کرتے تھے - یہاں تک کہ فوج اور دفتر کا کام بھی انہیں کو سپرد کیا جاتا تھا خصوصاً بحری فوج میں بے انتہا انکی بھرتی ہوتی تھی - کیونکہ اسوقت کے جنگی بیڑے اکثر انہیں کی ماتحتی میں ہوتے تھے سسلی کی عام عمارتوں میں عربی طرز نمایاں تھا - فریڈرک نے شام سے معدنیات کے کام کے لیے اور مصر سے زراعت کی تعلیم کے لیے لوگ بلوائے تھے سلطنت عموماً سیاسی مہموں میں انہیں عربوں سے مدد لیتی تھی - یہاں تک کہ روما کے سفارت میں اور ڈیپوٹیشن تک میں یہی جاتے تھے -

وہاں کی سلطنت کی اور نیز ترقی یافتہ جماعت کی زبان عموماً عربی تھی - گو سسلی کے کل شہروں کا یہی حال تھا لیکن خصوصاً بالرم - سالرن - مسینا - سیرافوس وانیا میں عربوں کا اثر زیادہ تھا - مگر گاوں - قصبات اور دیگر مقاموں میں بھی

عربی عنصر کم نہ تھا +

سب سے پہلے فریڈرک نے مقام نابولی میں ایک یونیورسٹی قایم کی جس میں علاوہ اون لوگوں کے جو وہاں موجود تھے دور دور سے عربی عالموں کو بلا کر مقرر کیا۔ ممالک یورپ کے کتبخانوں کے علاوہ اندلس مصر۔ شام سے علمی کتابوں کے جمع کرنے میں سب سے بڑی مدد مسلمانوں سے ملی۔ اس ملک کا بحر متوسط میں ہونا بھی یورپ میں علمی روشنی پھیلانے میں بڑا ساعی ہوا۔ اسی واسطے مختلف طبقات کے طلبا دور دور سے یہاں کا قصد کر کے آتے تھے۔ کم استطاعت طالبعلم کو مفت تعلیم دی جاتی تھی سلطنت اپنی وسعت کے مطابق اوسکا پورا انتظام کرتی۔ اور ہر بات کا خیال رکھتی

فریڈرک کے عہد کا دوسرا مدرسہ سلرنو کا طبی مدرسہ تھا۔ پہلے پہل اس مدرسہ کو آٹھویں صدی عیسوی میں بعض عرب اور یہودیوں نے قایم کیا تھا لیکن درحقیقت اوس کی اصلی ترقی فریڈرک ثانی کے زمانہ میں ہوئی۔ اون کے کورس کا ماخذ طب میں بقراط اور جالینوس کی کتابیں۔ اور فلسفہ میں ارسطو کی کتابیں تھیں اور وہ کتابیں بھی اسمیں شامل تھیں جنکو عرب نے اصول یونانیہ سے اخذ کر کے اپنے رنگ میں ڈہال لیا تھا غرض کہ مدرسہ کا ایک خاص رنگ تھا جسمیں مسلمان نصاری۔ یہودی۔ دہریہ سب تعلیم پاتے تھے۔ اور اوستاد شاگرد دونوں میں سے کسی پر بھی مذہبی روک ٹوک نہ تھی بلکہ اوس کے بجائے یہ زیادہ مدنظر رہتا تھا کہ لوگ یہاں سے علم و فلسفہ کے جامع نکلیں۔

سالرن کالج میں علوم و فنون کی تعلیم بذریعہ املا لیکچر کے ہوتی تھی جیسے آجکل کالجوں میں ہوتی ہے۔

اوستاد تمام مسائل کو مشاہدہ اور تجربہ کے ساتھہ بتلایا کرتا تھا۔ خصوصاً علم تشریح کے مسائل۔ اوس زمانہ میں عیسائی مذہب میں مردہ کا چھونا حرام تھا لیکن عرب قرطبہ میں مردوں کی تشریح کرتے تھے اِس لیے سالرن کالج کے جرّاح بندر اور مثل انسان کے دوسرے جانوروں کی تشریح پر اکتفا کرتے تھے اور جب کبھی ایسی ضرورت انسانی جثہ کی تشریح کی لاحق ہوتی تو پوشیدہ طور پر اسکو عمل میں لاتے۔

اس کالج کو اون کے اوستادوں کے علم تشریح وغیرہ میں اکتشافات کرنے کے باعث بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ انہیں لوگوں نے کیلوس کے خصائص تنیت کے وظائف جہاز ہضمی کے وظائف اوعیہ شعریہ وغیرہ وغیرہ کے اکتشافات حاصل کیے۔ اور ان چیزوں کے یہ نام بھی ہیں کی ایجاد ہے۔ اسیطرح آنکھ کی رطوبتیں۔ اون کے طبقات ہضم کے درجے کا بھی اکتشاف کیا۔ اور مبیض اور تنیت کا عمل فلوپیوس کے چار سو برس پیشتر دریافت کیا ÷

اور اسمیں خاص خاص امراض کے بھی طبیب تھے۔ جو طب کے بعض فروعیات کو لیکر اوسمیں کمال حاصل کرتے تھے۔ مثلاً بعض اون میں سے دردِ چشم کے طبیب تھے بعض مثانہ، فتق وغیرہ کے جراح تھے بعضوں نے عورتوں کی بیماری اور ہڈیوں کے جوڑنے میں کمال پیدا کیا تھا۔ کچھہ لوگ ایسے بھی تہے جنکا کام یہہ تھا کہ وہ یہ بتلایا کریں کہ اصول طبیہ کا اثر اعضا پر حالتِ مرض و صحت میں کیا ہوتا ہے ان باتوں کے متعلق اکثروں نے خاصکر کتابیں تدوین کیں۔ بعضوں نے اوسکو نظم کر کے ایک طویل قصیدہ میں لکھا جسکا نام Flos medicinae scholae salerni

لیکن بعد کو اسکا Regimen sanitatis نام معلوم ہوا۔

نیز محققین نے یہ بھی پتہ لگایا کہ یہ کتاب ایک شخص کی کتاب کا ملخص ہے جسکا نام اسحق بن سلیمان ہے جو قرطبہ کے طبیبوں میں سے ایک بڑا طبیب تھا جس کا سنہ وفات ۹۵۰ء ہے بہرحال اگر صرف اوس کی بھی تصنیف ہو تو اکثر مقامات میں دونوں کا اشتراک ہے۔ نیز یہ کتاب تشخیص امراض تشریح اعضاء وغیرہ کی بھی بحث میں ہے۔ اس میں طبی علاج زہر کے مقابل میں تبلایا گیا ہے جس کا نام اپنے اصطلاح میں تریاق رکھا ہے۔

اسیطرح بہت سی حفظانِ صحت کی ہدایات ہیں جنکا سال کے ہر مہینہ مطالعہ کرنا ضروری ہے اور صحت کے متعلق بہت سی بحثیں طالع اور بروج کی بھی ہیں۔

اس کالج کی ترقی یہاں تک پہونچگئی تھی کہ خود گورنمنٹ نیم حکیموں اور عطائیوں کی خاص طور پر نگہداشت رکھتی تھی۔ اور انکو طبابت کے کام سے روکتی تھی۔ اور اگر اجازت بھی دیتی تو اون سے پورا عہد لیتی کہ مدرسہ کے قانون یا طبی پروگرام کے مطابق وہ اپنی پوزیشن برابر قایم رکھیں گے۔

سالرن کالج میں متعدد شفاخانے تھے جنمیں سب سے پہلا نویں صدی عیسوی میں اُن قواعد پر قایم کیا گیا تھا۔ جن پر بنو اُمیہ نے قرطبہ اور شام میں اپنے شفاخانے قایم کیے تھے۔ بعض شفاخانوں کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں جن کے متولی بعض وُہ رہبان ہوتے تھے جنھوں نے اپنی زندگی انسانی خدمت کے لیے وقف کردی تہی۔

اس مدرسہ کا پروگرام نہایت باقاعدہ اور منتظم تھا۔ طالب علم کو پہلے تین سال عام علوم اور علم ادب اور فلسفہ پڑھنا ہوتا تھا۔ پھر پانچ سال خاص کر علم طب

حاصل کرتا تھا +

اس مدرسہ سے ایک بڑا گروہ علماء اور اطبا کا تعلیم یافتہ ہوکر نکلا جنمیں کا مشہور و معروف جراح بلرم کا باشندہ روجرس تھا جو زخم۔ ہڈی کے جوڑ اور نیز ورم وغیرہ کا علاج کرتا تھا۔

اسیطرح متی سلفائینکوس ہے جس نے ایک فصت اور دوسری قرابادین میں ایک کتاب لکھی منجملہ اون کے ایک شخص نغریبونتس تھا جو امراض سینہ کے علاج میں بڑا ماہر تھا۔ اسی طرح ایک شخص جنیوا کا بروسیڈا تھا جو نہ صرف فریڈرک کے شاہی محل کا بلکہ امراء دربار کا بھی طبیب تھا۔ اور یہ سب فن جراحی میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے۔

انہیں فاضل طلبائیں سے ایک گروہ سینا کے یہود کا بھی تھا جنمیں کا بڑا شخص فراغوط تھا جس نے رازی کے کتاب (الحاوی) کا ترجمہ کرکے سارل انجو بڑاور لوپس تاسع (نوان)، شاہ فرانس کے نام اوسکا ڈیڈیکیشن کیا تھا۔

سالرن کالج میں طلبا مرد، عورت سب ایکساں داخل کیے جاتے تھے اسمیں ایک مدرسہ خاصکر دائیوں کا بھی تھا۔ چنانچہ اس کالج سے مثل مردوں کے بہت سی عورتیں بھی تعلیم یافتہ ہوکر نکلیں جو کہ نہ صرف طب کی ماہرہ تہیں بلکہ کیمیا اور جراحی بھی اعلیٰ درجہ کی جانتی تھیں۔

منجملہ اون کے ایک طبیبہ رفقہ تھیں جنھوں نے ایک کتاب خاصکر حمیات میں تصنیف کی اسیطرح ایک عورت ابہلا ہے جس نے ایک کتاب فن ولادت میں لکھی ہے۔ ایسی ہی ٹورٹولا نے اصول طبی اور فسق میں اور مرکوریا نے فن جراحی میں کتابیں لکھیں ایک اون میں سے کوستانزا کولنڈا بھی تھی۔ جو علم، جمال دونوں میں مشہور عالم تھی +

یہاں کا طریقہ علاج بھی بہت آسان تھا فیس متوسط درجہ کی تھی فقرا کا علاج مفت کیا جاتا تھا۔

فریڈرک مسلمان سلاطین سے رابطۂ مودت بھی رکھتا تھا سلطان مصر اسکا بڑا گہرا دوست تھا۔ آپسمیں تبادلہ سفرا بھی اکثر ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب ۱۲۴۱ء میں فریڈرک کا سفیر قاہرہ پہونچا تو اوس کے لیئے تمام قاہرہ آراستہ کیا گیا اور بہت شاندار استقبال کیا گیا۔

اسیطرح تمام دنیائے اسلام کیسا تھہ تجارتی تعلقات قایم ہوگئے تھے۔ اسیوجہہ سے ہند و مصر کی مصنوعات بالرم و سینا اور یہاں سے دہانہ اٹلی ہوتے ہوئے تمام یورپ میں برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ اور یہ پہلا شخص ہے جس نے اِن تعلقات کو وسعت دی۔ اسی لیئے اس کے جہازات بحر ابیض اور بحر اٹلانٹک تک چکر لگاتے رہتے تھے۔ شاہان مشرق اور مشرق سے اسکا شغف جنگ صلیبی کے بعد بہت صاف طور پر ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ اس کے اکثر جنگوں میں اس کے خاص مشیر اور باڈی گارڈ کے لوگ تقریباً کل ہی مسلمان تھے

فریڈریک ثانی درحقیقت ایک علم دوست فرمانروا تھا۔ اسکو ریاضت میں خاص دستگاہ حاصل تھی۔ بسا اوقات وہ جبر مقابلہ۔ اور علم ہندسہ کے خاص پیچیدہ مسائل علماء دربار کے سامنے حل کے لیئے پیش کرتا تھا۔ اکثر پیچیدہ اور مشکل مسائل مصر اندلس افریقہ کے علمار کے پاس حل کے لیے بھیجا کرتا تھا۔

فریڈرک ثانی ذکاوت۔ شجاعت۔ علم کے حیثیت سے اپنے زمانے میں سب سے بڑا شخص تھا عربی۔ عبرانی۔ اور لاطینی زبان جانتا تھا۔ الغرض یہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں کی طرز پر یورپ میں عربوں کی مدد سے یونیورسٹیاں قایم کیں +

ابوظفر بہاری (ندوی)

حقیقی شاعری

شعاعیں کر رہی ہیں برگِ گل پر رنگ آمیزی — قلم کاغذ پہ خاموشی سے چلتا ہے مصور کا
یہ ہیں دو مختلف کام ہمیں لیکن روح بھر دینا — اور انہیں ڈال دینا جان ہے کام ایک شاعر کا

بہار رنگیں گل و لالہ سے ہے کہسار کا دامن — چمکتے ہیں اندھیری کان میں لعلِ بدخشانی
ادھر جذبات صادق سے جواہر خیز ہے سینہ — ادھر کاغذ پہ شاخِ خامہ ہے محوِ گل افشانی

لبِ ساحل اگر تم ہاتھ سے پانی کو جنبش دو۔ — تو موجیں دور تک جائینگی متوازی دوائر کی
تموج ہے ہوا میں نغمۂ شاعر سے اور یوں ہی — قیامت تک چلی جائینگی موجیں اس سمندر کی

بہت آسان ہے اے ملحدو تم کو یہ کہدینا — کہ کیا حاجت خدا کی اور ضرورت کیا نبوت کی
مگر اپنی زبان سے تم یہ کہ سکتے نہیں ہرگز۔ — کہ تمکو کچھ نہیں حاجت فصاحت اور بلاغت کی

بہار اندوز تا تو ہیں رہیں حسنِ خصائل سے — نہ ہو نشو و نما تا خار و خاشاک معائب کی
ہمیشہ سے رہی ہے احتیاج اقوام عالم کو — حکومت کی حقیقی شاعری۔ اور مذہب کی

حکومت اور مذہب میں وہ ہیبتناک دیوتا جو — ڈرا کر اور دھمکا کر ہمیں مجبور کرتے ہیں۔
مگر اچھی ہے پندِ خوشگوار ملہمِ[1] غیبی — ہم اسکو شوق سے سنتے ہیں اور منظور کرتے ہیں

---

[1] یعنی شاعر

مقرر بزم میں کرتا ہے جو تقریر طولانی خود اوسکو یاد رکھہ سکتا نہیں جتنا وہ کہتا ہے
مگر شاعر کا دل آویز موزوں مختصر فقرہ دلوں پر نقش ہوتا ہے۔ ہمیشہ یاد رہتا ہے

سحرگہ گوشۂ مسجد میں عابد باوضو ہوکر کیا کرتا ہے گھنٹوں سبحہ گردانی مشیخت سے
مگر شاعر کا حمد و نعت میں اک نعرۂ دلکش برابر ہے تمامی عمر کی اوسکی عبادت سے

کلامِ شاعر اک کامل ترین تاریخ ہی جس سے پتہ ملتا ہے شاعر کے خیالات او رخصایل کا
اک آئینہ نہایت صاف اور شفاف ہی جسمیں ہمیشہ عکس ہے مرحوم کی شکل و شمایل کا

حقیقی شاعری تصویر ہے اوس شخص کی جس نے خود اپنے ہاتھ اپنے خون سے مر مر کے کھینچی ہے
یہ پہول۔ آہ اوسکی تربت کے ہیں جسنے آخری دم تک کیاری انکی اپنے اشک سے رو رو کے سینچی ہے

الٰہی جب زباں دی تو اوسے گفتارِ صادق دے دیا ہی دل تو جذباتِ حقیقی سے اوسے بھر دے
پھر دلِ آوارہ میں شورِ دریا کا رواں ہوکر مجھے تھوڑا جنوں بھی دے الٰہی تو اگر سر دے

نادر علی خاں نادر کاکوروی

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

حضور ہز ہائی نس نواب میر محبوب علی خان والی حیدر آباد دکن کی ناگہانی موت تمام ملک کے واسطے ایک صدمۂ عظیم ہے۔ شہنشاہ حقیقی مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ امید و یقین ہے کہ حضور ہز ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر خلف اکبر حضور نظام خلد مقام جو ۳۱ اگست کو تخت نشین ہوے ہیں اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلیں گے

بھاوج کا خط نند کے نام

اچھی بہن! ایسی بھی کیا بے مروتی بھائی کو خط لکھنے بیٹھیں۔ تو ورق رنگ ڈالے۔ اور نہ لکھے تو دو حرف اپنی دور افتادہ بھاوج کو۔ تم میری نند ہی نہیں ہو بچپن کی سہیلی بھی تو ہو۔ اوس محبت کو تو نباہا ہوتا . . . . جس روز سے تم سسرال سدہاری ہو۔ ہر وقت تمہیں میں دل لگا رہتا ہے۔ ہر گھڑی تمھاری باتیں یاد آتی ہیں۔ اکیلی گھبرایا کرتی ہوں۔ مگر تم نے ایسی آنکھوں پر ٹھیکری رکھہ لی کہ طوطے کو بھی مات کر دیا . . . . میں سمجھتی تہی کہ شادی ہوجانے کے بعد تمھارے خیالات میں ضرور تغیر ہوجائیگا دولہا بھائی کو میں بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ ایک روشن خیال جنٹلمین ہیں اون کا اثر تمپر ضرور پڑے گا۔ مگر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک تمھاری مرغے کی وہی ایک ٹانگ چلی جاتی ہے۔ انگریزی سے جیسی تم جب متنفر تہیں ویسی ہی اب بہی ہو۔ پردہ کے متعلق اگرچہ کبھی تم سے ذکر نہیں آیا۔ لیکن یہ میں ضرور جانتی تہی کہ تم اوسے دل سے پسند کرتی ہو۔ اور کوئی شک نہیں اس زمانہ میں شرافت کی علامت بہی یہی ہے لیکن اتنی دور جاکر تم نے اپنے بھائی سے اس قضیہ کو چھیڑا ہے میرا جی چاہتا تھا کہ یہ بحث میرے سامنے ہوتی۔ یہ دوسرا خط جو تم نے جواباً اپنے بھائی صاحب کو لکھا ہے۔ آج اونہوں نے مجھے بہی سنایا اور باتوں باتوں میں بحث ہو پڑی میرے منہ سے صرف اتنا نکل گیا تہا کہ "دولہا بھائی نے بات تو سچ کہی" اگرچہ مجھے معلوم تہا کہ یہ اون کی طبیعت کے خلاف ضرور ہے۔ کیونکہ میں اون کا وہ خط دیکھ چکی تہی جس کا جواب تم نے لکھا ہے۔ لیکن یہ خیال بہی نہ تھا کہ وہ بھرے ہی بیٹھے ہیں۔ اور گویا وہ خط تمہیں زیادہ تر میرے ہی دکھانیکو

لکھا گیا تھا خیر- اب جو وعظ شروع ہوا ہے تو دو گھنٹے ہو گئے سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا منطق فلسفہ- سائنس- تاریخ- انجیرہ وغیرہ تمام علوم خرچ کر ڈالے گویا آج ہی کے واسطے علیگڈھ کالج میں تعلیم پائی تہی- میں دم بخود بیٹھی منہ دیکھا کی- یہ بھی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر کچھ بولتی ہوں تو بات اور بڑھے گی اپنے بھائی کی عادت سے تو تم ہی واقف ہو- ذرا میں فرشتہ ذرا میں شیطان- اسلئے خاموشی کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا- وہ- اپنا جو کچھ منہ میں آیا کہتے چلے گئے اور آخر میں کہنے لگے "- مجھے پہلے اس کا یقین نہ تہا کہ تمہارے خیالات بھی اس قسم کے ہیں میں تو سمجھتا تہا کہ تم یونہیں میرے چڑانے کو ایسی کوئی بات ہنسی میں کہدیتی ہو- لاحول ولا قوۃ الا باللہ-

اسپر مجھے بھی غصہ آگیا- اور مینے کہا کہ اگرچہ مباحثہ میں تو میں تم سے جیت نہیں سکتی- نہ مینے برسوں تمہاری طرح کتابیں حفظ کر کے یونیورسٹی کا امتحان دیا ہے- البتہ سیدہی سی ایک بات جانتی ہوں - اگر تم خفا نہو جاؤ تو کہوں-؟ خدا جانے کیا شبہہ گھڑی تہی کہ بالکل ہی خلاف معمول مسکرا کے کہنے لگے "- ضرور کہیئے! اسپر مینے ذرا ہمت کر کے کہا " جیسا کہ تم خود ہی کہتے ہو کہ موجودہ قسم کا پردہ نہ مذہب کے احکام میں داخل ہے- نہ عربوں کا پرانا رواج نہ اسلامی فاتحین کے زمانہ میں اس کا رواج تہا- تو- یا تو یہ ایک ایجاد بندہ رسم ہے یا کسی غیر مسلم قوم کی تقلید- اب اسپر اسقدر زور دینا کہ واجب ترک ہو- فرض چھوٹ جائے- مگر اسکی پابندی لازمی ہے تمہیں انصاف سے کہو- یہ بدعت ہے یا نہیں- اور اگر رواج کو کہو تو آخر دوسرے اسلامی ملک بھی تو ہیں- وہاں بہی تو مسلمان رہتے ہیں- ان لوگوں میں تو مستورات کو اسطرح چار دیواری میں قید رکھنے کا دستور نہیں - اور اگر یہ کہو کہ وہاں قومی سلطنت ہے اور اس ملک کی مثال ہندوستان سے

نہیں دیجاسکتی۔ جہاں نہ قومی سلطنت ہے نہ کوئی ایک خاص قوم۔ مختلف قومیں اور مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ آخر پارسی بھی تو ہیں جن کی اسوقت جہانتک مجھے علم ہے دنیا بھر میں کسی جگہ سلطنت تو بڑی چیز ہے کوئی ریاست بھی پارسیوں کی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو ایسی ہی دنیا کے کسی کونہ میں ہوگی۔ جسکا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ مگر یہی پارسی ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں جیسی کچھہ امتیازی شان رکھتے ہیں۔ وہ سب کو اچھی طرح معلوم ہے اون کی بہن بیٹیاں بھی تو آخر بے پردہ پھرتی ہیں لیکن کوئی خراب اثر اس کا اون کی معاشرت پر نہیں پڑا۔ بلکہ ترقی ہی ہوئی۔

تم کہتے تو ہو کہ "پردہ کے معنے اگر زندہ درگور ہوجانا یا چار دیواری میں مقید رہنا ئے جائیں تو سب سے پہلے میں اس کا مخالف ہوں، لیکن یہ صرف لفظوں کا اولٹ پھیر اور نمایشی بات ہے۔ آپ ہی حامی بنتے ہو اوس پردہ کے جو ہندوستان میں رائج ہے اور آپ ہی سب سے پہلے چار دیواری کی قید کے مخالف۔ میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ کس پردہ کی مخالفت کرتے ہو۔ اور کس پردہ کی حمایت۔ یہ کیوں نہیں فرماتے کہ دراصل مقصود تو چار دیواری ہی میں قید رکھنا ہے لیکن روشنخیالی کے اظہار کی غرض سے کھلم کھلا یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی . . . کیونکہ پھر ہمدرد قوم اور حامی نسواں وغیرہ الفاظ کے تمغے چھن جائیں گے۔ اور اگر سچ پوچھتے ہو تو نہ پردہ سے پاکیزگی بڑہتی ہے نہ بے پردگی سے فحش۔ بلکہ اگر خیال کر کے دیکھا جائے تو جس گروہ میں مستورات پردہ کی پابندی شدت سے کرتی ہیں۔ وہی زیادہ تر بدچلنی و آوارگی میں مبتلا ہوتے ہیں جس کا سبب غالبًا یہ ہے کہ پردہ نشین عورتیں بیچاری گلگلی طبیعت والی اور آٹے کی آیا ہوجاتی ہیں۔ اون کے خیالات اپنی چار دیواری کے اندر

چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اور چند گز انگنائی کی زمین کے سوا تمام دنیا سے بیخبر ہوتی ہیں وہ نہ مردوں کے خیالات کا صحیح اندازہ کر سکتی ہیں۔ نہ ان کے موثرات سے واقفیت رکھتی ہیں اسی لیے وہ مردوں کی دلسوزی سے قاصر اور ان کے رنج و راحت سے بےحس رہتی ہیں۔ اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس سے انکار کرنا گویا واقعہ کا انکار کرنا ہے۔ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنی عورتوں سے مانوس نہیں ہوتے۔ اور روز روز کے تجربے سے انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے کھانے رینددھنے اور سینے پرونے کے دھندوں کے سوا اور کیا جانیں۔ یہ کیا ہماری شریک زندگی ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال تبدیج ذہن میں جمتا جاتا ہے اور یونہیں رفتہ رفتہ مرد لاپروا ہوتے جاتے ہیں۔ اور اوس فطرتی کشش کو جو مرد و عورت میں فطرتاً رکھی گئی ہے۔ غلط طور پر استعمال کر کے بدچلنی و آوارگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو اسی بات سے اندازہ کر لو کہ بازاری عورتیں مسلمانوں میں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور کسی قوم میں اتنی نہیں ہوتیں۔

میں اکثر سنتی رہتی ہوں کہ آج فلاں شخص نے فلاں طوائف سے نکاح پڑھا لیا اور کل فلاں نے فلاں سے ایسے لوگوں پر اعتراض تو بہت کیے گئے جاتے ہیں لیکن اوس کے اصلی لم کی طرف کوئی خیال نہیں کرتا۔

پرسوں ہی جو گراموفون ریکارڈ کی فہرست تم لائے ہو۔ اوسے مینے شغل کے طور پر یونہیں اوپری نظر سے دیکھا۔ شاید ۲۵۔ یا ۳۰۔ تو مسلمان طوائفوں کے نام تھے اور ۵ یا ۶ ہندوؤں کے . . . .

بہن! میرے اس کہنے پر تو وہ بہت ہی کھل کھلا کر ہنسے اور کہنے لگے لو۔ تم تو اپنی دلیل سے خود ہی قائل ہو گئیں + مینے کہا کیونکر۔ تو جواب دیا کہ

اسی سے قومی بدچلنی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ جن قوموں میں پردہ نہیں اونکی عورتوں (اور مردوں) کو آوارگی و بدچلنی کرنے کے لیے کوئی امر مانع نہیں اور وہ سوسائٹی میں شامل رہکر ہر طرح کے افعال قبیحہ کا ارتکاب کرسکتے ہیں اور اسوجہہ سے کسی برگزیدہ سے برگزیدہ عورت کی نسبت بھی اوسکی معصومیت کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پردہ دار قوموں میں جو طبائع اس قسم کی ہیں۔ اول تو پردہ سے اون کی روک تھام ہوکر درستی ہوجاتی ہے لیکن اگر پھر بھی کوئی عورت طبعاً ہی آوارہ مزاج ہو تو اوسکو سوسائٹی سے خارج کردیا جاتا ہے اور وہ زمرہ طوائفان میں شامل ہوجاتی ہے۔ اوس کا زہریلا اثر دوسروں تک سرایت کرنے نہیں پاتا۔ اسیطرح ایک صید ہوس مرد اوسی طبقہ میں جو عصمت فروشی کے لیے مخصوص ہے اپنی شیطانی اغراض پوری کرلیتا ہے اور کسی نیک نہاد شریف خاتون کی عزت کے درپے نہیں ہوتا۔

مینے کہا۔ خوب! یہ آپنے اچھا نتیجہ نکالا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بے پردہ قوموں کی ہر حالت سوسائٹی کی نظر کے سامنے رہتی ہے اور ذرا سی بے عنوانی بھی ہو تو ہر فرد اوسے بھانپ لیتا ہے۔ اسلئے ہر فرد کو اپنے کیرکٹر کا خاص طور پر ہر وقت خیال رہتا ہے بخلاف اوس کے پردہ داری میں درپردہ بہت سے گل کھل جاتے ہیں۔ اور سوائے معدودے چند اشخاص کے کسیکو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ بے پردہ قوموں میں میاں بی بی دنیا کی تمام دلچسپیوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اونکو سفر و حضر میں یکساں لطف آتا ہے۔ اون کے اتحاد میں کسیوقت کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی جس سے ایک دوسرے کا قائم مقام تلاش کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ مثلاً ایک زندہ دل نوجوان

جو نیچر پرست ہے چاہتا ہے کہ اپنی بی بی کے ساتھ فطرت کی نزاکت آفرینیوں سے لطف اُٹھائے۔ جو ایک سچی خواہش ہے لیکن مروجہ اسم پردہ کی شدت سے وہ اس قصد سے باز رہتا ہے۔ اور اپنے جوش کو دبا لیتا ہے۔ اور جب طبیعت بار بار تقاضا کرتی ہے تو وہ اوس کا قائم مقام تلاش کر کے اوس بےلوث اور پاکیزہ محبت کو جو اوس کی منکوحہ بی بی کا حق تھا ایک غیر مستحق شاہد بازاری کیطرف منتقل کر دیتا ہے۔ اور یہیں سے بدچلنی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تو پردہ ہی آوارگی و عصمت فروشی کا باعث قرار پاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اسیطرح اور بہت سی صورتیں ہیں جنکی قدرتی دلفریبیاں انسان کو اپنی طرف بلاتی ہیں۔ اور وہ اپنے (خلاف فطرت) قایم کردہ قیود کی پابندیوں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا۔ وہاں تک اسطرح پہونچتا ہے کہ اوس کی بدمستی سے یہ پُر لطف سیر بھی ہیبتناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ہاں۔ یہ اور بات ہے کہ مرد اپنے لیے بدچلنی کو جائز و مستحسن قرار دیکر یہ سمجھ لیں کہ اس سے قومی کیرکٹر میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا۔ درآنحالیکہ اسی بد اخلاقی کا نتیجہ بڑہتے بڑہتے اوس حد تک جا پہونچتا ہے۔ اور اس سے کئی ہزار گنا زیادہ نقصان کا موجب ہے جس کا احتمال پردہ اوٹھہ جانے کی صورت میں کیا جاتا ہے

رہی یہ بات کہ صید ہوس مرد عصمت فروش عورتوں کی موجودگی میں شریف زادیوں کی آبرو کے خواہاں ہنوں گے۔ عجب منطق ہے۔ اور یہاں وہی اعتراض اولٹ جاتا ہے جو آپ بےپردگی پر کرتے ہیں۔ باوجودیکہ اس کی شان میں اور اوس حالت میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔ لیکن اگر مصلحت کوشی کا اقتضا یہی ہے تو یہ انتظام بھی کیوں نہو کہ آوارہ عورتوں کے لیے بعض مرد۔ بدکرداری و بدافعالی کا پیشہ اختیار کریں۔

میری اون کی یہی گفتگو ہو رہی تہی کہ استے میں لڑکا باہر سے ایک وی۔ پی پیکٹ لیئے ہوئے آیا۔ یہ ترجمہ کا کلام مجید ہے۔ جو دہلی کے ایک مطبع میں نہایت خوشخط اور بہت اعلی کاغذ پر چہپا ہے۔ تمہارے بہائی نے میری فرمایش پر منگا دیا ہے میں اوس کے شوق میں تھرتھر یر دقریرسب بہول گئی۔ سامنے صندوقچی رکہی تہی روپیہ نکالکر چٹہی رساں کو بہیجے۔ اور قرآن شریف کہولکر دیکہنے لگی۔ واقعی جیسا میں چاہتی تہی ویسا ہی ہے جلد بہی نہایت خولصورت بنی ہوئی ہے جن اتفاق۔ اسیوقت ایک جگہ سے ورق جو اولٹا تو سورۂ نسار کا دوسرا رکوع نکلا۔ مولانا شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے اوسے جو پڑہتی ہوں تو لکہا ہوا تہا "اور جو کوئی بدکاری کرے۔ تمہاری عورتوں میں تو شاہد لاؤ اوسپر چار مرد اپنے" پہر اگر وہ گواہی دیویں۔ تو اونکو بند رکہو۔ گہروں میں۔ جب تک بہر لیوے اون کو موت" یا کردے اللہ اونکی کچہہ راہ" سینے کہا دیکہئے اللہ میاں نے اون عورتوں کے لیئے جن کی بدکاری کی چار گواہ شہادت ادا کریں چار دیواری میں بند رکہنا سزا فرمائی ہے۔ اسبات کو جانتے ہوئے تو موجودہ پردہ سسٹم کے یہ معنی ہیں کہ آج کل جسقدر . . . . عورتیں ہیں اونپر (خدانخواستہ)۔۔ کا جرم ثابت ہوچکا ہے۔ یہ کیسی شرم کی بات ہے۔ اور کس منہ سے مسلمان اس پردہ کی تائید کرتے ہیں۔ دوسری قوموں کے لوگ اپنے دلمیں کیا کہتے ہوں گے کہ یہ قوم اپنے ہی قانون کے مطابق اپنے آپ کو بالعموم بے عصمت ثابت کر رہی ہے۔ توبہ۔ توبہ۔

اے بہن! میرے اس کہنے پر تو وہ جہلا اوٹہے اور سچ بہی ہے آخر کبتک ضبط کرتے کبہی ایسا موقع کاہے کو پیش آیا ہوگا۔ جو یوں اون کی ہر بات برابر کاٹی جائے نہایت ہی کڑے تیوروں سے مجہے گہور کر ایک خشمگیں آواز میں کہا بس چپ رہو۔ آئیں بڑی مولوی بن کے۔ تم قرآن و حدیث کے مطلب کیا جانو

اُردو کی دو چار سطریں پڑھکے عالم ہی بن بیٹھیں عربی تم نہیں جانتیں فارسی تم نے نہیں پڑھی۔ حدیث سے تم ناواقف۔ تفسیر سے تم بے خبر۔ موقع محل سمجھو نہ محل اور کلام پاک سے استدلال۔ ناسخ و منسوخ کو تو تم سمجھتی ہی نہ ہوگی۔ کیا ان ہی کج بحثیوں کے لیے ترجمہ منگایا جا رہا تھا +

مینے جواب دیا تو اسمیں بگڑنے کی کون سی بات ہے۔ اگر ناسخ منسوخ کا سلسلہ اسمیں ہے تو میں کب کہتی ہوں کہ اس آیت پر عملدرآمد کیا جائے۔ میں تو اس سے پردہ کی اک صورت تعزیر بتلا رہی ہوں جو اللہ پاک نے .... عورتوں کے لیے تجویز فرمائی۔ موجودہ بحث پردہ پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے ....

لیکن اون کو غصّہ آچکا تھا۔ وہ رو کے رکنے والی چیز تھوڑی تھا۔ بس بگڑ پڑے میں ایسی آزاد خیالی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خبردار اگر آئندہ تم نے میرے سامنے اس قسم کی جرأت کی۔ اور یوں بیباکانہ زبان چلائی ...... چلی جاؤ میرے سامنے سے مجھے دیکھ کر غصہ آرہا ہے ....

یہ کہکر وہ تو غصہ میں ادہر ادہر ٹہلنے لگے۔ اور میں سہمی ہوئی اُٹھکر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ راستگوئی اور صاف بیانی کے اس تلخ تجربہ کے بعد تمہارے اون مصلحت آمیز فقروں کا مطلب سمجھ میں آیا کہ ”بھائی صاحب! آپ ہراساں نہوں ہمارے جیتے جی تو پردہ اُٹھتا نہیں“ اور آئندہ کے لیے بھی یہ نصیحت پلے پڑی کہ جب اس قسم کی گفتگو ہوا کرے گی تو میری زبان پر بھی یہی الفاظ آیا کرینگے

”جب دنیا بے پردہ ہو جائے گی۔ اور دوسروں کی عورتیں مردنما ہو جائیں گی۔ تب دیکھا جائے گا اسوقت تک کون جیتا ہے“

زیادہ شوق۔ راقمہ تمھاری جان نثار
بھاوج

براکین یعنی کوہ آتش فشاں

علمائے علم ارض (جیالوجی) کے پاس یہ امر محقق ہوچکا ہے کہ کرہ ارض شدید گرم اور پگھلے ہوئے مادہ سے بنا ہے جس کے اوپر کا قشر یعنی پیٹری سرد ہوگئی ہے جسپر ہم ساکن ہیں اور جسکا دَل بمقابلہ اس کے نصف قطر کے کچھ ایسا زیادہ نہیں ہے ایسی صورت میں کچھ بعید نہیں کہ اوس کی اندرونی حرارت اور حالات کے علامات ظاہر اور نمودار ہوتے رہیں۔ جہاں کہیں براکین (برکان کی جمع) یعنی کرہ آتش فشاں ہیں وہاں پگھلا ہوا ارض مادہ اور تپھر اکثر ان پہاڑوں میں آبذریعہ تمر یعنی سوراخوں کے اُبلکر باہر نکلتا ہے ساوہا ایسے تمر قشر ارض میں جابجا موجود ہیں۔ انہی کو براکین یا جوالاکھی کہتے ہیں۔ اور اس قشر یا پیٹری کے ایک وسیع حصہ میں شدید و خفیف حرکات اکثر محسوس ہوتے رہتے ہیں جنکا ماخذ و منشار کوئی اضطرابی طاقت ہے جو زمین کے اندر واقع ہے۔ براکین کو انگریزی میں وُلکینو کہتے ہیں۔

براکین کی شکل اور ساخت برکانی پہاڑ جلے ہوئے لو اد اور راکھ کے ایک مخروطی ڈھیر پر مشتمل ہے جو کسی مرکزی دہانہ کے گرد جمع ہوا ہے یہ مراد اور راکھ اس دہانہ سے بڑے زور سے ہوا میں پھینکے جاتے ہیں اور اس دہانہ کے اطراف میں جمع ہوتے ہیں۔ اگر ہوا تیز چلتی ہو تو یہ مولو پہاڑ کی دوسری جانب بہی زیادہ جمع ہوگا یہین اور ہبائی اجزا بعض اوقات ہوا میں بہت بلند ہوکر چلتی ہوا کے ساتہہ میلوں دور جاکر صفحۂ زمین پر پہیلا دیے جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں اس مواد اور راکھ کو ہوا دہانہ سے صدہا میل کے فاصلہ پر لیجاتی ہے اور

زمین اور سمندروں کے وسیع سطحوں پر اسکو پھیلا دیتی ہے ملاوا یعنی پہل نداب کے بڑے بڑے ٹکڑے جنکو اصطلاح علم ارض میں برکانی بمب کہتے ہیں اکثر ہوا میں بہت بلند ہوکر اسی پہاڑ کے قرب و نواح میں اُتر آتے ہیں اور لاوا کے سیلاب کبھی جوش زدہ ہوکر یا تو اوس راکھہ اور لوحۂ پتھر کے ڈھیر کو چیر کر اوس میں دھنس جاتے ہیں یا کاسہ یعنے فم برکان کے کنارہ سے اُبلکر بہ نکلتے ہیں اور آس پاس کے ملک کو پاٹ دیتے ہیں۔

کبھی تو ایک ہی دہانے سے پے در پے التہابات ظہور میں آتے ہیں لیکن بعض اوقات اس پہاڑ کے پہلو میں دوسرے چھوٹے دہانے کھلتے ہیں اور اور بہی التہاب پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ چھوٹے مخروطا اور دہانہ اکثر بڑے پہاڑ کے شدید التہاب اور کثیر مواد کے اخراج کی وجہ سے ڈھپ جاکر مدفون ہوجاتے ہیں۔ اسطرحپر ایک سلسلہ مخروطوں کا اکثر ایک خط مستقیم میں نظر آتا ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قشر زمین میں کوئی درز یا شگاف پیدا ہوگئی ہے جسپر یہ سب واقع ہیں +

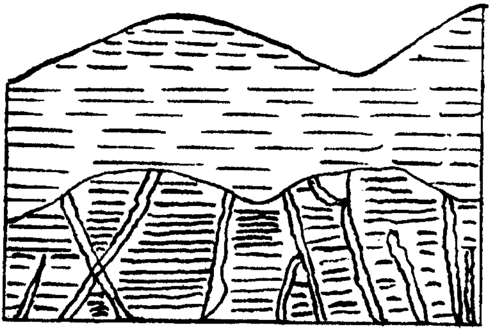
اگر ہم ایسے براکین کے مخروطوں کے کسی ایک سلسلہ کو چیر دیں یعنے کھود ایک طرف سے گرادیں تو اون کی اندرونی حالت ایسی نظر آئے گی جیسی کہ نقشہ نمبر (۱) میں دکھلائی گئی ہے۔ اسمیں وہ حصص جو عمودی خطوط کے سایہ سے دکھلائے گئے ہیں لاوا کے سیلاب کو ظاہر کرتے ہیں اور باقی حصوں سے راکھہ اور محترقہ مواد کے غیر منظم طبقات ظاہر ہوتے ہیں جنسے یہ مخروط مشتمل ہے۔



علاوہ بریں ان براکین کے اندرونی حصہ میں لاوا کی چھوٹی بڑی رگیں نظر آتی ہیں جو اس پہاڑ کے جسم میں ہر طرف دوڑی ہوئی ہیں اور جو بعض اوقات دوسرے قسم کے مواد کی تہوں میں دھنسی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور بعض اوقات دوسری رگوں کو کاٹ کر آگے بڑہی ہیں جو ان سے قبل بنی تہیں نقشہ نمبر (۲) میں لاوا کی بعض رگیں دکھلائی گئی ہیں جن سے انکے نفوذ کی حقیقت معلوم ہوگی

نقشہ نمبر (۲)

لاوا کی ڈیک یعنی رگیں پہاڑ کے جسم میں



جب پگھلا ہوا لاوا کسی پہاڑ کے جسم میں زور سے داخل ہوتا ہے تو کچھ حصہ اوسکا ممکن ہے کہ حالتِ سیّالی میں ایسی درزوں اور شگافوں میں دہنس جائے جو آگے سے موجود تہیں۔ یا یہ کہ یہ کسی اندر سے دھکیلنے والی قوت کا نتیجہ ہو ایسی رگونکو اصطلاح علم ارض میں ڈیک یعنے دیوار کہتے ہیں۔ جب ان رگوں کا مادہ سرد ہو جاتا ہے تو یہ سیلین مجسم اور منجمد پتّھر بنجاتے ہیں۔ اور فی الحقیقت دیوار ہائے پشتہ کا کام دیتی ہیں۔ یعنی پہاڑ کے مختلف حصوں کو باہم جکڑ دیتی ہیں اور بیچ کے پھلپھلے اور پوپلے اجزا کو باہم وصل کر دیتی ہیں

براکین کی مثالیں | زمین کے اندر سے جو مادہ بذریعہ ان آتش فشاں پہاڑوں کے

باہر نکلکر زمین کی سطح پر پھیلتا ہے اوسکی مقدار بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ براکین مشہورہ کے حالات سے اسکی حقیقت ظاہر ہوگی

وِسیوویس۔ یہ پہاڑ ۷۹ء سے جو اس کے پہلے تاریخی التہاب کا سال ہے سال بسال بڑہتا گیا ہے اِس پہاڑ کا اصلی حصہ آگے سے موجود تھا اور اُس کے مقدس کنارہ کی قدیم چوٹی جو فی الحال مونٹے سوما کہلاتی ہے اوس کے پہلے مخروجہ اور کاسہ کے اندر واقع ہے جو جز اُس کنارے سے گہری ہوئی ہے اور یہ موجودہ مخروط ۷۹ء میں بنا ہے (یعنی۔ بلیناس) کے قبل کسی قدیم رومی مورخ نے اِس پہاڑ کے التہاب کے متعلق ذکر نہیں کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرکز برکانی آٹھ سو برس تک کم سے کم سوتا رہا ہوگا اور بعد اوس کے دفعۃً پھوٹ پڑکر اتبک اپنی قوت دکھلا رہا ہے۔ جیمس البتہ دو ایک وقفہ ایک یا دو صدیوں کے بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس کے ہمسایہ کے برکانی جزیرہ اسلیا میں بھی ایکبار ایسے وقفوں کے درمیان ۱۳۰۲ء میں ایک التہاب واقع ہوا تہا۔ حالانکہ وہ چودہ سو برس سے بالکل نائم تھا۔ تمام براکین کی تاریخی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے التہابات کے درمیان بہت طولانی سکون کی مدتیں واقع ہوتی ہیں۔ یعنے ایسے التہابات کے درمیان جنسے پہاڑ کی جسامت پر معقول اضافہ ہوتا ہے۔

اِٹنا۔ اس مشہور برکان کا مخروط ایسے وسیع قطعہ زمین پر واقع ہے جسکا قطر تیس میل ہے۔ اور اسکا ارتفاع بہت ہی تدریجی ڈہال کے ساتھ سمندر کی سطح سے گیارہ ہزار فٹ بلند ہے بعض لاوا کی سلین جو اس پہاڑ کی موجودہ سطح پر بھی ہیں طول میں بیس سے تیس میل تک ہیں اور عرض میں ایک سے دو میل تک اور جنکا دَل ڈیڑہ دو سو فٹ ہے۔ نزدیک کے درمیان اور وادیوں میں

ایسی دوسری سلین اسکی سطح کے نیچے واقع ہیں جنکو راکھ کے طبقات اونچین ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ اس راکھ اور برکانی مواد کے ٹکڑوں کو توفت کہتے ہیں۔ اس پہاڑ کے مشرقی جانب ایک وادی مشہور بہ وال دل تو ہے جسکا عرض چار پانچ میل سے کم نہیں اور جس کے اطراف اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں جنمیں سے بعض کا ارتفاع تین ہزار فٹ ہے۔ اور جو پہاڑ کے اوس جانب کی ساخت کو عجیب طرح سے ظاہر کرتی ہیں۔ ویسو ویس پہاڑ اپنی (۳۹۲۲) فٹ بلندی کے ساتھ اس وادی میں جو اٹنا کے پہلو میں ہے بالکل چھپ جاسکتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اٹنا اپنی موجودہ بلندیکو پچیس سو برس آگے پہونچ چکا تھا جسکا ذکر قدیم شعرائے یونان نے بھی کیا ہے۔ وہ لاوا کی سیل۔ جسنے کارتھیج کی فوجکو جو سیراکیوس پر تین سو چھیانوے سال قبل میلاد مسیح چڑھی چلی جارہی تھی۔ روکا تھا اب بھی سطح پر نظر آتی ہے جو دوسری قدیمتر سیلونکو ڈھانکے ہوئے ہے۔ اٹنا کے اطراف میں کم سے کم چھ سو چھوٹے مخروط سر اوٹھائے ہوئے ہیں جنمیں سے بعض کا ارتفاع سات سو فٹ اور محیط دو میل ہے۔ بعض دوسرے ایسے ہیں جو مابعد کے مخرجہ مواد کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

آیسلینڈ جزیرہ آیسلینڈ تمامًا برکانی مواد سے مرکب ہے۔ یہ جزیرہ آیرلینڈ سے بہت بڑا ہے اور اسمیں سب سے زیادہ ولکینو یعنے براکین موجود ہیں جن کے التہاب کی خبریں ہمیشہ آتی رہتی ہیں۔ اسکی بلندترین چوٹی استیفل ہے (یعنی کوہ برف) جسکا ارتفاع سمندکی سطح سے (۶۴۷۰) فٹ ہے۔ لیکن ھکلا جو ۴۹۰۰ فٹ بلند ہے یہ سب سے زیادہ مشہور ہے کیونکہ اوس میں کثرت سے التہاب واقع ہوئے ہیں۔ آیسلینڈ کے بعض التہابون سے پانی کے بہت بڑے سیلاب وقوع میں آئے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی برف دائمی اور

سیلکہاں یخ جنسے وہ جزیرہ ہمیشہ ڈھکا ہوا ہے سب پگہلکر سیلاب کا باعث ہوئے اور جنسے پہاڑوں کے اطراف میں بڑے بڑے غار اور کہو پیدا ہوگئے اور پتھر کے بڑے بڑے ڈھیمے اور چٹانیں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کثرت سے بہتے ہوئے پست زمینوں پر اتر آئے جس کی وجہ سے جزیرہ کے کنارہ کی خشکی پر بہت کچھ اضافہ ہوا۔ آیسلینڈ میں سب سے بڑا اور مشہور التہاب اسکیپٹر یوکل کا تہا جو ۱۷۸۳ء میں واقع ہوا جسکی شہرت خاص اسوجہ سے ہے کہ لاوا کے بہت بڑے سیلاب اس پہاڑ سے جاری ہوئے۔ انہیں میں سے ایک سیلاب پہلی کا طول پچاس میل اور بعض مقامات میں عرض پندرہ میل تھا۔ ایک دوسرے کا طول چالیس میل اور عرض سات میل تھا۔ اور ان سیلوں کا دَل یعنے عمق سو فٹ تھا۔ مگر بعض گہری وادیوں میں پانچسو سے چھ فٹ تک اس لاوا کی سیل کا دل تھا

<u>ٹومبورو</u> جزیرہ سومباوا کے ٹومبورو پہاڑ میں جو التہاب ۱۸۱۳ء میں واقع ہوا شاید دنیا کا سب سے بڑا التہاب ہے جسکا حال قلمبند ہوا ہے۔ اور یہہ جزیرہ منجملہ اوس سلسلۂ جزائر کے ہے جو جاوا سے نیوگنی تک پھیلا ہے۔ یہ پہاڑ پانچویں اپریل کو پہوٹ پڑا اور ۱۱ و ۱۲ اپریل کو اسکا بڑا زور رہا۔ اور جولائی تک اس کی شدت میں کمی نہیں ہوئی۔ اس کے پہوٹ پڑنے کی آواز سوماٹرا اور تڑناٹے تک سنائی دی گئی جنمیں سے پہلا اس کے (۹۷۰) میل جانب مغرب اور ثانی (۷۲۰) میل اس کے مشرق ہے زمین کے بڑے وسیع قطعات لاوا کی سیل سے پٹ گئے تہے جسکی متعدد سیلیں بہتی ہوئی سمندر تک جا پہونچیں۔ جلا ہوا مواد سمباوا کے مغرب کیطرف سمندر پر تیرتا ہوا نظر آتا تھا جسکا دل پانی پر ۲ فٹ تھا۔ اور میلہا میل سمندر کی سطح کو پاٹے ہوئے تہا جسمیں سے جہازوں کا گذرنا مشکل تہا۔ اس برکان کے حوالی اطراف کے ملک میں انروٹ سے آدمی کے سر کے برابر تک کے پتھر بارش کیطرح برستے تہے۔ اور راکھہ اور برکانی غبار اس کثرت سے

اس پہاڑ میں سے باہر پھینکا گیا تھا کہ اون کی روشنی تو کہاں جاڑوں کی راتوں سے بھی تاریکی زیادہ تھی۔ حتی جاوا میں جو اس پہاڑ سے تین سو میل جانب مغرب واقع ہے تین روز تک متواتر تاریکی چھائی رہی۔ کچھ خاکستر برکانی اور غباری مواد آمبونیا اور باندہ میں بھی برسا جو دونوں تقریبًا آٹھ سو میل اس پہاڑ کے مشرق کی جانب واقع ہیں اس التہاب کی بعض تہہ دیں بہت بڑے اور وسیع رقبہ میں نظر آتی رہیں جسکا محیط اس پہاڑ سے ایک ہزار میل تہا فرض کرو کہ ایسا پہاڑ جنوب ملک برار میں پھوٹتا تو اس کا اثر شمال میں کانپور تک اور جنوب میں میسور تک یا مغرب میں ساحل گجرات تک محسوس ہوتا اور اس تمام حصہ ملک کو تین روز تک تاریکی میں گھیرے رکھتا۔

برکانی عمل کی یہ چند مثالیں ہیں جو منجملہ بہت ساری مثالوں کے ہم نے منتخب کی ہیں تاکہ براکین کی قوت اور اون کے نتائج کا اندازہ ہوسکے۔ ناظر کو اگر اس سے زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو ڈاکٹر ڈاینن کی کتاب دلکینو اور سر چارلس لائل کی اصول جیالوجی کے طرف رجوع کرسکتا ہے۔

نائم و منطفی براکین ویسرویں کے تاریخی حالات سے ظاہر ہوتا ہی کہ براکین کئی صدیوں تک نایم یعنے سوتے رہتے ہیں اور بعد دفعتہً پھوٹ پڑتے ہیں بعض براکین کی راکھہ اور لاوا کی سیلیں منجمد نظر آتی ہیں۔ لیکن مثل جزیرہ اَیش کے کسی میں کوئی التہاب اسوقت سے دیکھا نہیں گیا ہے جبسے کہ متمدن انسان کا وہاں گذر ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہاڑ صدیوں سوتے رہیں۔ یا مثل وسط فرانس کے پی دو ڈوم کے براکین جن کے مخروط اور کاسہ ابتک موجود ہیں۔ اور جن کی لاوا کی سیلیں اسوقت تک کھردری اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نہ صرف تاریخی زمانہ میں یہ خاموش رہے ہیں یعنے تقریبًا دو ہزار سال سے بلکہ اوس سے آگے بھی

نامعلوم صدیوں سے خاموش پڑے ہوئے ہیں ایسے براکین کو منطفی کہتے ہیں یعنے بجھے ہوئے۔ وسطی فرانس کے مونٹ زور اور کنتال کو بھی اسی قسم کے براکین منطفیہ میں شمار کرنا چاہیئے جن کے مخروط اور کاسہ بارش اور ہوا کے اثرات نعریہ سے بالکل مٹ گئے ہیں۔ اور جن کی لاوا کی سیلوں میں پانی کے بہاؤ سے بڑے گہرے درے اور غار پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ جولاوا کی سیلیں اصلاً نیچے کی زمینوں پر بھی تھیں اب صرف ٹیلوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اون کا کچھ حصہ نظر آتا ہے اسی طرح سے بعض ملک ایسے ہیں جہاں پرانے مخروطا اور براکین کی ساری نشانیاں مٹ گئیں ہیں اور صرف راکھ اور لاوا کے میدان باقی رہ گئے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے وسط میں اور دوسرے مقامات میں دیکھا جاتا ہے۔

براکین کی تقسیم روئے زمین پر۔ اگر ہم بسالٹ کے صحنوں کے میدانوں سے صرف نظر کریں اور صرف ملتہب و نایم و منطفیہ براکین کو دیکھیں اور زمین کے نقشے پر اون کے مواقع کو نشان کر دیں تو ہم انکو ہر جا ئے پھیلے ہوئے پائیں گے گو غیر منظم طور پر کیوں نہوں۔ براکین جزایر تمام سمندروں میں موجود ہیں اور ان کے مجموعے اور سلسلے تمام ایشیائی جزائر اور امریکا جنوبی و شمالی کے غربی سواحل اور جنوبی یورپ۔ اور ایشیائے صغیر سے وسطی ایشیا میں سے ہوتے ہوئے ساحل چین تک نظر آئیں گے۔ اور ہر خط عرض بلد میں ۲ ۸ ڈگری شمال سے یعنی گرین لینڈ اور کیپ نارتھ کے درمیان سے ۷۷۔ جنوب تک یعنی مونٹ ایریس تک ان کا سلسلہ موجود ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سوائے وسطی ایشیا کے باقی اکثر زندہ براکین یا تو جزائر میں واقع ہیں یا سمندروں کے کنارہ پر موجود ہیں۔ ایک فقط افریقہ ہے جہاں کسی قسم کے براکین نظر نہیں آتے ہیں امریکا

شمالی و جنوبی کے وسطی اور مشرقی حصہ میں۔ اور ایشیا و یورپ کے شمال میں اور آسٹریلیا کے شمالی و وسطی حصوں میں براکین کا وجود نہیں۔

صفحۂ ارض پر ان کی تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو یہ ظاہری علامات کسی اندرونی حالت کی ہیں جو تمام کرۂ ارض میں شامل ہیں لیکن انکا وجود پانی کے بڑے قطعات اور سمندروں کے قریب میں ایک گمان پیدا کرتا ہے کہ شاید پانی وہ عامل ہو جو ان کے ہیجان کا باعث ہوتا ہے۔ بہت گرم پانی کا بخار اور اسکا شدید دباؤ ممکن ہے کہ وہ طاقت ہو جس کے مدد سے یہ آتشین سیلین زمین کے اندر سے نکلتی ہیں اور یہی طاقت راکھ کے گھنے ابروں اور براکینی اجزا کے غبار اور ٹکڑوں کو ہوا میں اڑاتی ہے چونکہ اکثر احجار و صخور میں پانی نفوذ کرتا ہے اور انمیں شگاف اور درزیں بھی اکثر ہوا کرتی ہیں تو احتمال قوی ہے کہ پانی ان راستوں سے زمین کے اندر اترتا ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہے کہ پانی کتنے عمق تک زمین میں اترتا ہے۔ اور یہ بخار کے منبع وہاں کس سطح پر واقع ہیں جو بعد کو زمین کے قشر کی مدافعت پر غالب آکر اوسکو اچھال دیتے ہیں یا اومیں درزیں پیدا کر دیتے ہیں جنمیں سے وہ محصورہ اور مجتمع بخار باہر نکل پڑتا ہے بہرحال یہ ایسی باتیں ہیں کہ سوائے قیاس کے ہم کوئی یقینی امر نہیں تبلا سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی نسبت سکوت ہی مناسب ہے۔

موجودہ براکین کے بننے کے لیے کتنی مدت لازم ہے۔ اٹنا کی بہت قدیم روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پچھلے ڈہائی ہزار سال میں جو اضافہ اس کے جسم پر مواد متحجرہ سے ہوا ہے بہت ہی قلیل ہے۔ ویسیوویس اور دوسرے اٹالیائی اور یونانی براکین کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دو بڑے التہابوں کے درمیان ایک مدید زمانہ سکون کا گذرتا ہے جب کہیں جاکر کوئی ایسا التہاب ہوتا ہے جس سے اون پہاڑوں کے

جسم پر کچھ اضافہ ہوتا ہو۔ تمام عالم کے براکین کے حالات جو کچھ معلوم ہوا ہے اوس سے ظاہر ہے کہ بلحاظ اون حالات کے ویسوویس اور اٹنا اون قوانین کی عمدہ مثالیں ہیں جن سے براکین پہاڑوں کا بننا ظاہر ہوتا ہے۔ تمام براکین بظاہر مواد کی چھوٹی مقداروں سے وجود میں آئے ہیں جو زمین کے اندر سے وقتاً فوقتاً نکلکر اوپر جمتا گیا ہے اور اونکی جسامت اور بلندی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ فاصلہ ان زمانوں کا بعض وقت بیسیوں سال اور بعض اوقات صدیاں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جسقدر درمیانی زمانہ دو التہابوں کا زیادہ ہو تو مواد کی بمقدار بھی زیادہ ہوتی ہے جس سے پہاڑ کا جسم بڑھتا ہے۔ بڑے بڑے التہاب جنمیں کثیر مواد مذاب بہ کر نکلتا ہے شاذ و نادر واقع ہوتے ہیں اور جن پہاڑوں میں اکثر التہاب ہوا کرتا ہے اونمیں سے مواد بھی کمتر خارج ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اٹنا جیسے پہاڑ کے بننے کیلئے لاکھوں برس چاہئیں تعجب تو یہ ہے کہ زمین کے جن طبقات پر اٹنا کا ایک حصہ قایم ہے اونمیں اوسی صنف کی سیپیاں برآمد ہوئی ہیں جو اس زمانہ میں بحیرہ روم کے سمندر میں پائی جاتی ہیں۔ اور اوس برکانی مخروط کے بننے کے طرز نے جو ان باقیات پر قایم ہے ان موجودہ سیپیوں کے اصناف کی عمر کو بڑی قدامت کا جامہ پہناتا ہے

قدیم برکانی عمل | اگر ہم اون منطقیہ براکین کا خیال کریں اور نیز اون سے قدیمتر لاوا کا جنکا بیان یہاں نہیں کیا جاسکتا ہے یہ ظاہر ہوگا کہ صفحہ زمین پر ایسا کوئی نقطہ نہوگا جہاں کسی نہ کسیوقت برکانی عمل کارفرما نہ رہا ہو۔ جہاں تک جیالوجی کی شہادت اثبات دلالت کرتی ہے کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی ہے کہ ہم تاریخ ارض میں کوئی ایسا زمانہ فرض کریں جسمیں برکانی عمل مفقود رہا ہو۔ اگرچہ اس کے مواقع بدلتے رہے ہیں مگر مفقود تو ہرگز نہیں رہا ہے۔ اور نہ اسکی کوئی شہادت ہے کہ اس زمانہ میں اسکا عمل بہ نسبت سابق کے دھیما ہوا ہو۔ آیسلنڈ کا مشہور التہاب جو اسکیپٹر دیکل میں ۱۷۸۳ء میں واقع ہوا تھا شاید اوتنا ہی وسیع اور

عورتوں کی اپیل

مردوں کی خدمت مین

جنس اعلیٰ کے محترم افراد / کبھی سُن لو ہماری بھی فریاد
بےکسوں پر بھی ہو نگاہ کرم / سُن لو افسانۂ دلِ ناشاد
اوسکے بندی ہیں ہم بھی جسنے کیا / ہمکو مجبور اور تمھیں آزاد
جیسا ڈرتے ہیں تم سے ہم، ویسی / نہیں طائر کو دہشتِ صیاد
کیوں ہمارے گروہ سے ہو نفور / جنس سے کیوں ہمارے بغض و عناد
ہمنے مانا کہ آپ ہیں ابدال۔ / ہے یہی کیا طریقۂ اوتاد
جاں نثاروں پہ اپنے ظلم کرو / چاہنے والوں کو کرو برباد
یہی تہذیب ہے بھلادو اُنہیں / رات دن جو کریں تمھاری یاد
کیا یہی شیوۂ مروت ہے / مبتلائے الم ہوں ہم، تم شاد
اک تمھاری ادائے غفلت سے / حسرتیں ساری ہوگئیں برباد

یہ تغافل شعاریاں چھوڑ دو۔
مُنہ ہماری طرف ذرا موڑ دو

ہم نے مانا کہ ہیں ذلیل و خوار / نہیں دنیا میں ہم مگر بےکار
نرم و نازک ہے گو ہمارا جسم / فرض اپنا نہیں مگر بیکار
نہ سہی قوت و توانائی / ہم بھی کہلاتے ہیں مگر جاندار
تم کرو سعی و جہد و جہد تمام / ہمکو خدمت سے کچھ نہیں انکار

شب غم کی تمھاری ہوں بونس | ہوں تمھاری خوشی میں حصہ دار
تمکو گر زخم چشم بھی ہو ذرا | ہمکو ہو جائے زندگی دشوار
خواب و آرام ہو حرام ہمیں | بخت اعدا اگر پڑو بیمار
کبھی دیکھیں جو تمکو آزردہ | تیر غم کا یاں ہو قلب شکار
ظلم کرتے ہو اتنے اے اسپر | جو کہ سو جان و دل سے تم پہ نثار
اس محبت پہ یہ تغافل ہے | قوم مردوں کی ہی بڑی خونخوار
دم بیاں یوں ہاں وہ تیغ بکف | خدمتیں اتنی اور پھر بیزار

اب بھی اچھا ہے جور سے باز آؤ | اب بھی سن لو ذرا دکھی کی پکار
آدمی ہم بھی ہیں تمھاری طرح | رکھو قائم ہمارا عزّ و وقار
نہ سلف کو کرو ذرا بدنام
نہ مٹاؤ تمدّنِ اسلام

اختر۔ از ریاست اجے گڑھ

مسٹر۔ ایم۔ ایس۔ محی الدین صاحب ایک مدراسی ڈپٹی کلکٹر نے لندن کی یونیورسل ریسیز کانفرنس (کانفرنس اقوام عالم) میں ایک مضمون ہندوستانی مسلمان عورتوں کے پردہ کی رسم پر پڑھا ہے جسمیں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان عورتیں جس طریقہ سے پردہ کی سخت پابندی کرتی ہیں۔ یہ یہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے اور اگر کوئی شخص قرآن و حدیث سے ایسا ثابت کرے تو اسے ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔
مسٹر محی الدین کا پتہ۔ ۲۔ وی۔ پنیر یڈ گولڈرس گرین۔ لندن۔ این ڈبلیو ہے۔

کلامِ عزیز

وہ دل اپنا جسے ہم اوس کا پروانہ بناتے ہیں — خدا کی شان ہے سب اوسکو دیوانہ بناتے ہیں
جو آنیوالی نسلوں کو سبق شائستگی کا دے — عزیز اب ہم وہ عبرت خیز افسانہ سناتے ہیں
ستارے آسماں کے توڑ کر ہم آج لائے ہیں — تمھارے واسطے تاج ملوکانہ بناتے ہیں
جنھیں کہئے بھروسہ کس سے دعوائے محبت ہو — قیامت تو یہی ہے آپ بیگانہ بناتے ہیں
جگہ دے دیکے پہلو میں ان اصنام خیالی کو — قریب کعبۃ اللہ آپ بتخانہ بناتے ہیں
ذرا گلکاریاں دکھلاؤ فکر عرش پیما کی — کہ ہم اک صنعت وحرفت کا کاشانہ بناتے ہیں
جہاں ہی فکر تعمیر جواب آسماں ہمکو — ارے اوس سرزمیں کو آپ ویرانہ بناتے ہیں
شبستان محبت میں نثار اون باوفاؤں کے — جو ہر ذرہ کو خاکِ دل کی پروانہ بناتے ہیں
ابھی جو بادہ آشامو کی بدمستی سے ٹوٹا تہا — مبارک ہو کہ پھر سے ہم وہ پیمانہ بناتے ہیں
بڑے ترسے سے ساقی در پہ ہم مخمور بیٹھے ہیں — خم ومینا ہیں خالی اس لئے مجبور بیٹھے ہیں

(عزیز لکھنوی)

غزل

(از حضرت مولوی سید جلال الدین صاحب توفیق مہدوی حیدرآبادی)

سرِ محشر ہم اونکی یاد قامت لیکے جاتے ہیں — قیامت سے قیامت میں قیامت لیکے جاتے ہیں
بتائیں کیا کہ مرگ ناگہانی کیسی ہوتی ہے — اونہیں سے پوچھئے جو دل میں حسرت لیکے جاتے ہیں
لیئے جاؤ اہدا حسن عمل اپنا تو محشر میں — ہم اپنے ساتھ امید شفاعت لیکے جاتے ہیں
تماشا دیدنی ہے دیکھ آکر بام پر تو بھی — شہید ناز کی احباب میت لیکے جاتے ہیں
وہ سننے کے نہیں زنہار روداد الم میری — میرے ارماں مجھے کیوں ضرورت لیکے جاتے ہیں
گلہ کیا دلمیں حسرت لیکے نکلے بزم سے تیری — یہی بس ہے کہ ہم دل کو سلامت لیکے جاتے ہیں
عدم کے جانیوالے سب چھپا لیتے ہیں منہ اپنا — خدا جانے کہ یہ کیا کیا ندامت لیکے جاتے ہیں

انسان وہ ہے جو ترقی اور مکمل انسان بننے کی آرزو دل کو ہے بجا ہے ۔ یہ حضرت سالک کے صاحب کے ہیں۔ از سید ابو حامد سید محمد مہدوی ۔ سکندرآباد دکن

صلاح الدین

سنہ ۵۳۲ھ م سنہ ۱۱۳۷ء - سنہ ۵۸۹ھ م سنہ ۱۱۹۳ء

نمبر (۱)

میرے عالم وفاضل دوست ڈاکٹر احمد میرزا۔ ایم۔ ڈی۔ بی۔ ایس۔ سی۔ کو چونکہ بہادران اسلام کے حالات وسوانحات سے خاص دلچسپی ہے۔ اسلئے یہ ناچیز مضمون اون کے نام نامی اسم گرامی پر ڈیڈیکیٹ کیاجاتا ہی (قادری)

جب کسی غریب آدمی کو کوئی غیر معمولی ترقی حاصل ہوجاتی ہی تو قاعدہ کی بات ہے کہ خوشامدی اوسکو کسی نامور شخص کی نسل سے منسوب کردیتے ہیں۔ یہ ہی کیفیت صلاح الدین کے نسب کی ہوئی ہے۔ جن مورخین نے اوسے عربی الاصل تحریر کیا ہے اون میں سے بعض نے اوس کے سلسلے کو عوف حمیری سے ملایا ہے۔ اور بعضے آل مروان کے آخری خلیفہ مروان الحمار کی اولاد سے بتلاتے ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ وہ شام کی اوس آزاد خانہ بدوش قوم سے ہے جو عراق عرب کے مشرق میں رہتی اور کرد کہلاتی ہے۔ صلاح الدین کا دادا شاذی اس قوم کے قبیلہ روادیہ کا امیر تھا۔ یہ قبیلہ قصبہ درین میں جو آذربائیجان کے مقامات میں سے ہے رہتا تھا۔ اسی مقام پر شاذی کی ولادت بھی ہوئی تھی۔

قبیلہ روادیہ کی ایک شخص نے جسکا نام بہروز تھا سلطان مسعود سلجوقی (سنہ ۵۲۶ھ ۱۱۳۳ء تا سنہ ۵۴۷ھ ۱۱۵۲ء) کے دربار میں پہونچ کر اپنی لیاقت ودانشمندی سے بہت سے اعلی مراتب حاصل کرلیے یہانتک کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سلطان نے اوسے بغداد کا شحنہ مقرر کیا اور قلعہ

تکریت جاگیر میں دیدیا۔ شاذی نے اپنے ہم قوم کی ان ترقیوں کا حال سنا تو اپنے دونوں بیٹوں نجم الدین ایوب اور اسد الدین شیرکوہ کو لیکر اوس کے پاس چلا گیا۔ بہروز نے خوب خاطر تواضع کی اور اوسے تکریت کا قلعہ دار مقرر کردیا۔ شاذی کے فوت ہونے پر وہ جگہ نجم الدین ایوب کو مل گئی ۵۲۶ھ ۱۱۳۱ء میں سلطان مسعود نے اتابک عماد الدین زنگی کی شراکت سے بغداد پر چڑھائی کی۔ خلیفہ مسترشد باللہ نے حاکم فارس سے امداد چاہی۔ اوس نے ۱۲۔ جمادی الثانی ۵۲۶ھ ۱۱۳۱ء کو موقعہ پاکر شب خون مارا جس سے سلطان اور زنگی دونوں بدحواس ہوکر بھاگ گئے۔ اس بے سروسامانی میں زنگی کا گذر قلعہ تکریت سے ہوا تو نجم الدین ایوب نے اوسے قلعہ میں بلاکر پندرہ روز تک مہمان رکھا اور اوسکی فوج کے لیے جو بھوک پیاس سے مر رہی تھی، خورد و نوش کے سامان مہیا کر دیے، یہ کیفیت بہروز کو ناگوار گزری جس سے آقا و ملازم میں کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی، اسی عرصہ میں اسد الدین شیرکوہ نے بہروز کے ایک نصرانی غلام کو قتل کر ڈالا، اس سے بہروز کو اور بھی غصہ آگیا اور اوس نے نجم الدین اور اوس کے بھائی شیرکوہ کو موقوف کر کے قلعہ تکریت سے نکالدیا، نجم الدین نے موصل کی راہ لی۔ عماد الدین زنگی کے یہاں پہونچا۔ زنگی گذشتہ احسانات کو یاد کر کے بحد لطف و مروت پیش آیا۔ اور ۵۳۳ھ ۱۱۳۸ء میں جب قلعہ بعلبک فتح کیا تو نجم الدین کو اوسکی حکومت دیدی ۵۴۱ھ ۱۱۴۶ء میں عماد الدین اپنے ایک نمک حرام غلام کے ہاتھ سے شہید ہوگیا تو مجیر الدین ابن بوری نے جو دمشق کا حاکم تھا آکر قلعہ بعلبک کا محاصرہ کیا نجم الدین نے سیف الدین زنگی سے جو اپنے باپ عماد الدین کی جگہ موصل میں بادشاہ ہوا تھا امداد طلب کی، مگر وہ کاروبار سلطنت میں اسقدر منہمک تھا کہ اسطرف کچھ بھی التفات نہ کرسکا۔ جب محاصرہ نے طول پکڑا۔ اور اہل قلعہ پر بھوک پیاس کی سختیاں گذرنے لگیں تو نجم الدین نے قلعہ اہل دمشق کے حوالہ کردیا اور اس کے معاوضہ میں اپنے

اپنے لیے جاگیر مقرر کرالی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجیر الدین نے اوسے دمشق میں بلوا لیا اور اپنے لشکر کی سپہ سالاری دیدی۔

اسد الدین شیرکوہ۔ عماد الدین زنگی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مگر جب وہ مارا گیا تو اوس کے نامور بیٹے نور الدین زنگی کے پاس چلا گیا اور نہایت قلیل مدت میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے اوسے سپہ سالار کردیا ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) میں نور الدین نے دمشق فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اسد الدین شیرکوہ کی معرفت نجم الدین ایوب سے امداد طلب کی۔ اور جب حملہ آور ہوا تو نجم الدین کی سازش سے شہر فتح ہوگیا۔ اس کے صلہ میں نور الدین نے دمشق کی حکومت نجم الدین رومی کو تفویض کردی جس کے بعد وہ ۵۴۲ھ (۱۱۴۷ء) سے لیکر ۵۵۶ھ (۱۱۶۱ء) تک تقریباً چودہ برس یہاں کا حکمراں رہا۔

صلاح الدین ۵۳۲ھ (۱۱۳۷ء) میں بمقام تکریت پیدا ہوا۔ اس کے بعد اوس نے اپنے باپ نجم الدین ایوب کے ساتھ دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ نجم الدین کو جب دمشق کی حکومت ملی تو اوس نے ابتدا میں اپنے بڑے بیٹے شمس الدین توران شاہ کو یہاں کا شحنہ مقرر کیا۔ اس کے بعد ۵۴۹ھ میں یہ خدمت صلاح الدین کے تفویض ہوئی جسکو اس نے کئی سال نہایت نیک نامی سے انجام دیا لیکن بعض وجوہات سے اس میں اور صاحب دیوان ابن ہمام میں مخالفت پیدا ہوگئی صلاح الدین نے گھبرا کر خدمت چھوڑ دی اور دمشق سے نکلکر نور الدین کے پاس حلب میں چلا گیا۔ اور اوس کی مصاحبت میں زندگی کے دن بسر کرنے شروع کردیئے +

پانچویں صدی کے شروع ایام سے مصر کی فاطمی خلافت کو انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ اور خلیفہ وزراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن رہے تھے ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) میں وزیر العباس نے خلیفہ ظافر باللہ کو قتل کرا کے اوس کے نابالغ بچے کو تخت نشین کرایا لیکن ملک صالح

کے ہاتھوں جو مصر بالائی کا حاکم تہا بہت جلد کیفر کردار کو پہونچا۔ اس کے بعد صالح نے وزارت اپنے ہاتھ میں لے لی اور چھ برس تک اس خدمت کو انجام دینے پایا تہا۔ کہ ۵۵۶ھ (۱۱۶۱ء) میں اوس کے امیر (؟) نے خنجر سے ہلاک کرڈالا۔ اس کے بعد اوس کے بیٹے زریک نے وزارت کے لیے کوشش شروع کی مگر شاور حاکم مصر صعید نے اوسے تباہ و برباد کر کے خود وزارت پر قبضہ کر لیا۔ اور اسکو ابھی سنبھالنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی کہ ایک اور حریف پیدا ہو گیا ۵۵۸ھ (۱۱۶۲ء) میں ضرغام نے وزارت کا دعوی کیا اور فوج کثیر کے ساتھ مصر پر چڑھائی کی۔ شاور نے شکست پائی اور شام میں آکر نورالدین زنگی کے یہاں پناہ گیر ہوا۔ اور بہت کچھ عرض معروض کرنے پر بادشاہ نے اس شرط سے امداد دینا منظور کر لیا کہ بعد کامیابی مصر کا ثلث محاصل بطور خراج دیا جائے اور امدادی فوج ہمیشہ کے لیے قاہرہ میں مقیم رہے۔

نورالدین نے دارالحکومت کی تھوڑی سی فوج بہت جلد تیار کر دی۔ اور اسدالدین شیرکوہ کو اوسکا سپہ سالار مقرر کر کے صلاح الدین کو بھی اس کے ہمراہ کر دیا۔ یہ لوگ کئی منزلیں طے کر کے ۲۔ جمادی الاول ۵۵۹ھ (۱۱۶۴ء) کو مصر میں داخل ہوئے ضرغام نے خوب مقابلہ کیا۔ مگر ناکامی حاصل ہوئی اور پسپا ہو کر بھاگ رہا تھا کہ ایک شامی نے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ کے بعد شاور کو بلا کھٹکے وزارت مل گئی اور اوس نے قاہرہ میں بڑے کر و فر سے داخل ہو کر خوب جشن منائے۔

جب شاور کو کامیابی حاصل ہو گئی تو شیرکوہ نے ایفائے عہد کا تقاضا کیا مگر اوس نے یوں ہی ٹالنا چاہا۔ اس کشمکش میں جب جھگڑے نے طول پکڑا تو شاور نے شام کے عیسائیوں سے امداد طلب کی اور اونہیں فی پڑاؤ ہزار دینار دینا مقرر کیا۔ شیرکوہ نے عیسائیوں کے آنے کا حال سنا تو اپنی فوج لیکر واپس ہونے لگا۔ مگر اوسے راستہ میں بمقام بلبیس عیسائیوں نے گھیر لیا۔ اس خبر کے سنتے ہی

نورالدین نے فلسطین میں تاخت وتاراج شروع کر دی اور انطاکیہ وطرابلس کے بعض عیسائی سرداروں کو گرفتار کرلیا۔ اس پر عیسائیوں نے شیرکوہ سے تو صلح کرلی مگر ان میں اور اہل مصر میں ان بن ہوگئی۔

آل سلجوق کی عظیم الشان سلطنت کو جب تنزل شروع ہوا تو اوس کے بہت بڑے بڑے عہدہ دار خودسری اختیار کر کے اپنے اپنے علاقوں میں خودمختار ہوگئے۔ پھر ہر ایک نے اپنے مقبوضات کو وسیع کرنے کے لیے اطراف واکناف پر یورشیں شروع کر دیں۔ جن کی وجہ سے خراسان سے لیکر بحر روم تک بے شمار خانہ جنگیوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ اس پرآشوب زمانہ میں عیسائیوں نے صلیبی لڑائیوں کا آغاز کیا۔ روم، جرمن، فرانس، اور دیگر بلاد یورپ کے بڑے بڑے امرا نے لاکھوں آدمی لیکر مشرق پر فوج کشی کی۔ مسلمانوں میں اسوقت ایسی کوئی طاقت موجود نہیں تھی کہ ان کا مقابلہ کرتی اسلیے یہ لوگ ایشیائے صغریٰ میں لوٹ مار کرتے ہوئے انطاکیہ تک چلے آئے اور اوسے ایک طول محاصرہ کے بعد فتح کرلیا پھر یہاں سے روانہ ہوکر بیت المقدس پر چڑھائی کی۔ چھ مہینے تک لڑتے رہے آخر میں ۴۹۱ھ ۱۰۹۷ء کو شہر فتح ہوگیا۔ اِس کے بعد ساحل فلسطین کے بہت سے شہر بھی مسلمانوں سے لیے اس طرح پر اس علاقہ میں عیسائیوں کی ایک چھوٹی سی حکومت قایم ہوگئی جو سلطنت یروشلیم کے نام سے کچھہ کم سو برس مسلمانوں کی مدمقابل بنی رہی

عیسائیوں نے صرف شام ہی کے شہروں پر اکتفا نہیں کی بلکہ مصر اور عراق کے فتح کرنے کا بھی ارادہ کیا۔ شاور نے جب حسب وعدہ رقم ادا نہیں کی تو انہیں اہل مصر کے خلاف ایک بہت اچھا حیلہ ہاتھ آگیا۔ جس کی بنا پر اونھوں نے مصریوں کے بعض شہر فتح کرلیے۔ نورالدین زنگی نے جب دیکھا کہ مصر

عنقریب اسلامی قبضے سے نکلا چاہتا ہے تو اس نے اس کے بچانے کی کوشش کی۔ ربیع الاول ۵۶۲ھ ۱۱۶۶ء میں اسد الدین شیرکوہ اور صلاح الدین کو لشکر دیکر مصر میں پھر دوسری بار روانہ کیا۔ شیرکوہ نے نہایت عجلت سے منازل طے کئے۔ اور مصر میں داخل ہوکر سب سے پہلے الجیزہ میں مقیم ہوا پھر یہاں سے نکل کر البوان عطیہ میں آیا اس مقام پر فریقین میں سخت معرکہ ہوا جسمیں شیرکوہ کی دو ہزار فوج نے عیسائیوں کے دس ہزار آدمیوں کو ہزیمت دی۔ اس کے بعد شیرکوہ نے مصر بالائی سے گذر کر اسکندریہ کو فتح کرلیا۔ اس عرصہ میں قاہرہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کیفیت کے سنتے ہی شیرکوہ نے اسکندریہ کی حفاظت صلاح الدین کے تفویض کی اور خود قاہرہ میں آکر عیسائیوں سے مقابلہ کرنے لگا۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا اسی اثنا میں عیسائیوں کو شام سے کچھ کمک آگئی جسنے جاکر اسکندریہ کا محاصرہ کیا اور صلاح الدین کے ساتھ تین مہینے تک جنگ کرتے رہے۔ نورالدین کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو اس نے فلسطین پر یورش کردی جس سے عیسائیوں کو سخت پریشانی ہوئی اور اونھوں نے مدافعت کے لیئے شام کو واپس جانا مناسب سمجھا اور نہایت عجلت کے ساتھ شیرکوہ سے صلح کرکے شاور سے بھی مصالحت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے بہت کچھ جدوجہد کے بعد خلیفہ نے ایک لاکھ دینار خراج دینا منظور کرلیا تو ان لوگوں نے شہر خالی کردیا اور اپنی حقوق کی نگاہداشت کے لیئے قاہرہ میں تھوڑی سی فوج چھوڑکر فلسطین کو واپس چلے گئے +

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد عیسائی بادشاہ اموری نے رومی شہنشاہ عمانوئیل کی پوتی شہزادی میریا سے شادی کرلی تو شہنشاہ نے اپنے داماد کو مصر کی کمزوری اور ابتری پر توجہ دلائی اور اوسکی فتح کے خیال کو از سر نو تازہ کرکے خود بھی امداد

دینے کا وعدہ کیا اموری نے سنہ ۵۶۴ھ ۱۱۶۸ء کے اخیر ایام میں اس مہم پر عسقلان سے فوج روانہ کی جس نے حدود مصر میں داخل ہو کر پہلی صفر سنہ ۵۶۴ھ ۱۱۶۸ء کو بلبیس کا محاصرہ کیا شہر سرنگ لگا کر اوڑا دیا گیا اور وہاں کے باشندے نہایت بیدردی سے تہ تیغ کیے گئے۔ اس کے دس روز بعد عیسائی فوج قاہرہ کے سامنے پہونچ گئی اور جہازوں کا رومی بیڑہ دریائے نیل میں آکر قاہرہ کے پاس لنگر انداز ہو گیا۔ شاور نے بھی جنگ کی خوب تیاری کی اور قاہرہ میں محصور ہو کر مقابلہ کے لیے آمادہ ہو گیا عیسائیوں نے مصر قدیم کی طرف پیشقدمی کی تو وہاں کے باشندے پناہ کے لیے قاہرہ میں چلے آئے اور اس خیال سے کہ کہیں عیسائیوں کا قبضہ ہو جائے شہر کو آگ لگا دی اور وہ چپن روز تک برابر جلتا رہا۔

شاور نے اموری کو لاکھوں دینار کے لالچ دیے جس سے کچھ عرصہ کیلئے لڑائی ملتوی ہو گئی اس اثنا میں خلیفہ عاضد باللہ نے نورالدین زنگی سے استمداد چاہی اور اپنے ہاتھ سے خط لکھا جسمیں عیسائیوں کے تمام ظلم و ستم تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ نورالدین نے خط دیکھتے ہی فوج کثیر تیار کر لی۔ اور اسدالدین شیرکوہ کو اوسکا سپہ سالار بنا کر تیسری بار روانہ کیا۔ عیسائی فوج جنگ کے لیے آگے بڑھی۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہو گیا کہ دونو علیحدہ علیحدہ راستوں پر ہو گئے جس کے باعث مقابلہ کی نوبت نہ آئی۔ اس کے بعد عیسائیوں نے جنگ جدل کو نامناسب سمجھا اور بے نیل و مرام فلسطین کو واپس چلے آئے۔

شیرکوہ ۴ - ربیع الثانی سنہ ۵۶۴ھ ۱۱۶۹ء کو قاہرہ میں داخل ہوا۔ خلیفہ نے خوب اسکی عزت و توقیر کی۔ اور شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ اور لیجا کر ایوان خلافت میں اوتارا۔ اسوقت شاور مصر کے سفید و سیاہ کا مالک بنا ہوا تہا۔ جب شیرکوہ وہاں پہونچ گیا تو اوسے اپنے اختیارات کے صلب ہونیکا اندیشہ ہوا

اسلیئے شیرکوہ کے قتل کی تدبیریں کرنے لگا۔ مگر اوس کے بیٹے نے جب اس راز کو فاش کر دیا۔ تو شامی فوج نے اوسے گرفتار کر لیا اور خلیفہ کی ایما سے سترہ ربیع الثانی ۵۶۴ھ ۱۱۶۹ء کو قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد خلیفہ نے شیرکوہ کو ملک المنصور امیر الجیوش کا خطاب دیکر وزارت عطا کر دی۔ شیرکوہ نے اس عہدہ کے پاتے ہی سب سے پہلے اپنی فوج اور اوس کے سرداروں کی تنخواہیں مقرر کیں پھر انتظام سلطنت کی طرف متوجہ ہوا مگر موت نے مہلت نہ دی اور تین مہینے سے بھی کم زندہ رہ کر ۲۲۔ جمادی الثانی ۵۶۴ھ ۱۱۶۹ء کو فوت ہوگیا وزارت کے لیے پھر جھگڑے درپیش ہوئے شامی لشکر کے ساتھ جو امراء آئے ہوئے تھے اون میں سے عین الدولہ یاروقی شہاب الدین حارمی سیف الدین مشطوب وغیرہ نے اپنے آپ کو اس عہدہ کا مستحق سمجھکر درخواستیں دیں مگر خلیفہ نے صلاح الدین کو انتخاب کیا تو یہ لوگ برہم ہوگئے مگر ملا ضیاء الدین ہکاری کی کوشش سے معاملہ رو براہ ہوگیا۔ ان میں سے تین امیر تو راضی ہوگئے مگر عین الدولہ کبیدۂ خاطر ہو کر دمشق کو واپس چلا گیا خلیفہ نے ایک مبارک دن تجویز کر کے صلاح الدین کو دربار خلافت میں طلب کیا۔ اور ملک الناصر کا خطاب دے کر وزارت کے تمام کاروبار اوس کے تفویض کر دیے۔

باقی

حکیم سید شمس اللہ قادری

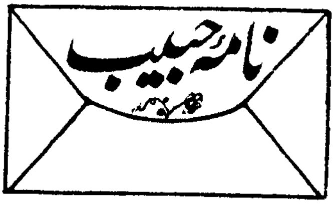
قطعہ

اے ہمنشیں غلط ہے یہ تیرا گمان بد
ہاں دل زدست دادۂ جاناں نہیں ہوں میں

عشق ابھی بیقراری دل کا سبب نہیں
غم میں کسی کے چاک گریباں نہیں ہوں میں

کھاتا ہوں اپنی قوم کی حالت پہ پیچ و تاب
محو خیال کاکل پیچاں نہیں ہوں میں

(علی حیدر زیدی)



اے دیارِ شوق کے ننھے سے قاصد جانِ شوق — اے سکونِ قلبِ مضطر، اے مرے ارمانِ شوق
اے مرے تاب و تواں، روحِ دواں، درمانِ شوق — اے کہ افزوں از تو کیفِ عشرتِ بستانِ شوق

آگیا بارے تو لے کر یار کی تحریر کو۔
میری تسکیں، گفتگوے یار کی تصویر کو

لب یہ کہتا ہے "ادھر لاؤ میں پہلے چوم لوں" — آنکھ کہتی ہے کہ "میرا شوق ہے حد سے فزوں"
دل یہ کہتا ہے کہ "مجھکو دیجئے میرا سکوں۔ — چیر کر پہلو میں رکھ لے ہے تقاضائے جنوں

مخمصے میں جان ہے کیا اضطرابِ شوق ہے
کیا ہجومِ آرزو ہے، کیا وفورِ ذوق ہے

جانتا ہوں میں نہیں بیوجہ یہ بے تابیاں — میں سمجھتا ہوں ہیں کیوں یہ شوق کی بیباکیاں
رحم کے قابل ہیں ساری عشق کی لاچاریاں — ہونگی لیکن کس طرح آسان یہ دشواریاں

مٹ تو جائے پہلے خوفِ آرزو کا انہماک
کانپتے ہیں ہاتھ میرے تجکو گر کرتا ہوں چاک

ہاتھ سے اپنے لکھا ہے اوسنے تجھکو سچ بتا! — واقعی تجھ پر پڑی ہے وہ نگاہِ فتنہ زا؟
سایہ فگن کیا ہوا ہے تجھ پہ گیسوئے دوتا؟ — منعکس تجھ پر ہوئی ہے روئے انور کی ضیا؟

سچ بتا کیا اپنے لب سے اوسنے چپکایا تجھے؟
پھر تو ظالم سُرخی پاں چوم لینے دے مجھے؟

میں تو سمجھا تھا کہ تجھ سے کچھ سکوں ہو جائیگا — آئیگا تو راحتیں میرے لیے کچھ لائے گا

اضطراب دل اگر گھٹ جائے گا مٹ جائیگا — کیا خبر تھی آ کے مجھکو اور تو تڑپائے گا

تیرا آنا مجھکو اپنے ہوش سے جانا ہوا
تیری صورت دیکھکر اپنے سے بیگانہ ہوا

کھینچے لیتی ہے جگر کو تیرے حرفوں کی کشش — شوخئ مضمون سے تیری بڑھ گئی دل کی طپش
مجھکو ہے وارفتگی تیری کتابت کی روش — تیرے شوشے میرے سینے میں ہوئی وجہ خلش

تیرا جو نقطہ ہے اک داغ دل بیمار ہے
دائرہ ہر اک جنوں کی جنبش پرکار ہے

ایسی بیتابی کسی نے ہائے دیکھی ہے کہیں — بند کرتا ہوں تجھے تو شوق کہتا ہے نہیں
چومتا ہوں ہر گھڑی دلدار کا نقش نگیں — سونگھتا رہتا ہوں پہروں بوئے دست نازنیں

کفر مجھکو کیا یہ میرا شوق مست ہو جائیگا؟
لوگ سچ کہتے تھے مجھکو بت پرست ہوجائیگا

نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری

غزل

اُس پہ شیدا ہوں کہ جسکو نہ خبر تک پہونچے — معجزہ ہو جو مری آہ اثر تک پہونچے
خوف ہے سوز دروں کے ہے تنفس دشوار — دل سے بڑھکر نہ کہیں آگ جگر تک پہونچے
جذب شبنم کی ہو خورشید جہاں تاب کو فکر — تیرا دامن مرے دیدۂ تر تک پہونچے
جوش وحشت کی شب غم ہو کہاں تک تفصیل — ہاتھ بڑھ بڑھ کے گریبان سحر تک پہونچے
اُس کی آمد کی خبر سُن کے یہاں صبر کہاں — دل سے ارمان مری حد نظر تک پہونچے
مر کے پہونچی ہے مری لاش ترے کوچے میں — کون اسطرح تری راہ گذر تک پہونچے
راہ میں تمکو ملے حضرت واعظ جو کبھی — باتوں باتوں میں خرابات کے در تک پہونچے
نزع میں ہوں نفس بازپسیں کا ممنون — چند نالے وہی تھے جو اثر تک پہونچے
دل سے رخصت ہوئی یہ کہہ کے شب ہجر میں روح — گھر میں راحت ہو تو نوبت نہ سفر تک پہونچے
مقتضی اسکی ہے ہیبت شب تنہائی کی — اپنے گھر سے میں ہمسایوں کے گھر تک پہونچے

سو رہوں اُس کے تصور میں شب ہجر نظر
گیسوئے لیلئ شب ابتو کمر تک پہونچے

(نوبت رائے نظر)

بھائی کا خط بھائی کے نام

دیکھنا پیر مغاں حضرتِ زاہد تو نہیں؟
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پسِ خم مجھکو!!
(حضرت داغ مرحوم)

برادرم السلام علیکم۔
سب سے پہلے میں آپ کی اُس تکلیف کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے میرے مضمون "بھائی کا خط بہن کے نام" پر علمی روشنی ڈالنے میں گوارا کی! مضمون مذکورہ میں میرا روئے سخن طبقۂ نسواں کیطرف تھا، اور میرا مقصد اصلی اسی طبقہ کی ذاتی رائے حاصل کرنا تھا! اسیوجہ سے میں نے یہ مضمون عصمت کے لیے دیا تھا جسکو کسی خاص مصلحت کے لحاظ سے میرے کرمفرما اڈیٹر صاحب نے تمدن میں شائع کر دیا! اب اس کا جواب آپ دیتے ہیں۔ دیتے ہیں اور بہن کی نقاب ڈالکر، بہن کا بُرقعہ اوڑھکر دیتے ہیں۔ اس لیے میرا اصلی منشا تو ایک حد تک فوت ہوگیا (اگرچہ بظاہر آپ نے بھی طبقۂ لطیف ہی کی جگہ سنبھالکر پردہ سے مخالفت کی ہے) لہذا بہتر یہ ہے کہ "بہن" کا لفظ جواب قطعی فضول ہوگیا دور کر دیا جائے اور ایک تعلیم یافتہ مرد کی رائے کو طبقہ نازک کے سر تھوپا جائے! اسیوجہ سے میں آپ کو براہ راست مخاطب بناکر، بحیثیت علی گڈھ کالج کے اولڈ بوائے ہونے کے برادرم کے سادہ مگر سچے خطاب سے پکارنے کی جرأت کرتا ہوں!
آپ پردے کی مخالفت کرتے، چشم ما روشن دل ما شاد! آپ میری غلط فہمیاں

مجھے سمجھاتے، آنکھوں کی ٹھنڈک! لیکن جو کچھ فرماتے، میرا مضمون ٹھنڈے دل اور منصف دماغ کے ساتھ ملاحظہ کر چکنے بعد فرماتے! مگر سچ پوچھیئے تو آپنے ایسا نہیں کیا! آپ پردہ کو قید خانہ، جیل ہستر، شک، بدگمانی اور خدا جانے کیسے کیسے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ جس پردہ کی حمایت پر میں نے قلم اٹھایا تھا وہ نہ قید خانہ تھا نہ بدگمانی! "پردہ کے معنی زندہ درگور ہوجانا یا چار دیواری میں مقید رہنا اگر لیے جائیں تو سب سے پہلے میں اسکا مخالف ہوں"، میری رائے میں "پردہ کی ناجائز اور جا بیجا سختی واقعی خلاف انسانیت ہے اور خواہ مخواہ کی بدظنی اور بیہودہ شک اوّل درجہ کی حماقت ہے" اور "میرے خیال میں شوہر یا بزرگوں کی اجازت سے کسی کے ہاں ملنے جانا فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ کا خیال رکھ کر جانا۔ کوئی عیب نہیں، اور عجائبات دنیا کو اپنے شوہر یا بزرگوں کے ہمراہ دیکھنا۔ خود اپنے چہرے یا جسم کو کسی غیر محرم کو دکھائے بغیر دیکھنا۔ چنداں حرج نہیں" یہ ہی وہ الفاظ ہیں جو میں نے اپنے پہلے مضمون میں لکھے ہیں اور یہ ہی وہ مذہبی پردہ ہے جسکا حامی میں تھا اور ہوں! اسی پردہ سے میری مراد تھی۔ اور اسی پردہ پر آپنے دراصل توجہ نہیں کی! آپ کی ہر ہر سطر سے ظاہر ہے کہ آپ جس پردہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ گھر کی چار دیواری والا قید خانہ ہے اور بدگمانی اور بیہودہ شک کا نتیجہ ہے! میں ایسے پردہ کا مدعی نہ تھا اور نہ ہوں! افسوس کہ آپنے میرا مضمون غور کے ساتھ ملاحظہ نہیں فرمایا۔ اور محض اس خیال سے کہ وہ پردہ کی حمایت میں تھا آپ مخالفت پر تل گئے!!

یارب آن زاہد خود بین کہ بجز عیب ندید
دودِ آہیش در آئینہ ادراک انداز!

پولیس والی مثال سے میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس طرح" پولیس کے خوف سے اکثر انسان ارتکاب جرم سے باز رہتے ہیں۔ اسی طرح پردہ کی وجہ سے طبقۂ نسواں نیک ہے! میں نے نہ پولیس سے کوئی نتیجہ پردہ پر مرتب کیا اور نہ پولیس کا اطلاق پردہ پر کیا! پردہ والی مثال محض اس لیے تھی کہ ڈائی لما منطق کی اصطلاح آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجائے اور مغالطہ یا غلط نتیجہ نکالنے کا رنگ ایک عام فہم اور روزمرہ پیش نظر رہنے والی چیز پر استدلال کرنے سے معلوم ہوجائے! پولیس کو پردہ کی دلیل سے کوئی تعلق سوائے اس کے نہیں تھا کہ طریقۂ استدلال میں جس طرح پردہ پر مغالطہ پیدا کیا جاسکتا ہے اسطرح پولیس پر آپ جو کچھ پولیس کی نسبت فرماتے ہیں وہ ایسی چیستاں ہے کہ کوئی لال بجھکڑ ہی سمجھے تو سمجھے! نیک سرشت خاتون کو تمام ذریات الشیاطین اپنی مجموعی قوت کے ساتھ بھی بد نہیں بناسکتی، اور بد اطوار عورت کو اندھے کوئیں کی قید اور تمام دنیا کے ریفامر بھی ارتکاب گناہ سے باز نہیں رکھ سکتے، اِس لیے پردہ ان دونوں کے لیے بیکار اور فضول ہے! لیکن یہ دونوں انتہائی گروہ۔ راسخ الاعتقاد، پکی، اور کسی حالت میں نہ پلٹنے والی طبیعتیں تعداد میں بہت کم ہیں، اور ان دونوں گروہوں کی ملانے والی جماعت۔ درمیانی کڑی۔ یا طبقۂ متوسط۔ تعداد میں ان دونوں سے بہت زیادہ ہے! گویا طبقۂ نسواں کی تقسیم صرف دو گروہوں پر کرنا اور درمیانی حصّہ کو چھوڑ کر نتیجہ پر کود جانا، محض مغالطہ ہوگا! طبقۂ درمیانی ہی وہ طبقہ ہے جس پر زمانے کی چالاکیاں اور نظر فریبیاں دیکھتے ہی دیکھتے بہت گہرے نقش ڈالتی ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جسکو خونخوار مردوں کی نگاہ سے اور اون کی بُری صحبت سے بچانے کی بے حد ضرورت ہے! اور اسی طبقہ کے لحاظ سے پردہ۔ ایسا پردہ جس کی

مزاحمت میں پہلے بھی کرچکا تھا اور اب بھی کرچکا ہوں محض حفظ ماتقدم نہیں۔ بلکہ جزو لاینفک ہی! آپ فرماتے ہیں کہ مردوں کے بدچلن ہونے کا بھی خطرہ ہے ...... اس سے مردوں کو قید کردیا جائے"۔ یہاں پھر آپ کے الفاظ بول رہے ہیں کہ جس پردہ کی آپ مخالفت کررہے ہیں وہ قیدخانہ کی تصویر ہے، حالانکہ میں اس قسم کے پردہ کا حامی نہیں تھا: خیر تو آپ کی رائے میں مرد پردہ میں بیٹھیں اور عورتیں دنیا کے جھگڑے بکھیڑوں میں مبتلا ہوں۔ کیونکہ جبتک دونوں میں سے ایک طبقہ دنیا کی کشمکش میں حصہ نہیں لیگا، ترقی تو الگ رہی زندگی بھی محال ہوجائے گی۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ دونوں طبقوں میں سے کونسا طبقہ فرائض مذکورہ بالا کا ذمہ دار بن سکتا ہے؟ میری رائے میں۔ دنیا کی کشمکش کا، سخت سے سخت ذمہ داریوں کا، جانکاہ محنتوں کا، ملکی فرائض کا، قوم کی رہبری کا متحمل طبقہ نازک نہیں ہوسکتا! قدرت کے زبردست ہاتھ نے ان دونوں طبقوں میں بیّن فرق رکھا ہے اور طبقہ نسواں کبھی ہرگز زندگی اور طوفان زندگی کا بوجھ اوٹھانے کے لیے وضع نہیں کیا گیا! صناع حقیقی نے واضح طور پر بتادیا ہے کہ ان دونوں میں سے کون طبقہ، دوسرے طبقہ کی آرام وآسائش کے ذرائع مہیا کرنیکا کفیل، زندگی کی صعوبتیں برداشت کرنے کا متحمل، اور رہبری کے فرائض ادا کرنے کے قابل سمجھا جاسکتا ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیوں اوس رب ذوالجلال نے نبوت کا اعلیٰ مرتبہ طبقہ نسواں میں سے کبھی کسیکو عطا نہیں فرمایا کیوں رہبری اور ذمہ داری کا کام ایک پری جمال خاتون کے سپرد نہیں کیا؟ اور کیوں اپنے قانون کی اشاعت کسی رشک حور، عفت وعصمت کی دیوی کے ذریعہ سے نہیں کی؟ جبکہ خالق یکتا نے دونوں طبقوں کو باہمہ حیثیت مساوی بنایا تھا، اور جبکہ

بعثت پیغمبر کے منشاء ایزدی دونوں طبقوں کو راہ راست دکھانی تھی، تو پیغمبران مرسل کی تعداد بھی۔ شان انصاف تو اسی کی مقتضی ہے کہ۔ دونوں طبقوں میں برابر ہوتی، چہ جائیکہ طبقۂ نسواں میں سے کسیکو بھی یہ اعلیٰ مگر اہم ترین ذمہ داری کا مرتبہ تفویض نہیں فرمایا گیا! اس ترجیح بلا مرجح کی وجہ کوئی سمجھ میں نہیں آتی! مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ مرد اور عورت کو ہر حیثیت سے مساوی ثابت کرنے کے زور میں، ناچیز انسان کی تحقیقات اور اقوال کو خدائے واحد کے فعل پر ترجیح دینے کی نہ ٹھان لیں! اب فرمائیے کہ کونسا طبقہ کشاکش زندگی کے لیے وضع کیا گیا ہے!

ناصح سے کہدے کوئی یہ کیجئے کلام آپ
حضرت کو تاکہ کوئی یہ جانے، آدمی ہیں! (داغ)

آپ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا عورتوں کو پردہ میں بٹھلانے سے مرد اپنی بدذاتی سے باز آئے؟ اور میں جواب میں گذارش کرتا ہوں کہ بدذات کسی صورت میں اپنی بدذاتی سے باز نہیں آسکتا! لیکن جناب من! تمام مرد تو بدذات نہیں: یہاں بھی وہی دو انتہائی گروہ اور ایک درمیانی طبقہ ہے اور یہ تقسیم ہی وہ چیز ہے جسکو آپنے قطعی نظر انداز کیا ہے! بدذات مرد ڈولیوں میں بیٹھکر اور عورتوں کا لباس پہنکر پردہ کی چار دیواری میں پہونچ تو سکتے ہیں لیکن اونہیں کے پاس پہونچ سکتے ہیں جو خود بھی مردانہ بھیس میں لینڈ وں میں سوار ہوکر مردوں تک پہونچ جاتی ہوں۔ اونہیں کے پاس پہونچ سکتے ہیں جو کچھ عرصہ سے متاع حسن ہزار ہزار عشوہ و انداز کے ساتھ مردوں کے دل سے بدلتی رہی ہوں! اور مختصر یہ کہ۔ بدذات مرد کا دست شیطنت۔ پردہ کی موجودگی میں۔ ایسی ہی عورتوں تک پہونچ سکتا ہے جو خود بھی بدذات اور آوارہ۔ یا کم از کم۔

مائل بہ آوارگی ہوں!!

جنکو اپنی خبر نہیں اب تک وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

پھر آپ پردہ کو سزا سے تعبیر کرتے ہیں اور طبقۂ نازک کو مال وزیور سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صرف تشبیہ ہی نہیں دیتے بلکہ اس تشبیہ سے طبقۂ نازک پر نتیجہ نکالتے ہیں: کیا بجھے یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی کہ ایسی مثال اور تشبیہ سے نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ؟ کیا مجھے یہ بتانے کی حاجت ہی کہ یہ مثال "مثال مع الفارق ہے"، اور جو کچھہ نتیجہ اِس سے نکلے وہ طبقۂ نسواں کے لیے صحیح نہیں ہوگا؟ زیور اگر ہزار آدمیوں کے ہاتھہ میں جائے تو بھی وہی رہیگا جو پہلے تھا۔ لیکن ایک ناتجربہ کار خاتون ہزار مختلف الخصائل مردوں کی سوسائٹی میں تبادلۂ خیالات کی وجہہ سے بہت کچھ مؤثر ہو جائے گی، اور یہی وہ اثر ہوگا جو اچھا ہوا تو فھو المراد، ورنہ لے ہی ڈوبے گا، ممکن ہے کہ ایک عورت .... نیک سرشت اور با ہمہ حیثیت فرشتہ انسان کے پاس عرصہ تک رہ کر بھی ویسی ہی رہے جیسی پہلے تھی مگر جناب ہر ایک مرد تو ایسا نہیں!

نقد وصوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

میں آپکے اِس ارشاد کا مطلب سمجھنے سے بھی عاجز رہا "چور کو سزا نہیں دیجاتی" چور کو اُسیوقت سزا دیجا سکتی ہے جبکہ وہ چوری کا مرتکب ہو جائے یا چوری کرتا ہوا پکڑا جائے! مگر افسوس ہے کہ یہاں بھی معاملہ کی حالت دوسری ہی؛ چور کے پاس چوری کا مال برآمد ہو جائے تو ایک لاکھہ کی حویلی سامنے موجود ہے۔ لیکن ان بدذات وزدان متاع حسن و عصمت کی کچھہ نہ پوچھیئے یہاں متاع حسن خود آستینیں چڑھاکر دزد سینہ زور کی حمایت پر کھڑا ہو جاتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو مجسٹریٹ کے سامنے اپنے آپ کو بدذات کی ملکیت ثابت کر کے مانتا ہے!

ایسی حالت میں تعزیرات ہند تو ایک طرف، تعزیراتِ آسمانی کی بھی کوئی دفعہ نہیں لگائی جا سکتی! بدذات چوری چوری بھی کرتے ہیں اور مال مسروقہ پر قابض رہکر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ناجائز آزادی کے ڈھول بھی بجاتے ہیں!!

سامنے غیر کے تم فتنہ مجھے کہتے ہو۔
چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر؟

رہا یہ کہ چوروں کے خوف سے نہ کچھ پہنا جائے نہ برتا جائے، بالکل غلط اور محض غلط!! پہننا اور برتنا زیور اور مال کا جائز استعمال ہے، مال و زیور اسی لیے وضع کیا گیا ہے کہ اپنے اپنے موقع پر کام میں لایا جائے، اور یہی اُس کے جائز استعمال کی حد ہے! اسی طرح بزرگوں اور شوہر کی ہمراہی میں یا اون کی اجازت سے عجائبات دنیا کے نظارہ سے محظوظ ہونا، جو کچھ دیکھنا اپنے آپ کو غیر محرم کی نگاہ سے چھپا کر شرم و حیا اور عصمت و عفت کا لحاظ رکھکر دیکھنا، ایک شریف خاتون کی جائز آزادی ہے جسکا مخالف میں نہ تھا اور نہ ہوں! البتہ مردوں کا بھیس بدل کر ہوا خوری کرنا، تعلیم یافتہ مرد بنکر دوستوں کے ہاں ملنے جانا، ٹینس کورٹ میں انتہائے بے باکی کے ساتھ گزوں اُچھلنا، غیر محرموں کے ساتھ بے تکلفی کے رنگ میں گھی کھچڑی رہنا، تمام دنیا کو اندھا سمجھکر اپنے آپ کو بندۂ فیشن بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی اپنے بیش قیمت زیور کو بلا ضرورت ہر وقت لادے رہے، ایک ایک کو دکھاتا پھرے، اور ہزاروں روپے کے توڑے چھنا چھن اچھالتا پھرے، محض اس خیال سے کہ پولیس موجود ہے اور چوروں کے انسداد کا کافی انتظام ہے! عقل خود بتا دے گی کہ ایسے مال و زیور کی میعاد قیام جو محض ہستی پولیس کے خیال پر بلا محافظت و نگہداشت، جہاں چاہے رکھدیا جائے، کتنے منٹ اور کتنے گھنٹے ہو سکتی ہے! نئی دنیا تو پولیس کی موجودگی، سُراغ رسانی کی ترقی، اور عدالت کی چھان بین پر بھی روز بروز اپنے مال کے لیئے

مضبوط صندوقوں کو، کسی دوسری کنجی سے نہ کھلنے والے قفلوں کو، پوشیدہ خانے رکھنے والی الماریوں کو رائج کرتی جاتی ہے: ہر شخص بینک سسٹم کی بدولت زرِ نقد کے نام ایک کوڑی بھی اپنے پاس رکھنی نہیں چاہتا اور کاغذ پر چند سطروں سے لاکھوں کا کام لینا چاہتا ہے: اور آپ فرماتے ہیں کہ جو مالدار ہو وہ اپنے مال کو اچھالتا پھرے، کس و ناکس کو دکھاتا پھرے اور اگر کوئی سمجھائے تو وہ آنکھیں نکالکر جواب دیدے کہ "چوروں کو تو روکا نہیں جاتا اُلٹا مالداروں کو روکا جاتا ہے"!

بریں عقل و دانش بباید گریست۔ (مصرعہ پورا کرنے کیلیے ادب مانع ہے)

"اگر عورتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنی خوبصورتی سے مردوں کو لبھاتی ہیں اور اشتعال طبع دلاتی ہیں ..." تو یہ بھی ایک ہی ہوئی! اگر نوڈر، نہ کر تو خدا کے غضب سے ڈر! میں نہ کبھی ایسا پوچ خیال تمام طبقۂ نسواں کی نسبت کرسکتا ہوں، اور نہ میں نے کیا! یہ بھی آپکا اپنا اچھوتا خیال ہے!

بدگماں کو گمان بدگذرا وصف روئے نکو کئے نہ بنے

دنیا کی ہر چیز دو طرح استعمال کیجاسکتی ہے، جائز طریقہ پر یا ناجائز طریقہ پر! آگ دنیا کے لیے کسقدر بڑی نعمت ہے، اسٹیم گیس الکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ کی زبردست طاقتیں محض اسی آگ پر قائم ہیں، اور اسی آگ نے خشکی اور پانی میں تہذیب اور ترقی کی آگ لگا رکھی ہے! لیکن ساتھ ہی اس سے بھی کسکو انکار ہوسکتا ہے کہ، یہی آگ سینکڑوں راہ حق دکھانے والونکو جلانے کے کام میں آچکی ہے، اور یہی آگ دیکھتے ہی دیکھتے غریب بندگان خدا کے سخت محنت سے بنائے ہوئے جھونپڑوں کو جلاکر راکھ بنا سکتی ہے! اب اس آخری وجہ سے آگ کو بُرا کہنا خلاف عقل نہیں تو اور کیا ہے؟ جائز یا ناجائز استعمال کا ذمہ دار وہ ہے جو استعمال کر رہا ہے، اچھے یا بُرے استعمال سے نفس شے پر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا! قریب قریب

یہ ہی حالت حسنِ انسانی کی ہے! ایک حسنِ مجسم، کانِ عفت و عصمت، جانِ شرم و حیا پر ہی جو اپنے آپ کو بری نگاہ سے بچانے کا ہر وقت لحاظ رکھتی ہو محض اس کے حسن دلاویز کی وجہ سے، اشتعالِ طبع کا گناہ قائم کرکے فردِ قرار دادِ جرم لگانا آپ کا کام ہے، اور ایک ایسے شعلۂ جوالہ پر جو پوڈر اور بلوم آف روز کے ذریعہ سے، جو مصنوعی گھونگروالے بالوں اور تنگ سے تنگ پیٹی کے ذریعہ سے، جو بات بات میں شانِ دلربائی اور انداز معشوقانہ پیدا کرنے کی ادا سے، اور جو مشاق ہونٹوں اور چلتی ہوئی آنکھوں سے۔ خواہ مخواہ ایک دیکھنے والے کو اپنی طرف مخاطب کرتی ہو، اپنی طرف کھینچتی ہو، اپنا گرویدہ بناتی ہو۔ اشتعالِ طبع کا الزام لگانا میرا دعویٰ ہے! ہر حسین خاتون کو بلا تفریق عادات و اطوار۔ بلکہ خود حسن تک کو۔ موردِ الزام ٹھیرانے کی دیدہ دلیری آپ کرتے ہیں! اور حسن جیسے نعمت کے ناجائز طور پر استعمال کرنے والے کو برا کہنے کا مدعی میں ہوں، اور رہونگا! کیا آپ کی رائے میں یا تو سب کو ایک لکڑی ہانکا جائے، یا کسی مستقل عشوہ فروش کو بھی غارتِ گرِ دین و ایمان نہ کہا جائے؟

شاہدان از آتشِ رخسارِ رنگیں دمبدم
زاہدان را رخنہا اندر دل و دین کردہ اند۔

کسی امر میں عصمت کا وجود دریافت کرکے، آپنے واقعی ایک نرالی چیز کا اضافہ موجودہ ذخیرہ تحقیقات میں کیا ہے! سوال از آسمان و جواب از ریسماں! بالکل ایسی ہوئی جیسے کہ پوچھنے والا تو کسی علیگڈھ والے کا ذکر کر رہا ہو اور جواب دینے والا کسی سندھی یا کلکتے والی کی الاپ رہا ہو! جنابمن! اگر ایک اصلی بحث کو چھوڑکر یونہی ڈوبتے وقت آپ تنکے کا سہارا ڈھونڈھیں گے تو مجھے ڈر ہے آگے چل کر کہیں آپ امرادان با عصمت و عفت کیطرح بہت سے چوروں کے ہاتھ قلم کرا دینے کا نادر شاہی حکم نہ صادر فرمائیں! بحث کو طول دینے کی گنجایش بہت ہے،

مگر خیال صرف یہ ہے کہ کبھی بات کہیں سے کہیں نہ جا پہونچے؟

وفائے عہد نکو باشد ار بیاموزی
وگرنہ ہر کہ تو بینی ستمگری داند۔

"آزاد دنیا عورتوں کو پردہ میں رکھنے والوں کو باولا کہتی ہے"؟ ضرور کہتی ہوگی! مگر پابند دنیا؟۔ پابند دنیا اون کے اس ناجائز آزادی پھیلانے کے جوش کو اس دُم کٹی لومڑی کے لیکچر سے زیادہ باوقعت نہیں سمجھتی جس نے اپنی دم کھو بیٹھنے کے بعد ایک درخت سے پیٹھ لگا کر۔ دُم کٹے ہونے کا عیب چھپا کر۔ اپنے ہم جنسوں کے سامنے نہایت فصیح و بلیغ تقریریں دُم کے عیوب اور نقصانات ثابت کیے تھے! آزاد دنیا عصمت قایم رکھنے کے خیال کو "امید موہوم اور خیال باطل سمجھتی ہے"؟ ضرور سمجھتی ہوگی مگر پابند دنیا؟۔ تیرہ سو برس تک۔ تلوار کے سایہ میں ایک عالم کو نیچا دکھانے کے ساتھ، فلسفہ اور سائنس کا نشان بلند کیے ہوئے وحشیوں کو مہذب بنانے کے ساتھ اوسی خیال باطل یعنے عصمت کو قایم رکھ چکنے کے بعد اب آزاد دنیا کو اس کے لچر خیالات کی وجہ سے .... سمجھتی ہے!! اس طرح ہیر پھیر کر ناک پکڑنے سے کیا حاصل؟ صاف ہی فرما دیجئے نا کہ یہ بھی اور نئی باتوں کی طرح ایک کورانہ تقلید ہے! بیشک کورانہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ آڑے پائجامہ کا مذاق اوڑایا جائے اور جو دھپوری برجیس کو سر پر رکھا جائے! شالی رومال کندھے پر ڈالنا یا گلے میں باندھنا عیب! لیکن رنگین مفلر باندھنا قطعی جائز! پرانی فیشن کی نیمہ آستین پھولدار یا شوخ رنگ پہننا قابل تضحیک، لیکن شوخ سے شوخ اور نئے سے نئے انداز کی فینسی ویسٹ استعمال کرنا عین تہذیب پردہ کی موجودگی میں کوئی مائل بآوارگی طبیعت الشاذ کالمعدوم کی طرح بھی کوئی مذموم حرکت کرے تو سب کو لتاڑ ڈالا جائے اور آزادی کی حالت میں ہزار کے

ڈیک پر یا جا کو کے ٹھٹے پر رونا نہ تھینک یو کہنے کے موقع دیئے جائیں تو، شنیدہ کے بود مانند دیدہ، کھکر ایک ننھی سی۔ نہایت خفیف مسکراہٹ ظاہر کر دی جائے اور بس!

توبہ کا در کھلا ہے نہ کر چھپ کے میکشی ۔۔۔ اے شیخ یہ طریقہ شرب الیہود ہے!

سب سے پہلے تو ایک مریدشک جادوگر کا سچا قصہ! پیر طوطا کہانی جیسی مستند تاریخ! واقعی قابل استدلال ہے! خیر اس کے صحیح تسلیم کر لینے سے بھی کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ یہ بھی ایک ایسی عورت کی سرگذشت ہی جو بدذات تھی یا مائل آوارگی تھی! اور اس سے مجھے قطعی انکار نہیں ہے اور نہ تھا کہ بدذات عورت کو یا بدذات مرد کو، نہ پردہ ٹھیک کر سکتا ہے نہ قید کا خوف نیک بنا سکتا ہے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نادر مثال سے آپ نے طبقۂ درمیانی کی حالت پر کونسی روشنی ڈالی جو دراصل زیر بحث ہی؟ ایک ایسی نیک عورت جو فطرۃً نیک ہو۔ جو عصمت بی بی از بے چادری کی وجہ سے، جو اپنا جیسا مالدار اور معزز نہ ملنے کی وجہ سے، جو انگشت نمائی کے خوف سے نیک نہو۔ بلکہ محض نیکی کی وجہ سے نیک ہو، جسکے دل میں نیکوکاری کی عظمت اس درجہ گھر کر گئی ہو وہ تمام عالم کی نگاہ سے چھپ کر بُرا کرنا بھی اپنی نگاہ میں حقیر کرنا سمجھتی ہو، اور جان و ایمان سے زیادہ نہیں تو اسکے برابر ہی نیکی کی محض بالذات نیکی کی۔ قدر کرتی ہو، بیشک کسی بدذات سے بدذات شیطان کے بہکانے میں بھی نہیں آسکتی! مگر ذرا سچائی کے ساتھ گنا تو شروع کیجئے کہ ایسی طبیعت اور ایسے خیالات کی عورتیں۔ جاہل اور غریب ہندوستان کو چھوڑیئے تہذیب یافتہ اور آزاد یورپ میں کتنی ہیں؟ ورنہ ہٹ دھرمی کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں ہے!! تعلیم نسواں کا بہانا سب سے بڑا بہانا ہے جو پردہ کے خلاف پیش کیا جاتا ہے، لیکن ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا گیا کہ پردہ اور تعلیم نسواں

میں آگ پانی کا بیر ہے! کیا تعلیم پردہ کی آغوشِ حمایت میں حاصل نہیں ہوسکتی؟ ہوسکتی ہے اور ضرور ہوسکتی ہے۔ البتہ ڈوانسنگ اور میوزک نہیں سیکھا جاسکتا، ٹیلیگراف کا کام اور ٹائپ کی مشاقی نہیں آسکتی، موٹر دوڑانے اور لیڈیز ریس میں شامل ہونیکا موقع نہیں مل سکتا، اور ایروپلین پر سوار ہوکر حضرت عزرائیل تک کو اپنا کلمہ گو بنانا نصیب نہیں ہوسکتا! اگر یہی باتیں ترقی کی اصلی شان ہیں تو بخیر و شما بسلامت بسم اللہ کسی نہ کسی طرح زمانہ کو اس حد تک لے آیئے جبکہ کلب علی کی بجائے مسٹر کلبلی- اور صفیہ بنت رسول کی بجائے سوفیا رسل جلوہ گر نظر آنے لگیں، جبکہ ہندستان وہ انڈیا ہوجائے جس کی تصویر سید محفوظ علی صاحب بی۔اے (علیگ) نے جرمن کے اولڈ بوائے، مین شوہر کا انتخاب، والے مضمون میں کھینچی ہے! اپنی تہذیب، اپنا تمدن، اپنی قومیت اپنا مذہب، غرض ہر ایک اپنی خوبی غارت کر چکنے کے بعد ترقی کی امید کیجئے! حالانکہ رفتار زمانہ بتا رہی ہے کہ ترقی ان ہی کا حصہ ہے جو پتلون پر دھوتی کو اور ہیٹ پر پگڑی کو ترجیح دیتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں! سب سے زیادہ افسوس استعجاب کا ہے، کہ اپنی تمام چیزیں غارت کرنے کے بعد اگر ترقی نصیب بھی ہوئی تو وہ ترقی، آپ کی ترقی، ہماری ترقی، ہماری قوم کی ترقی، مسلمانانِ ہند کی ترقی کسی اعتبار سے نہیں کہی جاسکتی!

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے؟
آنکھ نرگس کی، دہن غنچہ کا، حیرت میری!

"عورت کی عصمت کی محافظ پتھر کی دیواریں یا مرد کی نگہبانی نہیں ہوسکتی" قریب قریب بالکل بجا! لیکن لگے ہاتھ یہ بھی فرمادیجئے کہ اس اٹھتی ہوئی عمر اور اس ناتجربہ کاری کے سن میں، جبکہ ایک دوشیزہ تربیت حاصل کر رہی ہو، علم حاصل کرنے کے ساتھ تجربہ اور مشاہدہ سے متاثر ہو رہی ہو، تبادلۂ خیالات کا گہرا اثر بغیر محسوس کیے

رفتہ رفتہ قبول کر رہی ہو؟ اُس حالت اور اوس کیفیت میں، بُری نگاہ اور بُری صحبت سے بچانا ضروری ہے یا نہیں؟ اوسوقت نگہبانی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اوس عمر میں ہر صحبت اپنا اثر بہت جلد ڈال سکتی ہے یا نہیں؟ اور یہی اثر مدت العمر قایم رہنے والا کہر انقش ہو گا یا نہیں؟ اِن باتوں پر غور کیجئے تو یہ خیال رکہ کر غور کیجئے کہ بدذات مردوں کو جو بقول آپکے پردہ کی موجودگی میں بہی ڈولی میں بیٹھکر پہونچ جاتے ہیں قطعی آزادی حاصل ہے اور کوئی پردہ اون کے اور طبقہ نسواں کے درمیان حائل نہیں اب فرمایئے کہ اِس نشست و برخاست کا، اِس آمد و رفت کا، اور اِس تبادلۂ خیالات کا نتیجہ کیا ہو گا؟ ساتہہ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ تہذیب یافتہ چلتے پرزے ایسے بدذات نہیں ہیں کہ جو بادی النظر تو کجا کسی ارتکاب گناہ یا ضررگری سے پہلے پہچانے جاسکیں پردہ کو یہ سمجہنا کہ وہ طبقہ نسواں کی طرف سے بدگمان ہونیکا نتیجہ ہے، آپکا ہی کام ہے! اسکو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ بُری صحبت، بُری نگاہ، اور زہرآلود باتوں سے بچنے کا سب سے آسان اور سب سے اچھا طریقہ ہے؟ اسکو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ طبقہ نازک کو دنیا کی کشمکش سے بچانے اور باحی دنیا کی وبائے متعدی جیسی حرکات سے محفوظ رہنے کے لیے حائل کیا گیا ہے؟ اور اسکو آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ فرشتہ خصال خواتین نے بھیس بدلنے والے شیطان صفت، تعلیم یافتہ مردوں سے کنارہ کرنے کے لیے اختیار کیا ہے؟ ممکن ہے کہ آپ بلا تکلف فرمائیں کہ تعلیم دونوں طبقوں میں عام ہو جانے کے بعد ایسے بیہودہ خیالات اور ایسی آوارگی مفقود ہو جائے گی! لیکن افسوس کہ تجربہ اور مشاہدہ اِس کے خلاف ہے! کسی گناہ کی تعداد یورپ میں، اسوقت بہ نسبت ایشیا کے کم ہونا تو کیسا برابر بہی نہیں ہے یہ بات دوسری ہی کہ آزاد دنیا نے ارتکاب گناہ میں بہی بہت کچھ جدت پیدا

کرلی ہے! اب اگر زمین پر گرا کر کسی بے گناہ کی گردن مٹانا تو گناہ سمجھا جائے اور نہایت نفیس سینز پر لٹا کر ریوالور کے نذر کر دینا گناہ نہ تصور کیا جائے، تو بیشک میں جھوٹا اور آپ سچے!!

جنابمن! تعلیم اور محض تعلیم کسی شخص کو نیک نہیں بنا سکتی! یہ انسان کو اپنے ارادوں میں کوشش کرنے اور خوبصورتی کے ساتھ انجام دینے کی قابلیت بہم پہنچا دیتی ہے: یہ ہر راستہ پر لیجانے کے لیے رہبر کا کام دے سکتی ہے! اب ارادوں کا اچھا یا برا ہونا، راستہ کا صحیح اور غلط ہونا اختیار کرنے والے کی پسند پر منحصر ہے! یہ چلتا ہوا ہتھیار حق اور ناحق دونوں کے گلہ کاٹنے میں ایک سی بُرِش دکھائے گا! جب تک کہ نیک صحبت کا قدم درمیان نہو، جب تک کہ تعلیم کے ساتھ تربیت اور صحبت کا خیال نہ رکھا جائے ایک انسان تنہا تعلیم کی وجہ سے نیکوکار اور راست باز نہیں بن سکتا! ایک اعلیٰ درجہ کی صحبت پانے والا جاہل، ایک بری صحبت میں رہنے والے تعلیم یافتہ سے ہر طرح بدرجہا بہتر ہے! اکبر اعظم اور محمد شاہ رنگیلے کا مقابلہ اِس دعوے کی سچی اور کافی شہادت دے سکتا ہے! جنابمن، ہندوستان کے جاہل چوروں سے یورپ کے تعلیم یافتہ ڈاکو زیادہ خوفناک ہیں، اور ایک جاہل آوارہ گردسے، ایک تہذیب یافتہ سٹیٹ جو تیرہ دروں ہو سوسائٹی کے لیے زیادہ نقصان رساں ہے! یہ علم کا سوٹ اور تہذیب کی ہیٹ لگانے والے شکاری۔ پردہ نشین خواتین کو چھوڑیے۔ ایسی عورتوں تک کو جو اُڑتا ہو گانٹھ لیتی ہوں اور اڑتی چڑیا کے پر گنتی ہوں، باتوں ہی باتوں میں پری کی طرح شیشہ میں اتار لیتے ہیں قبضہ میں کر لیتے ہیں اور بند کر دیتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی تمام دنیا کو کانٹوں میں گھسیٹنے کے لیے ناجائز آزادی کے منگل گاتے ہیں!

گویا ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھلانے کے اور!

اس نزاکت پر ہمارے قتل کا دعویٰ چہ خوش
دیکھئے! لیجئے خبر، وہ ہاتھ سے خنجر گرا!!

اختتام کے قریب پونہچکر آپ بہن کے روپ میں طنزیہ لہجے کے ساتھ فرماتے ہیں "ہم کوئی.... تھوڑا ہی ہیں جو ایسی باتوں میں آجائیں گے جنھوں نے اپنے بچوں کو مذہب چھوڑکر انگریزی تعلیم ہی دینی شروع کر دی۔ ہم نے نہ اوس پر عمل کیا۔ اور نہ اسپر کریں گے....." اِس لیاقت سے بھرے ہوئے لبالب فقرے نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے قطعی حیرت زدہ اور ساکت کر دیا! بیشک ہم نے کبھی ہرگز مذہب چھوڑ تعلیم انگریزی حاصل کرنے کی تقلید نہیں کی، نہ اَبتک بفضلہ کرتے ہیں، اور یقین جانئے کہ نہ آیندہ کریں گے!! ہمارا فخر، ہماری جان، ہمارا برحق مذہب ہے! یہ مذہب ہمارے پھیپڑے کی حرکت کے ساتھ دل میں حرکت کرتا ہے یہ مذہب ہمارے خون کی گردش کے ساتھ رگوں میں دوڑتا ہے اور یہ مذہب ہماری ہر چیز کا مالک بن کر ہماری ہستی پر حکمران ہے۔ یہ ہم سے نہ چھوٹا نہ چھوٹ سکتا ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ نہ کبھی کسی حالت میں چھوٹے گا!! ہم نے جو تعلیم حاصل کی، جو تمام عالم کی نظر خیرہ کر دینے والی ترقی حاصل کی، اس پاک اور سچے مذہب کے ظلِ حمایت میں اور اسی کا نشان بلند کیے ہوئے اور ہم جب کبھی پستی کے غار میں گرے، جب کبھی ناقابل بیان ردی حالت تک پونہچے تو بھی اسی مقدس مذہب کے احکامات سے منہ موڑنے سے اسی مذہب پر شگون پرستی اور طرح طرح کی فضولیات کا رنگ چڑھانے سے، اور اسی مذہب کی صورت مسخ کر دینے کی وجہ سے!! کیا قوم کے مایۂ ناز لیڈر اور وہ جو اسوقت جسم و جان وقف کر چکنے کے بعد جنت میں براج رہے ہیں اور

وہ جو ہماری رہبری کے لیے زندہ ہیں اور ہم کو پہلے مسلمان اور پیچھے ہندوستانی بتاتے ہیں! - ایسی ہی انگریزی تعلیم چاہتے ہیں جسمیں مذہب چھوڑنا پڑے؟ کیا ایسی ہی تعلیم کے لیے مرحوم نباض قوم نے علیگڈھ کالج کی بنا اپنا خون پسینہ ایک کرنے کے بعد ڈالی تھی، جہاں مذہبی تعلیم لازمی اور فرائض مذہبی کا انجام دینا ضروری ہے؟ کیا ایسی ہی تعلیم کے لیے اسوقت ہمارے سربرآوردہ رہبران قوم یونیورسٹی کی امیدیں قوم کے آگے گداگری کر رہے ہیں؟ حاشا وکلا! اگر انگریزی تعلیم کے لیے مذہب اسلام چھوڑنے کا ذرہ برابر بھی خوف ہوتا تو سب سے پہلے جو شخص اسپر لات مارتا وہ سید علیہ الرحمۃ ہوتا! اور اگر سائنس اور علوم جدیدہ مذہب اسلام پر قائم رہکر حاصل نہ ہو سکتے تو جو گروہ اس کی مخالفت پر آستینیں چڑھا کر آمادہ ہوتا وہ ہمارے فدایان قوم کا گروہ ہوتا!! افسوس ہے کہ ایسے ہی فقرے جو تقریر اور تحریر میں ناعاقبت اندیشی کے ساتھ نکل جاتے ہیں قوم کے ناواقف گروہ میں غلط فہمی کی وبا پھیلاتے ہیں، اون کو برگشتہ کرتے ہیں اور مخالفین کو موقع دیتے ہیں کہ وہ بانی کالج کے عقائد اور تعلیم کالج کے اثر پر بری سے بری رائے لگا کر پبلک کے سامنے پیش کریں اور رنگ آمیزی کے ساتھ نکتہ چینی کریں!! میں اب بھی کسیطرح باور نہیں کر سکتا کہ آپ جیسے ریفارمر اور لائق شخص کا مفہوم اصلی وہی تہا جو یہ فقرہ بول رہا ہے!

بہکتے نہ تھے داغ یوں گفتگو میں
مگر پی گئے آج حضرت زیادہ؟!

سب کے آخر میں میں نہایت ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں! اگر کسی فقرہ یا کسی لفظ سے آنجناب کی دل شکنی ہو تو مہربانی فرما کر معاف کیجئے! کیونکہ

بخدا یہ مضمون میں آپڑی ہی سخن گسترانہ بات ہے مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے!
یقین مانئے کہ میں اپنے خیالات پردہ کی نسبت بدل ڈالنے کو تیار ہوں
بشرطیکہ میری رائے کی غلطی مجھے بتادی جائے! مگر کیا مجھے اب بھی یہ عرض
کرنے کی ضرورت ہے کہ میں جس پردہ کا حامی ہوں وہ تیہر کی دیواروں والا
جیل یا طبقۂ نازک کی طرف سے بدگمان ہونے کا نتیجہ نہیں ہے؟ میں نے اپنے
اس مضمون میں بھی پردہ کے لفظ کا اطلاق ہر جگہ اوسی پردہ پر کیا ہے جسکی
تشریح میں کئی جگہ کرچکا ہوں آپ جو کچھ روشنی ڈالیں وہ ایسے ہی پردہ پر
ڈالیں جسکا میں حامی ہوں اور جسکو بالفاظ دیگر مذہبی پردہ کہا جاسکتا ہے'
ورنہ تضیع اوقات سے کیا حاصل؟ والسلام!

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس
در بند آن مباش نشنید یا شنید

آپکا گستاخ مگر خیر اندیش بھائی
سلطان حیدر جوش (علیگ)

اتبک چونکہ رسالہ صرف قسم اول کا شائع ہو رہا تھا اس لئے قسم دوم کے خریدارونکی خدمت میں
بھی روانہ ہوتا تھا اس نمبر سے قسم دوم شائع ہونا شروع ہوگیا اور یہ پرچہ قسم دوم کے خریداروں کو
دوم قسم کا بھیجا جاتا ہے۔

مولوی عبدالرحمن صاحب راسخ مرحوم کی تصویر جو اس رسالہ کے ساتھ شائع
ہورہی ہے امید ہے اسلئے دلچسپی سے دیکھی جائیگی کہ مولانائے مرحوم سرزمین جہان آباد
کی ایک آخری یادگار تھے مولانا کے کلام کا نمونہ آیندہ پرچہ میں شائع ہوگا۔

علو ہمتی

ہے منزل مراد عزیز و بہت کٹھن
اِس راہ میں نہ پاؤ گے ہرگز کہیں امن
حائل کہیں پہاڑ کہیں جھیل اور بن
طے کر دو اِس الپس کو بن کر نپولین
اور جولیس کی طرح سے دریا میں کود جاؤ

ہمت بلند ہے تو ہیں آسان مشکلیں
ہوں آفتیں اگر تو نظر آئیں راحتیں
ٹرکی کی فتح یاد ہے اے دوستو تمہیں؟
پہیئے لگا کے بیڑے چلائے تھے ریت میں
ہاں تم بھی بازوؤں میں عزیمت کے پر لگاؤ

گر چاہو رکھے نام تمھارا زمانہ یاد
گر چاہتے ہو سچی خوشی اور سچی داد
ہاں اٹھو اور نفس پہ اپنے کرو جہاد
دریا کی تہ میں رکھا ہوا ہے در مراد
مردانہ وار غوطہ لگا کر نکال لاؤ

یہ کون زندگی ہے کہ مر مر کے تم جیو
کوسا کرو پڑے ہوئے اپنے نصیب کو
اور پست ہمتی پہ قناعت کیا کرو؟
مفلس ذلیل و خوار ہمیشہ بنے رہو
در در پھرو سوال کرو اور دھکے کھاؤ

مرِیٹ کے بی۔ اے پاس کیا آپ نے اگر
آزادی اپنی بیچ دی دو چار پیسوں پر
سروس ہی پر ہیں حوصلے حضرت کے منحصر
یہ پست ہمتی ہے دنائت ہے سربسر
پرواز اپنی دوستو تم اور کچھ بڑھاؤ

سروس کو اے جناب جہنم میں بھیجئے
تعلیم اگر ملی ہے تو مصرف بھی لیجئے
کچھ اختراع کیجئے ایجاد کیجئے۔
ہوں پاس کچھ روپے تو تجارت میں دیجئے
صنعت کو ہے ترقی ملکی سے اک لگاؤ

گر ہمتیں تمہاری یونہیں پست رہ گئیں دنیا میں پھر تمہارا ٹھکانا کہیں نہیں
اس صفحۂ وجود سے اے مسلم حزیں حرفِ غلط کی طرح نہ مٹ جاؤ تم کہیں
میدانِ کارزار میں کچھ ورنہ کر دکھاؤ

ہاں ہاں بڑھے چلو اے جوانانِ ستودہ فر میداں ترقیوں کا کھلا ہے وہ سامنے
دنیا کی شاہ راہ میں راہی نہیں رکے جو رک گئے گرے۔ جو گرے وہ کچل گئے
بائی سکل کی ریس ہے پاؤں چلائے جاؤ

محمد مسلم عظیم آبادی

اس پرچہ کے ساتھ تمدن کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے رسالہ میں اس عرصہ نے جو کچھ کیا وہ ناظرینِ تمدن کو اچھی طرح معلوم ہے ملک و قوم کے متعدد اخبارو رسائل نے اسکی بابت جو کچھ لکھا اسکا اعادہ ہماری رائے میں محض فضول ہے توقع تھی کہ روشن خیال خواتین اور حامیانِ حقوقِ نسواں پر تمدن کی اشاعت میں حتی الامکان مدد دینگے اور رسالہ جلد اس قابل ہوگا کہ وہ متعدد تصاویر شائع کرسکے مگر افسوس سوا دو چار کے کسی نے اسطرف توجہ نہ فرمائی اور تمدن بجائے اس کے کہ پہلی ششماہی کے بعد اپنا خرچ خود نکال لیتا، قابل ہی نہ ہوا کہ اپنے مصارف کا ایک حصہ بھی پورا کر سکے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمدن ان ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے کہ اگر ان میں سے چند بھی اسکی ضرورت کو محسوس فرما لیں تو رسالہ بہت جلد ترقی کر جائے اور ہم آج اسی لئے صرف اپنے چند ناظرین کو یہ تکلیف دیتے ہیں کہ اگر وہ دو دو خریدار بھی فراہم کردیں تو تمدن بہت جلد ہمکو اپنے بار سے سبکدوش کردے گا۔ وہ علم ادب کی خدمت کے علاوہ تمدن کا چونکہ بڑا مقصد تحفظ حقوقِ نسواں ہے اسلئے ہمیں یقین ہے کہ ہم جن ناظرین کی خدمت میں یہ کارڈ روانہ کرتے ہیں وہ اسکی خانہ پُری کرکے واپس فرما دیں گے۔

اکتوبر کا پرچہ خصوصیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ جو حتی الوسع بہترین اہلِ قلم کے خیالات سے مزین ہے اور جسکا پہلا مضمون غالباً شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کا ہوگا

منیجر تمدن و عصمت۔ دہلی

یتیم بچّے

ذرا تو نرماؤ دل کو یارو یتیم بچے بلک رہے ہیں
اُٹھا لو گودوں میں ان کو یارو تمھارے منہ کو یہ تک رہے ہیں

لگا لو چھاتی سے انکو لیکر بٹھا لو انکو دلوں کے اندر
یہ ننھے ننھے سے ہاتھ تم پر اوٹھا اوٹھا کر ہمک رہے ہیں

نہ دست و بازو میں اُنکی قوت نہ دوسروں سے اُمید شفقت
پدر کی الفت نہ ماں کی چاہت اُدھر میں گویا لٹک رہے ہیں

عدوے دیں اُنکی تاک میں ہیں ہمیشہ فکر ہلاک میں ہیں
بچاؤ ان کو کہ راہ اُنکی بہت سے قزاق تک رہے ہیں

ہمارے دامن میں ہیں جو گوہر وہ ہم کو ایسے ہوے ہیں ڈھیر
ہم اپنے دامن جھٹک رہے ہیں رقیب اونکو لپک رہے ہیں

جہاں نیں تو ام ہیں رنج و راحت نہیں خزاں کی کوئی شکایت
سپتے ہیں غیروں نے پھول اپنے یہ دیں کانٹے کھٹک رہے ہیں

ہے باغ اسلام یونہیں ویراں اور اوس پہ ہوتی ہیں یہ ستم ہیاں
کھلی ہیں قسمت سے کچھ جو کلیاں اُنہیں بھی ظالم جھٹک رہے ہیں

یہ عرش اسلام کے ستارے تمھارے پیارے نبی کے پیارے
ڈرو خدا سے کہ یوں بچارے بلک رہے ہیں سسک رہے ہیں

یتیم خانہ میں کوئی دیکھے کہ بچے کرتے ہیں کیا تماشے
یہ بولتے ہیں کچھ اسطرح سے کہ جیسے بلبل چہک رہے ہیں

ترکی فوج ۱۵ کا انگریزی شہید ... ۱۱۰۰ ... ۱۹۱ ... دریا ... سرفار شہید

شرارت

لندن کے ایک اخبار میں "شرارت" کے عنوان سے ایک مختصر سا آرٹیکل لکھا ہوا تھا جسکو پڑھکر میں نے بجز ترجمہ کرنے کے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ آرٹیکل ہمارے شہنشاہ ذی جاہ کنگ ایمپرر جارج پنجم دام اقبالہ کے بچپن کی ایک بامزہ شرارت کا اظہار کرتا ہے مشہور ہے کہ شہنشاہ ذی اقبال کو زمانہ طفولیت میں شرارت و ظرافت میں بھی کمال حاصل تھا۔

"شہزادہ جارج کی شرارتوں میں اس واقعہ کی مثال بہت کم ملے گی جو انہوں نے اپنی دادی صاحبہ یعنی ملکہ معظمہ کوین وکٹوریہ مرحومہ کے زمانہ میں کی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی شرارت پر کوین نے اُس سے باز آنے کیلئے انہیں سزا از دہمکا کر کہا "چلو اس میز کے نیچے جاؤ اور جبتک کہ تم درست نہو جاؤ باہر نہ آؤ" اس حکم کے سنتے ہی ننھا منا خوبصورت بچہ میز کے نیچے آہستہ سے دبک دبکا کر گھس گیا اور دادی صاحبہ اسی میز پر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں بہت دیر ہو گئی دادی صاحبہ نے پوچھا کہ "کیوں میاں درست ہو گئے؟" نیچے سے آواز آئی "ابھی نہیں جناب" اس ارادہ کے پکے ننھے اور خوبصورت بچہ کا جواب سنکر دادی صاحبہ کو بہت تعجب ہوا اور محبت مادری نے مجبور کر دیا کہ اب اسکو اس کی سچائی پر زیادہ دیر تک اس سزا میں نہ رکھنا چاہیئے مگر عاقل دوراندیش بادشاہ بیگم اپنے فطری ضبط کو کام میں لاکر اسیطرح اپنے کام یعنی لکھنے میں مشغول ہو گئیں اور جبتک کہ دوسری آواز نہ آئی خاموش ہو رہیں جب نیچے سے خود بخود یہ آواز آئی کہ "اب میں درست ہو گیا" تو فرمایا کہ "اچھا تم اب باہر آ سکتے ہو" جب حضرت نے اس حکم کی تعمیل فرمائی اور باہر تشریف لائے تو بالکل اسی قدرتی لباس میں جس میں وقت پیدائش ملبوس تھے یعنی ننگے منگے"۔

ابو حامد سید محمد حامد۔ مہدوی

غزلیں

یقیں یہ ہے کہ مر جانے پہ سارا حوصلہ نکلے　　قیامت ہے اگر اے آسماں ہم وہ جدا نکلے
تمنا اپنے دل کی قید تنہائی میں کیا نکلے　　جو سب احباب زندہ پھر کے ہوں تب حوصلہ نکلے
مزا بس کیا ہی جو کہوایا جاتا ہے وہ کہتا ہوں　　دہن سے جب زباں چپ ہو تو تن سے بولتا نکلے
عجب یکساں ہے اے مے پرستوں بزم ساقی کی　　جنہیں ہم رند سمجھے تھے وہ اکثر پارسا نکلے
فقط واعظ پہ کیا موقوف ایسے واعظ سب ہیں　　نہ کہوا مجھ سے کیا کہنے کو چاہوں منہ سے کیا نکلے
مزا آزادیوں کا اپنی تھا اپنی جوانی میں۔　　قفس سے ہم اگر پیری میں بھی نکلے تو کیا نکلے
در و دیوار کی الفت نے بیخود کر دیا ایسا　　ترے مہماں بہ مشکل تجھ سے اے مہماں سرا نکلے
پسینہ آگیا انکو بھی میری آہ سوزاں سے　　بھری محفل سے آخر کھول کر بند قبا نکلے

پلٹ کر پھر نہ پوچھا شاد جیتا ہی کہ مرتا ہی
وفادار و عدم میں جا کے تم ہی بیوفا نکلے

[illegible]

خدا توفیق دے قاتل کہیں تیغ دو سر باندھے　　کہ مرنے پہ ہم تیار ہیں کب سے کمر باندھے
کھلا کب باب خلوت پائے درباں پر گرے برسوں　　عدو کے سامنے ہی ہاتھ اپنے پیشتر باندھے
یونہی سوتا ہے سارا زمانہ روز محشر تک　　جو وہ بکھرے ہوئے گیسو ہنگام سحر باندھے
بہار زخم سے ہے یادگاری اُس کے خنجر کی　　تڑپ کر توڑ دوں انگور گر زخم جگر باندھے
سنا ہے وادی ایمن کا جب سے ماجرا میں نے　　کھڑا رہتا ہوں پہروں ہاتھ زیر ہر شجر باندھے
حسینان چمن کے حسن پر کب محو ہوتے ہیں　　تجھی کو دیکھتے ہیں ٹکٹکی اہل نظر باندھے
ادب سے دور ہے خلوت میں اسکی پاؤں پھیلانا　　کھڑے رہتے ہیں عاشق ہاتھ اپنے رات بھر باندھے
ہو نیرنگی باغ جہاں سے ایک دم غافل　　بُتانِ لالہ رو سر پر ہیں رختِ سفر باندھے
زمیں پر گر پڑے آباد خوشہ عقد پرویں کا　　قیامت ہو ابھی طرّہ جو وہ دستار پر باندھے

راحت زمانی

مولوی سیّد احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان قلعہ معلّی کے محاورے۔ قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنیکو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم

یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہی قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر

لڑکیوں کی اِنشا

حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی اِنشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لیطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸ر)